اکیسویں صدی میں پاکستانی اردو افسانے کا سماجی تناظر: تغیر پذیر معاشرتی اقدار کی عکاسی کا تحقیقی و تنقیدی مطالعہ

مقالہ برائے پی ایچ۔ڈی (اردو)

مقالہ نگار:

سدرہ طاہر

نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگویجز، اسلام آباد

ستمبر، ۲۰۲۴ء

اکیسویں صدی میں پاکستانی اردو افسانے کا سماجی تناظر: تغیر پذیر معاشرتی اقدار کی عکاسی کا تحقیقی و تنقیدی مطالعہ

(The Social Context of Pakistani Urdu Short Stories in the 21st Century: A Research and Critical Study on the Reflection of Changing Social Values)

مقالہ نگار:

سدرہ طاہر

یہ مقالہ

پی ایچ۔ڈی (اردو)

کی ڈگری کی جزوی تکمیل کے لیے پیش کیا گیا

فیکلٹی آف لینگویجز

(اُردو زبان و ادب)

نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگویجز، اسلام آباد

ستمبر، ۲۰۲۴ء

مقالے کا دفاع اور منظوری کا فارم

زیر دستخطی تصدیق کرتے ہیں کہ انہوں نے مندرجہ ذیل مقالہ پڑھا اور مقالے کے دفاع کو جانچا ہے، وہ مجموعی طور پر امتحانی کارکردگی سے مطمئن ہیں اور فیکلٹی آف لینگویجز کو اس مقالے کی منظوری کی سفارش کرتے ہیں۔

مقالے کا عنوان: اکیسویں صدی میں پاکستانی اردو افسانے کا سماجی تناظر: تغیر پذیر معاشرتی اقدار کی عکاسی کا تحقیقی و تنقیدی مطالعہ

پیش کار: سدرہ طاہر رجسٹریشن نمبر: 878-PhD/Urd/F19

ڈاکٹر آف فلاسفی

شعبہ: زبان و ادب اردو

پروفیسر ڈاکٹر روبینہ شہناز _____

نگران مقالہ

پروفیسر ڈاکٹر جمیل اصغر جامی _____

ڈین فیکلٹی آف لینگویجز

میجر جنرل شاہد محمود کیانی، ہلال امتیاز (ملٹری) (ر) _____

ریکٹر

تاریخ: _____

اقرار نامہ

میں، سدرہ طاہر حلفیہ بیان کرتی ہوں کہ اس مقالے میں پیش کیا گیا کام میرا ذاتی ہے اور نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگویجز، اسلام آباد میں پی ایچ۔ڈی سکالر کی حیثیت سے ڈاکٹر روبینہ شہناز کی نگرانی میں مکمل کیا گیا ہے۔ میں نے یہ کام کسی اور یونیورسٹی یا ادارے میں ڈگری کے حصول کے لیے پیش نہیں کیا اور نہ آئندہ کروں گی۔

_____

سدرہ طاہر

مقالہ نگار

نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگویجز، اسلام آباد

ستمبر، ۲۰۲۴ء

فہرست ابواب

عنوان	صفحہ نمبر
مقالہ اور دفاع مقالہ کی منظوری کا فارم	iii
اقرار نامہ	iv
فہرستِ ابواب	v
Abstract	vii
اظہارِ تشکّر	ix
باب اول: موضوع تحقیق کا تعارف اور بنیادی مباحث	۱
الف۔ تمہید	۱
i۔ موضوع کا تعارف	۱
ii۔ بیان مسئلہ	۳
iii۔ مقاصد تحقیق	۳
iv۔ تحقیقی سوالات	۴
v۔ نظری دائرہ کار	۴
vi۔ تحقیقی طریقہ کار	۷
vii۔ مجوزہ موضوع پر ما قبل تحقیق	۸
viii۔ تحدید	۸
ix۔ پس منظری مطالعہ	۹
x۔ تحقیق کی اہمیت	۱۰
ب۔ معاشرتی اقدار (تعارف اور بنیادی مباحث)	۱۱
ج۔ سماجیات کے نظریات اور معاشرتی اقدار	۳۷
د۔ پاکستانی اردو افسانہ (اجمالی جائزہ)	۵۰
حوالہ جات	۶۴

باب دوم: اکیسویں صدی کے افسانے میں تغیر پذیر معاشرتی اقدار اور معاشرتی ادارے ۶۷

الف۔ معاصر افسانے میں تغیر پذیر معاشرتی اقدار اور خاندانی نظام ۶۸

ب۔ معاصر افسانے میں سیاست اور اقتدار کی صورت حال ۸۴

ج۔ معاصر افسانے میں مذہب اور جدیدیت ۹۶

د۔ معاصر افسانے میں تعلیمی نظام اور تغیرات ۱۱۵

حوالہ جات ۱۳۰

باب سوم: اکیسویں صدی کے افسانے میں تغیر پذیر معاشرتی اقدار کے پس پردہ عوامل ۱۳۵

الف۔ ٹیکنالوجی کی ترقی اور عصر حاضر میں بدلتی ہوئی اقدار ۱۳۷

ب۔ معاصر افسانے میں عالمگیریت کا تصور اور معاشرتی اقدار ۱۴۸

ج۔ معاصر افسانے میں نقل مکانی کی صورتیں اور بدلتے ہوئے تقاضے ۱۵۲

د۔ اکیسویں صدی میں رونما ہونے والے حادثات و وقوعات اور اردو افسانہ ۱۵۵

ہ۔ معاصر افسانے میں تغیر پذیر اقدار کے پس پردہ معاشرتی تحریکیں ۱۷۰

حوالہ جات ۱۷۷

باب چہارم: اکیسویں صدی میں تغیر پذیر اقدار کے سماجی مضمرات ۱۸۰

الف۔ معاصر افسانے میں پیش کردہ مثبت معاشرتی تبدیلیوں کا جائزہ ۱۸۰

ب۔ معاصر افسانے میں پیش کردہ منفی رجحانات کا جائزہ ۱۸۲

حوالہ جات ۲۱۸

ماحصل ۲۲۱

تحقیقی نتائج ۲۲۴

سفارشات ۲۲۶

کتابیات ۲۲۸

ABSTRACT

This Research work examines the Pakistani Urdu Fiction of 21st century from a social context, focusing on the reflection of changing social values. The study aims to understand how contemporary Urdu Literature portrays and responds to the evolving social dynamics in Pakistan.

Society is never precisely the same from one moment to the next. Change is the very core of life. Society accepts global influences, it is affected by all sorts of factors, problems, and development projects. These issues include natural disasters, technological advancements and socio-political transformations etc. which affect the situation profoundly. Social change breaks the traditional process that gives rise to new demands. As a society develops and accepts the effects of other factors, its values also change. It absorbs some new beliefs, customs, values, and practices. Literature is a mirror of society. The writers, with different aspects of expression, are set to reflect social values, customs, and issues. The lives of people living in any human society are reflected by their traditions, beliefs, and values. That is why this research has examined its reflection in Urdu fiction.

To study under this research project out of three major Perspectives of sociology Functionalism and Emile Durkheim's "Theory of Social Facts" has been considered. The basis of this theory is that society develops through common values. "Social Facts" refers to the external and objective aspects of society that have a powerful influence on individuals. Functionalists believe that social values are a necessary part of social organization and that changes in social values can help to adapt society to changing circumstances. These changes can be gradual or rapid, and they can have far-reaching effects on social institutions and patterns of social behavior. This theory emphasizes that for a healthy society, society needs to find a balance between tradition and innovation to ensure its continued stability and well-being.

In view of this research and critical study of the changing social values in the Short Stories published during the first two decades of the 21st century. The Research Design Of study is Qualitative. Textual analysis (Descriptive method) has been used as a research method.

Data was collected from both sources i.e., Primary, and secondary sources.

The research is structured into four chapters; the first chapter presents as general introductory (A study of values and causes of social change which affects the values, Introduction to theories of sociology, a general introduction to Emile Durkheim's works and an overview of Pakistani Urdu fiction.) Particularly in this chapter the essential conceptual material has been brought into sharper focus. While the second, third and fourth chapter deals with the reflection of social values in 21st century fiction and at the end finally, the overview concludes the study, results and recommendations are presented. The study reveals that Pakistani Urdu fiction of the 21st century reflects a complex interplay between tradition and modernity, local and global influences, and conservative and progressive values. The selected work also depicts various social issues.

The Findings of this research contributes to the existing body of knowledge on Pakistani Urdu Fiction and its relationship with the changing social fabric. By analyzing the works in the context of evolving societal values, this study provides valuable insights into the cultural, political, and social landscape of Pakistan in 21st century. This research also highlights the role of literature as a mirror that reflects and critiques the prevailing social conditions, making it a significant medium for understanding and navigating societal transformations. This research invites other researchers on the selected genre of fiction in multiple ways in our postmodern world.

اظہارِ تشکّر

ذات باری تعالیٰ جب تک "کن" نہ فرمائے کچھ بھی ممکن نہیں۔ اس مقالے کی تکمیل اللہ تعالیٰ کے خاص فضل و کرم اور اسی "کن" کی بدولت ممکن ہوئی۔ شکر ہے اس پاک ذات کا جو رحمٰن اور رحیم ہے ہماری خطاؤں پر درگزر فرماتے ہوئے ہمیں اپنی رحمتوں سے نوازتا ہے۔ اس مقالے کی تکمیل پر میں شکر گزار ہوں اس ذات کی جس نے مجھے وہ اسباب اور خوب صورت رشتے مہیا کیے جن کے تعاون کی بدولت میں اس مقالے کو پایہ تکمیل تک پہنچا سکی۔

ذات باری تعالیٰ کے بعد شکریے کی مستحق ذات، ایک شفیق اور مہربان چہرہ، میری کامیابی کی روح رواں؛ جس نے ہر سکھ دینے کی خاطر خود کبھی آرام نہیں کیا؛ میرے والد محترم محمد احمد طاہر ہیں جن کی مسلسل محنت، بہت سی قربانیوں اور دعاؤں کی بدولت یہ تعلیمی سفر تکمیل کو پہنچا۔ مزید زندگی کی بہاریں جس سے وابستہ ہیں وہ ہے میری بہن عارفہ طاہر جس نے میرے مقالے کی تکمیل میں ہر ممکن ساتھ دیا۔ دادا ابو (بشیر احمد فانی) اور چچا (محمد احمد طارق، ایڈوکیٹ) کی بھی شکر گزار ہوں جنہوں نے ہر پل تعاون کیا۔ ان ہی رشتوں کی بدولت زندگی میں بہاریں رہیں جو کسی بھی تحقیقی کام کو سرانجام دینے کے لیے معاون ہوتی ہیں۔

اساتذہ کرام جن کا مقام و مرتبہ والدین سے بڑھ کر ہے اور اس مقام و مرتبے کے سامنے کسی قسم کی دورائے نہیں۔ آج میں اپنے اس مقالے کی تکمیل کے موقع پر سکول کے زمانے سے لے کر اب تک میری زندگی میں آنے والے اساتذہ کرام کا شکریہ ادا کرتی ہوں ان ہی کی بدولت آج یہ سب لکھنے کے قابل ہوئی ہوں۔ شکریے کے اس سلسلے میں سب سے اہم نام ممتاکاروپ جس کا اس مقالے کی تکمیل میں اہم کردار ہے وہ میری نگران مقالہ پروفیسر ڈاکٹر روبینہ شہناز ہیں۔ ان کی رہنمائی، شفقت و محبت کے بغیر میری ذات ذرہ بے نشان کی مانند ہوتی۔ کچھ الفاظ ایسے ہوتے ہیں جو آپ کو اپنے حصار میں لے لیتے ہیں جن کی پر مسرت چاشنی کے سحر میں مبتلا ہو کر آپ کو مشکل سے مشکل کام بھی آسان محسوس ہونے لگتا ہے۔ استادِ محترم ڈاکٹر فوزیہ اسلم ان ہی اساتذہ میں سے ہیں جن کے جادوئی الفاظ آپ کا مسلسل حوصلہ بڑھاتے ہیں۔ اس مقالے کے موضوع کے انتخاب میں معاون اساتذہ اور خاص طور پر ڈاکٹر نعیمہ بابر کا ہر لمحہ ہر طرح کے تعاون کے لیے موجود رہنا اور قیمتی وقت عنایت کرنا، ان کے تعاون اور حوصلہ افزائی نے مجھے بروقت کام مکمل کرنے میں تقویت دی۔ نمل یونیورسٹی کے تمام اساتذہ کرام (ڈاکٹر نعیم مظہر، ڈاکٹر شفیق انجم، ڈاکٹر ظفر احمد، ڈاکٹر محمود الحسن،

ڈاکٹر مجاہد عباس، ڈاکٹر عثمان غنی، ڈاکٹر عمر فاروق سیال، ڈاکٹر ابو بکر صدیق، ڈاکٹر ارشد محمود، ڈاکٹر انجم مبین، ڈاکٹر صائمہ نذیر، ڈاکٹر نازیہ ملک، ڈاکٹر رخشندہ مراد، ڈاکٹر نازیہ یونس، ڈاکٹر ارشاد بیگم، ڈاکٹر صنوبر الطاف، ڈاکٹر عنبرین تبسم) جن کی رہنمائی، دعاؤں اور پر خلوص جذبات نے مجھے ہمت اور حوصلہ دیا۔ ان ہستیوں کی رہنمائی، تربیت اور محبتوں کا بہت شکریہ۔ اساتذہ کے ساتھ ساتھ شعبے کے دفتری عملے کی بھی شکر گزار ہوں۔ پروفیسر ڈاکٹر عدیلہ (ماہر سماجیات، صدر شعبہ، فاطمہ جناح ویمن یو نیورسٹی) اور پروفیسر ڈاکٹر زمان (ماہر سماجیات، صدر شعبہ، قائد اعظم یونیورسٹی) جنہوں نے مجھے سماجیات کے موضوعات اور نظریات سمجھنے میں مدد کی؛ میں دل سے ان کی شکر گزار ہوں۔

شیما سعدیہ، ماریہ سلیمان، ڈاکٹر محمد حسنین، عبداللہ عتیق، حلیم احمد، قاری محمد ابرار صاحب، ڈاکٹر ناصر عباس نیر، ڈاکٹر محمد کامران، ڈاکٹر روش ندیم، ڈاکٹر حمیرا اشفاق، محمد حمید شاہد، خالد فتح محمد، سید زبیر شاہ، خاور چودھری، گل زیب عباسی، انوار احمد، ڈاکٹر صفدر رشید اور دیگر احباب خاص شکریے کے مستحق ہیں۔ میں ان کے تعاون کی بے حد ممنون ہوں۔ دیگر احباب جنہوں نے بنیادی اور ثانوی مآخذ تک رسائی میں معاونت کی میں ان تمام کے لیے دعا گو ہوں۔ یہاں تمام احباب کے لیے میرے شکریے کے طور پر ادا کیے گئے الفاظ کسی طور بھی ان کے تعاون کا حق ادا نہیں کر سکتے میں سب کے لیے دعا گو ہوں جنہوں نے میرے ساتھ ہر ممکن تعاون کیا، میری ہمت بڑھائی جس کی بدولت یہ کام تکمیل تک پہنچا۔ امید واثق ہے: یہ مقالہ شعبہ اردو کے لیے باعث افتخار ثابت ہو۔ میرے لیے کسی خواب کی تعبیر سے کم نہیں۔

سدرہ طاہر

اسکالر پی ایچ۔ڈی (اردو)

باب اول:

موضوع کا تعارف اور بنیادی مباحث

الف: تمہید

i۔ موضوع کا تعارف(INTRODUCTION)

موضوعِ مقالہ کے تحت اکیسویں صدی کے پاکستانی اردو افسانے کا مطالعہ کیا گیا ہے جو عصر حاضر میں تغیر پذیر معاشرتی اقدار اور اصولوں کے بارے میں بصیرت فراہم کرتا ہے۔ اس دور کی تخلیقات محض کہانیاں نہیں ہیں بلکہ اس میں معاشرے کے اقدار، عقائد، افعال اور رویوں کا گہرا ادراک پایا جاتا ہے۔ یہ تحقیق پاکستانی معاشرے اور اردو فکشن کے گہرے تعامل کو بھی عیاں کرتی ہے۔ معاصر ادب بدلتے ہوئے معاشرتی تانے بانے کو کس طرح پیش کرتا ہے اور اس کی ترجمانی کرتا ہے اس صورت حال کی عکاسی کا جائزہ لینے کے لیے فعلی مکتبہ فکر سے تعلق رکھنے والے فرانسیسی ماہرِ سماجیات ڈیوڈ ایمائل ڈرخائم (David Emile Durkheim) کے نظریہ فعالیت "معاشرتی حقائق کا نظریہ"(Theory of Social Facts) کو مد نظر رکھا گیا ہے۔ اس نظریے کی بنیاد اس بات پر ہے کہ معاشرہ ایک اکائی ہے؛ جو مشترکہ اقدار کی بنیاد رکھتا ہے۔ فرد سے زیادہ گروہ کو اہمیت حاصل ہے۔ فرد پر معاشرے کا بیرونی دباؤ ہوتا ہے یعنی معاشرتی حقائق انفرادی خواہشات کی پیداوار نہیں ہیں بلکہ فرد پر بیرونی عوامل اثر انداز ہوتے ہیں جن کی وجہ سے وہ معاشرتی معمولات کی پابندی کرتا ہے۔

ادب چوں کہ معاشرے کا آئینہ دار ہے۔ تخلیق کار اظہار کے مختلف زاویوں سے معاشرتی اقدار، رسوم اور مسائل کی عکس بندی کر رہے ہوتے ہیں۔ کسی بھی انسانی معاشرے میں رہنے والے افراد کی زندگی کی عکاسی ان کی روایات، عقائد اور اقدار سے ہوتی ہے۔ اقدار وہ بنیادی عقائد ہیں جو رویوں اور افعال کی تشکیل میں رہنمائی کرتی ہیں۔ معاشرتی اقدار کے طور پر افعال کے قابل قبول ہونے کا فیصلہ بھی معاشرہ کرتا ہے کیوں کہ کون سی چیز قدر کی حیثیت اختیار کر جائے اس کا انحصار معاشرے اور معاشرتی تبدیلی پر ہوتا ہے۔ بنیادی طور پر معاشرتی اقدار وہ افعال ہوتے ہیں جو قابل قبول، من پسند اور قابل قدر ہوں نیز جنہیں معاشرہ بحیثیت مجموعی پسند کرتا ہو۔ ان مروجہ اقدار کے حصول کے لیے افراد کوشش کرتے ہیں، وقت اور سرمایہ

صرف کرتے ہیں اور معاشرہ ان کو جائز طریقے سے حاصل کرنے کی اجازت دیتا ہے۔ یہ اقدار اس بات کا تعین کرنے میں افراد کی مدد کرتی ہیں کہ ان کے لیے کیا اہم ہے۔ ان اقدار میں اخلاق و عادات، رسم و رواج اور طرزِ بود و باش وغیرہ بھی شامل ہوتی ہیں۔ معاشرتی ہم آہنگی اور معاشرے کا نظم و ضبط قائم رکھنے کے لیے معاشرتی اقدار بنیادی کردار ادا کرتی ہیں یہ اخلاقیات کا درس دیتی ہیں کیوں کہ یہ کسی بھی گروہ کی پسندیدگی کا مشترکہ تصور ہے۔ البتہ یہ ایک الگ بحث ہے کہ کون سی چیز کب اور کیسے قدر کی حیثیت اختیار کر جائے کیوں کہ معاشرہ اپنی ضروریات کے مطابق اپنی روایات میں تبدیلی پیدا کرتا ہے یوں وہ افعال جو کبھی کسی معاشرے میں برے سمجھے جاتے رہے ہوں وہ وقت اور ضرورت کے مطابق مثبت جب کہ پرانی قدر فرسودہ کہلائی جاتی ہے یوں معاشرے میں اقدار کے مثبت اور منفی ہونے کا فیصلہ بھی معاشرتی گروہ کرتا ہے۔

معاشرتی تبدیلیاں روایتی عمل کو توڑتی ہیں جس سے نئے تقاضے ابھرتے ہیں۔ جیسے جیسے معاشرہ ترقی کرتا ہے اور دیگر عوامل کے اثرات قبول کرتا ہے، اس کے اثرات معاشرتی اداروں پر پڑتے ہیں اور معاشرتی اداروں میں تبدیلی نہ صرف معاشرتی قدروں میں تبدیلی کا موجب بنتی ہے بلکہ معاشرتی اداروں کی صحت پر بھی اثر انداز ہوتی ہے۔ اس میں کچھ نئے عقائد، رسم و رواج، اقدار اور معمولات شامل ہو جاتے ہیں۔ عمومی طور پر اقدار نجی زندگی سے منسلک ہوتی ہیں۔ لیکن بڑی سطح پر مذہب، معاشرے اور فرد کی پوری زندگی پر یہ حاوی ہوتی ہیں۔ اس تحقیق میں تغیر پذیر معاشرتی اقدار کی عکاسی کے جائزے کے لیے اکیسویں صدی کے پاکستانی اردو افسانے کو منتخب کیا گیا ہے۔ اقدار کی تغیر پذیر صورت حال کے حوالے سے معاشرتی رویوں کے متعلق مثال ملاحظہ ہو۔ پاکستانی معاشرے میں مشترکہ خاندانی نظام کو ہمیشہ سے زیادہ اہمیت حاصل رہی ہے اور اس نظام کو کثرت سے پسند کیا جاتا رہا ہے یوں یہ نظام ایک معاشرتی قدر کی حیثیت اختیار کر گیا لیکن وقت کے ساتھ ساتھ یہ قدر تبدیل ہوتی جا رہی ہے اور اب ماضی کی نسبت خاص طور پر شہری علاقوں میں گھرانے مشترکہ خاندانی نظام کے بجائے جداگانہ خاندانی نظام کو اپناتے ہوئے نظر آ رہے ہیں۔ اسی طرح مرد کے حاکمیت کے تصور میں بھی تبدیلی آنے لگی ہے۔ سادگی پاکستانی معاشرے کی اہم قدر تھی لیکن اب اس کی جگہ فیشن اور برینڈ کلچر کو اہمیت حاصل ہے۔ اسی طرح جہاد کا تصور، ایک اسلامی قدر تھی جس کو دور حاضر میں قتل و غارت، دہشت گردی، شدت پسندی اور انتہا پسندی جیسے نام دے دیے گئے ہیں کیوں کہ جہاد کے نام پر نائن الیون کے بعد سے دہشت گردی بڑھ گئی۔ عالمگیریت اور معیشت (مارکیٹ اکانومی) نے بڑی سطح پر معاشرے کو متاثر کیا ہے۔ جس کے اثرات مختلف شعبہ ہائے زندگی پر مرتب ہو رہے ہیں۔ کوئی معاشرہ چاہے کتنا ہی ترقی

یافتہ کیوں نہ ہو لیکن اس میں خلارہ جاتا ہے۔ معاشرے میں بعض اقدار اتنی تیزی سے تبدیل ہو رہی ہیں کہ یہ اندازہ کرنا بھی مشکل ہو جاتا ہے کہ کب معاشرے میں یہ ناجائز تھیں اور کب نہ صرف جائز بلکہ ضروری بھی ہو گئیں۔ اس موضوعِ مقالہ کے تحت اکیسویں صدی کے پاکستانی اردو افسانوں میں تغیر پذیر معاشرتی اقدار کا جائزہ لیا گیا ہے کہ اکیسویں صدی میں معاشرتی اقدار کس طرح بتدریج تغیر کی طرف رواں دواں ہیں۔ وہ کون سے عوامل ہیں جن کے اثرات معاشرے پر پڑے اور اقدار و روایات میں تبدیلی رونما ہوئی۔ معاشرتی اداروں میں آنے والی تبدیلیوں، ان میں پیدا ہونے والے مسائل نیز معاشرتی انحطاط کی وجوہات بھی اجاگر کی گئی ہیں۔ فکشن کی صورت ان بیانیوں کا باریک بینی سے جائزہ لے کر ان اثرات، چیلنجز اور اختراعات کو جاننے کی کوشش کی گئی ہے جس نے معاصر ادبی منظر نامے کی تشکیل میں کلیدی کردار ادا کیا ہے۔

ii۔ بیان مسئلہ (STATEMENT Of PROBLEM)

عصری اردو افسانہ معاشرتی تبدیلیوں کا آئینہ دار ہے۔ ترقی پذیر نظام روایتی طرز معاشرت کو یکسر تبدیل کر دیتا ہے۔ اس پر ہر طرح کے عوامل، مسائل، ترقیاتی منصوبے، ٹیکنالوجی کی ترقی، اعلیٰ تعلیم، عالمگیریت اور ثقافت پذیری وغیرہ کے گہرے اثرات مرتب ہوتے ہیں جو معاشرے کی اقدار میں تغیر برپا کرتے ہیں۔ پاکستان تقسیم کے بعد سے مسلسل مختلف حالات سے گزر رہا ہے۔ اکیسویں صدی ایک نئے دور اور نئی تبدیلیوں کا سورج طلوع کرتی ہے۔ اس عہد کے اس بدلتے معاشرتی منظر نامے میں معاشرے کی اقدار بھی تغیریاتی مراحل سے گزری ہیں جن کی عکاسی ہمیں اکیسویں صدی کے پاکستانی اردو افسانے میں نمایاں طور پر دیکھنے کو ملتی ہے۔ تخلیق کار چوں کہ معاشرے کا حساس فرد کہلاتا ہے اور وہ ان تمام تبدیلیوں کا فوری اثر قبول کرتا ہے، یہی وجہ ہے کہ اس تحقیق کے تحت اس صدی کے پاکستانی اردو افسانے میں معاشرتی تغیر پذیر اقدار کا مطالعہ کیا گیا ہے۔ پاکستانی معاشرے میں رائج اصولوں اور تصورات کی تشکیل اور چیلنج کرنے والے عوامل کے معاشرے اور ادب پر اثرات کو سمجھنے کے لیے یہ مطالعہ ضروری ہے۔ اس سے قبل اس حوالے سے کسی قسم کا تحقیقی و تنقیدی کام نہیں کیا گیا تھا یہی وجہ تھی کہ یہ موضوع تقاضا کرتا تھا کہ اس پر تحقیقی و تنقیدی کام کیا جائے۔

iii۔ مقاصد تحقیق (RESEARCH OBJECTIVES)

اس تحقیق کے دوران درج ذیل مقاصد مد نظر رکھے گئے:

۱۔ اکیسویں صدی کے پاکستانی اردو افسانے کے تناظر میں تغیر پذیر معاشرتی اقدار کا مطالعہ کرنا
۲۔ اکیسویں صدی کے پاکستانی اردو افسانے میں تغیر پذیر معاشرتی اقدار کے پس پردہ محرکات کو اجاگر کرنا
۳۔ اکیسویں صدی کے پاکستانی اردو افسانے میں پیش کردہ تغیر پذیر معاشرتی اقدار کے مضمرات کا جائزہ لینا

iv۔ تحقیقی سوالات (RESEARCH QUESTION)

اس تحقیقی مقالے کے لیے درج ذیل سوالات کو مد نظر رکھا گیا ہے۔

۱۔ اکیسویں صدی کے پاکستانی اردو افسانے میں تغیر پذیر معاشرتی اقدار کو کن معاشرتی اداروں کے تحت پیش کیا گیا ہے؟
۲۔ اکیسویں صدی کے پاکستانی اردو افسانے میں پیش کی گئی تغیر پذیر صورت حال اور معاشرتی اقدار کے پس پردہ کون سے عوامل کار فرما ہیں؟
۳۔ پاکستانی اردو افسانے میں تغیر پذیر معاشرتی اقدار کے نتیجے میں ہونے والی تبدیلیوں کے مثبت اور منفی پہلو کون کون سے ہیں؟

v۔ نظری دائرہ کار (THEORETICAL FRAMEWORK)

پیشِ نظر تحقیقی کام معاشرتی سطح پر تبدیل ہونے والے حالات اور بدلتی ہوئی معاشرتی اقدار سے متعلق ہے۔ اس صورت حال کا جائزہ اکیسویں صدی کے افسانے میں کی گئی عکاسی کی روشنی میں کرنا مقصود ہے۔ اس تحقیقی منصوبے کے تحت مطالعہ کرنے کے لیے ماہرین سماجیات کے نظریات کو مد نظر رکھا گیا ہے۔ بلخصوص معاشرے کے اصول و قوانین اور اس کی ساخت کو بر قرار رکھتے ہوئے استحکام پیدا کرنے والے نظریات سے معاونت لی گئی ہے۔ جس کے لیے فعلی مکتبہ فکر (Functionalist School of Thought) کو مد نظر رکھتے ہوئے اس مکتب فکر سے تعلق رکھنے والے ماہر سماجیات ایمائل ڈرخائم (Emile Durkheim) کا نظریہ "معاشرتی حقائق" (Theory of Social Facts) پیش نظر ہے۔ یہ نظریہ ڈرخائم کی کتاب "The Rules of Sociological Method" جو ۱۸۹۵ء میں شائع ہوئی میں پیش کیا گیا ہے۔

اس نظریے کی بنیاد یہ ہے کہ معاشرہ متفقہ اقدار کے ذریعے نشوو نما پاتا ہے۔ معاشرہ صرف افراد کے مجموعے کا نام نہیں ہے بلکہ ڈرخائم کے نزدیک یہ ایک مکمل اکائی ہے۔ یہ نظریہ بحث کرتا ہے کہ ہمارے طرز عمل کی تشکیل سماجی اداروں جیسے کنبہ، تعلیم، میڈیا اور پیشوں کے سبب ہوتی ہے۔ اس نظریے کے تحت

اس کی مثال یوں پیش کی جاتی ہے کہ معاشرہ ایک انسانی جسم ہے جس کے مختلف اجزا ایک بہترین کُل کی تشکیل میں اپنا کردار ادا کرتے ہیں۔ جیسے کسی انسانی جسم کے اجزا میں دل، گردہ، معدہ اور دماغ ہوتے ہیں اسی طرح معاشرے کے اجزا میں تعلیم، میڈیا، خاندان اور معیشت وغیرہ شامل ہوتے ہیں۔

یہ نظریہ اس بات پر زور دیتا ہے کہ معاشرے میں کچھ حقائق پائے جاتے ہیں جن کا مطالعہ کیا جانا چاہیے اور ان حقائق کا مطالعہ ایک صحت مند معاشرے کے لیے ضروری ہے تاکہ اس کے افراد اس معاشرے کی روایات و اقدار سے منحرف نہ ہوں نیز معاشرتی استحکام کے لیے ضروری ہے کہ معاشرے کے تمام اعضا ہم آہنگی سے عمل کرتے رہیں یوں معاشرہ صحت مند رہے گا۔ لیکن اگر ان میں سے ایک یا زائد اہم اداروں میں خرابی ہونے لگتی ہے تو معاشرہ ناکارہ ہونا شروع ہو جاتا ہے۔ ڈرخائم نے ان معاشرتی حقائق کا مطالعہ کرنے پر زور دیا جو معاشرے میں پائے تو جاتے ہیں لیکن بظاہر نظر نہیں آتے۔ یہ بالواسطہ طور پر ہمارے رویوں کو متاثر کر رہے ہوتے ہیں۔ ان کی دو اقسام ہیں مادی اور غیر مادی حقائق۔ مختصر یہ کہ ڈرخائم معاشرتی حقائق کے مطالعے پر زور دیتا ہے اور معاشرتی حقائق سے اس کی مراد رویے، اقدار قوانین، رسم و رواج اور عقائد ہیں اور اس کے لیے معاشرتی اداروں کا کردار اہم ہے جو فرد پر اثر انداز ہوتے ہیں۔ ڈرخائم کا خیال ہے کہ ان حقائق کے مطالعے سے ماہرین سماجیات معاشرے کا تجزیہ کر سکتے ہیں کہ معاشرہ کیسے کام کرتا ہے اور اس میں لوگوں کے رویے، اقدار اور افعال کیسے تشکیل پاتے ہیں کیوں کہ یہ غیر متعین ہیں اور معاشرتی تبدیلی اور ترقی کے ساتھ ساتھ مسلسل تبدیل ہو رہے ہیں۔ لہٰذا ماہرین کو ان تبدیلیوں کا مطالعہ کرنے کی ضرورت ہے تاکہ وہ جن معاشروں کا مطالعہ کر رہے ہیں ان کے بارے میں گہری سمجھ بوجھ رکھتے ہوں۔ ڈرخائم کا نظریہ معاشرے میں استحکام پیدا کرنے والے عوامل کے مطالعے پر زور دیتا ہے لہٰذا موضوعِ تحقیق کی مناسبت سے دیکھا جائے تو اقدار کی تغیر پذیری کے پس پردہ معاشرتی تغیر کارفرما ہوتا ہے۔ یہی تغیر اقدار میں تبدیلی کا موجب بنتا ہے۔

فنکشنل ازم اور ڈرخائم کے نظریہ معاشرتی حقائق (Social Facts) سے اخذ شدہ درج ذیل نکات کی روشنی میں تحقیق کی گئی ہے۔

ا۔ فرد کی بجائے گروہ سماجی حقیقت ہے۔ معاشرتی حقائق انفرادی خواہشات کی پیداوار نہیں ہیں۔ فرد معاشرتی دباؤ قبول کرتا ہے اقدار مجموعی طور پر معاشرے کے ذریعے تخلیق ہوتی ہیں اور برقرار رہتی ہیں۔ (مختصراً فرد کے انفرادی رویے پر اجتماعی قوتیں اثر انداز ہوتی ہیں)

۲۔ معاشرتی حقائق کی دو اقسام ہیں مادی حقائق: جس میں مادی چیزیں عمارتیں، گھر وغیرہ اور غیر مادی حقائق: میں تمام غیر مادہ عناصر (معمولات، مذہب، اقدار، ثقافت وغیرہ) شامل ہیں جو فرد کے کردار کو متاثر کرتی ہیں۔
۳۔ معاشرتی اقدار کو متعین نہیں کیا جاسکتا یہ وقت کے ساتھ ساتھ معاشرتی حالات میں تبدیلی کے ساتھ ترقی پاتی ہیں۔ ان تبدیلیوں کا مطالعہ ضروری ہے۔ معاشرتی اقدار میں تغیر معاشرے کو بدلتے ہوئے حالات کے مطابق ڈھالنے میں مدد کرتی ہیں (یہ اقدار افراد کے رویے، اقدار، اور عقائد پر اثر انداز ہوتی ہیں چاہے وہ اس سے شعوری طور پر واقف نہ ہوں۔)
۴ ۔ نئی اقدار کو متعارف کرانے اور فروغ دینے میں معاشرتی ادارے اہم کردار ادا کرتے ہیں۔
۵۔ معاشرتی اقدار میں تبدیلی کی مختلف وجوہات میں سے معاشرتی تبدیلی، اعلیٰ تعلیم، ٹیکنالوجی، ثقافت پذیری، جدید نظریات، معاشی اور سیاسی حالات اہم ہیں۔
۶۔ معاشرتی تبدیلی معاشرے پر مثبت یا منفی اثرات مرتب کر سکتی ہے۔ اس کو منظم کرنے کے لیے ضروری ہے کہ معاشرے میں روایات اور اختراع کے درمیان توازن قائم کیا جائے۔

اس نظری ڈھانچے کے پیش نظر اکیسویں صدی کے منتخب افسانوں کے متن کا مطالعہ کرتے ہوئے تحقیقی مقالے کو پایۂ تکمیل تک پہنچایا گیا ہے۔ یہ نظریہ ڈرخائم نے کسی خاص معاشرے کو مد نظر رکھتے ہوئے پیش نہیں کیا اس کی بنیاد سائنسی اصولوں پر استوار ہے۔ ڈرخائم کے مطابق ہر ملک، سماج یا ثقافت کے معاشرتی حقائق وہاں کے نظریات، اصولوں ، قوانین اور ثقافت کے مطابق مختلف ہوتے ہیں اور ان کا مطالعہ ہی معاشرے کو سمجھنے اور معاشرے میں توازن قائم کرنے میں معاون ہو سکتا ہے۔ پیش نظر تحقیق کے لیے اس نظریے کے انتخاب کی وجہ بھی یہی کہ معاشرے میں ان حقائق کا مطالعہ کیا جاسکے جو پاکستانی سماج میں اقدار کی تشکیل میں اہم کردار ادا کر رہے ہیں۔ ایک صدی گزرنے کے باوجود آج بھی سماجی تحقیق کے میدان میں ڈرخائم کے نظریات کو خاص اہمیت حاصل ہے۔ گو کہ اس کے نظریات پر اعتراض کرنے والوں کا کہنا ہے کہ ڈرخائم نے نظریہ پیش کرتے ہوئے فرد کی انفرادی اہمیت کو نظر انداز کرتے ہوئے گروہ کو زیادہ اہمیت دی ہے۔ ڈرخائم کے مطابق جب تک فرد معاشرے کا رکن ہے اسے معاشرتی اصولوں کے مطابق خود کو ڈھالنا پڑتا ہے۔ اس تحقیق میں معاشرتی اقدار کی تغیر پذیری، معاشرتی اداروں کا کردار، پاکستانی معاشرے میں تبدیلیوں کی وجوہات، معاشرے پر اس کے اثرات کا مطالعہ نیز معاشرتی اداروں میں پائی جانے والی خرابی کی جڑوں کو بھی جاننے کی کوشش کی گئی ہے تاکہ معاشرہ پائیدار ترقی کے اہداف کو حاصل کرنے میں کامیاب ہو سکے۔

vi۔ تحقیقی طریقہ کار (RESEARCH METHODOLOGY)

اس موضوع کے تحت مطالعے کے سلسلے میں بیانیہ طریقہ تحقیق اپنایا گیا ہے۔ جو استقرائی طریقہ تحقیق کے زمرے میں شمار ہوتا ہے۔ اس کے پیش نظر موجودہ مواد کی جمع آوری، تجزیہ اور اس کی روشنی میں نتائج اخذ کیے جاتے ہیں۔ اس تحقیق میں موادی تجزیہ کا طریقہ (Content Analysis Method) اختیار کیا گیا۔ اس طریقہ کار میں مواد کے اجزا (Contents) کو جمع کر کے ان کا تجزیہ کیا جاتا ہے۔ مجوزہ تحقیق کا content تحدید میں شامل افسانے ہیں۔ موضوع کے تحت وضع کردہ اصولوں کی روشنی میں ان افسانوں کا مطالعہ کیا گیا اور اس مطالعے سے نئے اور اہم نکات اخذ کیے گئے ان اخذ کردہ نکات اور جزئیات کے تجزیے سے تغیر پذیر اقدار کے پیچھے کار فرما محرکات اور عوامل کو تلاش کیا گیا۔

یہ مواد اکٹھا کرنے کا کیفیتی طریقہ Qualitative method ہے۔ اس طریقۂ تحقیق میں معلوم کی جانے والی کیفیت کا حوالہ پیش کیا جاتا ہے۔ اس طرح اسے زیادہ قابل فہم اور زیادہ قابل قبول بنانے کی کوشش کی جاتی ہے۔ اس میں محقق جس زاویہ اور نگاہ سے مواد کے ان اجزا کا مطالعہ کرتا ہے، اس طرح ایک عام شخص انہی اجزا کو نہیں دیکھتا۔ اس خاص زاویے سے مجوزہ موضوع کے تحت تحقیقی و تنقیدی مطالعہ اطلاقی بھی رہا۔ جو نظری دائرہ کار میں پیش کردہ نظریۂ فعالیت اور ڈرخائم کے معاشرتی حقائق کا نظریہ (Theory of Social Facts) کے تحت The Rules of Sociological Method ۱۹۸۲ء میں ڈبلیو۔ ڈی۔ ہالز (W.D.Halls) کی ترجمہ کتاب کو مد نظر رکھا گیا ہے۔ اس نظریے کو مد نظر رکھتے ہوئے افسانوں کا تجزیہ کیا گیا اور تمام تر حقائق سے نتائج مرتب کیے گئے ہیں۔ اس طریقے کے تحت تجزیہ یہ ثابت کرتا ہے اس مواد میں کیا کچھ ہے۔ یہ طریقہ کار ہمیں یہ نہیں بتاتا کہ لکھنے والے یا پڑھنے والے (قاری) کے ذہن میں کیا تھا بلکہ اس سے لکھے ہوئے مواد سے نتائج اخذ کیے جاتے ہیں۔

جیسا کہ اوپر بیان کیا گیا ہے اس تحقیق کی بنیاد موضوع سے متعلق مصادر و ماخذات پر رکھی گئی ہے۔ بنیادی مآخذ تک رسائی کے لیے کتب خانوں جن میں مختلف جامعات (نمل، انٹرنیشنل اسلامک یونیورسٹی، علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی، نیشنل لائبریری) اور نجی کتب خانوں کے ساتھ ساتھ پبلشرز جن میں سنگ میل پبلشر، مثال پبلشر، دوست پبلشرز، فکشن ہاؤس، اکادمی ادبیات، مقتدرہ قومی زبان اور نیشنل بک فاؤنڈیشن جیسے اداروں کی طرف رجوع کیا گیا۔

علاوہ ازیں ثانوی مآخذ جن میں تحقیقی و تنقیدی کتب شامل ہیں اخبارات، رسائل، افسانہ نمبر اور مقالہ جات کو بھی مد نظر رکھا گیا۔ اہم ویب گاہوں سے بھی استفادہ کیا گیا نیز آن لائن کتب خانوں جن میں ریختہ کتب خانے پر دستیاب مواد سے بھی استفادہ کیا گیا۔ تغیر پذیر معاشرتی اقدار سے متعلق رہنمائی حاصل کرنے کے لیے افسانہ نگاروں اور ناقدین سے انٹرویوز کرتے ہوئے ان کی قیمتی آرا سے استفاد کیا گیا ہے۔

vii۔ مجوزہ موضوع پر ما قبل تحقیق (WORKS ALREADY DONE)

پیشِ نظر موضوع جس میں اکیسویں صدی کی پہلی دو دہائیاں شامل ہیں۔ اس عرصے میں منتخب افسانہ نگاروں کے افسانوں میں تغیر پذیر معاشرتی اقدار کا مطالعہ کیا گیا ہے۔ افسانہ نگار جن کے افسانے منتخب کیے گئے ہیں ان کی ادبی خدمات، ان کے افسانوں کا اسلوبی مطالعہ، فکر و فن کا مطالعہ اور کسی خاص تناظر میں جیسے اسد محمد خان کے افسانوں میں نو تاریخیت، زاہدہ حنا کے افسانوں میں نو تاریخیت، آصف فرخی کے افسانوں میں کراچی کی صورت حال، ان کا فن اور تکنیک کے تجربات، حمید شاہد کے افسانوں کا اسلوبی مطالعہ وغیرہ جیسے موضوعات پر کام کیا گیا ہے۔ اسی طرح دیگر تحقیقی کاموں میں پاکستان کے معاشرتی مسائل اور سماجی صورت حال پر متعدد تحقیقی کام ہوئے ہیں مثلاً: دہلی یونیورسٹی سے محمود فیصل نے "پاکستانی افسانہ: ایک سماجیاتی مطالعہ" پر تحقیق کی ہے، طاہرہ اقبال نے بھی پاکستانی اردو افسانے کے حوالے سے تحقیق کی جو پاکستانی اردو افسانے کے سیاسی و تاریخی تناظر کا احاطہ کرتی ہے۔ اسی طرح اردو افسانے کی ذیل میں اہم تذکرہ ڈاکٹر انوار احمد کی تحقیق "اردو افسانہ ایک صدی کا قصہ" ہے۔ اقدار کی تلاش، اقدار کی شکست و ریخت جیسے موضوعات پر بھی اہل قلم غور و فکر کرتے رہے ہیں۔ جیسے "اقدار کی تلاش" ہاشم حسن کے تنقیدی مضامین کی کتاب ہے۔ ایسے دیگر کئی موضوعات پر ادبی اور تحقیقی کام مطبوعہ اور غیر مطبوعہ تحقیقی مضامین کی صورت میں ملتے ہے۔ جس طرح گہرائی سے افسانے کا مطالعہ کرتے ہوئے تغیر پذیر معاشرتی اقدار کی صورت حال کو اس تحقیق میں پیش کیا گیا ہے اس نوعیت کا کام کسی دوسری تحقیق میں اجاگر نہیں کیا گیا۔

viii۔ تحدید (DELIMITATION)

موضوع تحقیق کا دائرہ پاکستانی اردو افسانے کے حوالے سے اکیسویں صدی کی پہلی دو دہائیاں جس میں ۲۰۰۱ء سے ۲۰۲۰ء تک کا عرصہ شامل ہے۔ اسی عرصے میں شائع ہونے والے افسانوں میں تغیر پذیر معاشرتی اقدار کا تحقیقی و تنقیدی مطالعہ کیا گیا ہے۔ اس حوالے سے وہ پاکستانی اردو افسانہ نگار جن کے افسانوں میں واضح

طور پر تغیر پذیر اقدار سامنے آتی ہیں یا "تغیر پذیر اقدار" بنیادی موضوع کے طور پر نمایاں ہیں، صرف وہی افسانے شاملِ تحقیق رہے ہیں۔ دیگر افسانہ نگار جنہیں موضوعِ تحقیق کا حصہ نہیں بنایا گیا، وہ اگرچہ سماجی صورتحال کی واضح عکاسی تو کرتے ہیں لیکن ان کا بنیادی موضوع تغیر پذیر اقدار نہیں ہے بلکہ سماجی زندگی کی پیشکش ہے، جبکہ تغیر پذیر اقدار کسی بھی سماجی زندگی کی وہ رسمیات ہیں جن کی بدولت کوئی سماج تعمیر ہوتا ہے، یعنی سماج کی تعمیر میں ان کا کردار اساسی نوعیت کا ہے۔ اس لیے تغیر پذیر اقدار کے اس اساسی نکتے پر پورا اترنے والے معروف افسانہ نگاروں کو منتخب کیا گیا ہے۔ اس لحاظ سے موضوعِ تحقیق کی تحدید کرتے ہوئے تغیر پذیر اقدار کے سیاق اور تناظر کو مدِ نظر رکھا گیا ہے۔ موضوعِ تحقیق سے متعلقہ ان معروف افسانہ نگاروں میں اگرچہ وہ افسانہ نگار بھی شامل ہیں جو بیسویں صدی میں بھی ادب کی خدمت میں کوشاں تھے اور اکیسویں صدی میں بھی ان کے افسانوی مجموعے سامنے آئے ہیں۔ لیکن زمانی اعتبار سے تحدید کرتے ہوئے ۲۰۰۱ء سے ۲۰۲۰ء تک کے مطبوعہ افسانوی مجموعے شاملِ تحقیق رہے ہیں۔ اس لحاظ سے جن افسانہ نگاروں کے افسانوی مجموعے شاملِ تحقیق رہے ہیں ان میں، مرزا حامد بیگ، حسن منظر، رشید امجد، منشایاد، اسد محمد خان، خالد فتح محمد، انوار احمد، مسعود مفتی، آصف فرخی، حمید شاہد، محمد حامد سراج، مرزا اطہر بیگ، سلیم آغا قزلباش، مبین مرزا، عرفان احمد عرفی، زاہدہ حنا، سلمٰی اعوان، نیلوفر اقبال، طاہرہ اقبال شامل ہیں۔ ان کے علاوہ چند نئے لکھنے والے معروف افسانہ نگاروں میں ناصر عباس نیر، ڈاکٹر شفیق انجم، گل زیب عباسی، سید زبیر شاہ، علی اکبر ناطق، خاور چودھری، حمیرا اشفاق، جواد حسنین بشرؔ جو ابنِ مسافر کے قلمی نام سے لکھتے ہیں ان کے افسانے شاملِ تحقیق ہیں۔ ان کے ہاں عصر حاضر کی متنوع اندرونی و بیرونی کیفیات، ماضی اور حال کی کشمکش، جدید معاشرت کے تیزی سے بدلتے تقاضوں، بدلتی معاشرتی اقدار کو فنکارانہ تہ داری اور خیال انگیزی کے ساتھ سمویا گیا ہے۔

ix۔ پس منظری مطالعہ (LITERAURE REVIEW)

اس تحقیقی موضوع پر کام کرنے سے قبل جن کتب کا مطالعہ کیا گیا تھا ان میں اکیسویں صدی کے افسانوں کا مطالعہ شامل تھا۔ اس کے علاوہ اردو افسانے سے متعلق تحقیقی و تنقیدی کتب جن میں ڈاکٹر انوار احمد کی تصنیف "اردو افسانہ ایک صدی کا قصہ" جو ۲۰۰۷ء میں منظر عام پر آئی اس کا مطالعہ کیا گیا تھا۔ اس میں ۱۵۲ افسانہ نگاروں کا تذکرہ شامل ہے۔ یہ کتاب تین حصوں پر مشتمل ہے۔ روایت، حاصل اور امکانات اس تقسیم کے تحت افسانہ نگاروں کا مختصر احوال اور ان کے فکر و فن کے حوالے سے جامع تعارفی نوٹ دیکھنے کو ملتے ہیں۔ اس کتاب کے مطالعے سے ہم قدیم و جدید افسانہ نگار اور ان کے فن سے آگاہی حاصل کر سکتے ہیں۔

پروفیسر فتح محمد ملک اس کے پیش لفظ میں اعتراف کرتے ہیں کہ ڈاکٹر انوار احمد نے انتہائی بصیرت افروز انداز میں فکشن کے اس سفر کو پیش کیا ہے اور اس کے ساتھ ساتھ ہر منفرد افسانہ نگار کے فکر و فن کا تنقیدی جائزہ پیش کیا ہے۔ اس کے مطالعے سے اردو افسانے کے سفر کی ایک مفصل داستان سے آگاہی ملتی ہے۔

اس کے علاوہ طاہرہ اقبال کی تحقیق "پاکستانی اردو افسانہ سیاسی و تاریخی تناظر" کا مطالعہ کیا گیا؛ یہ کتاب پانچ ابواب پر مشتمل تحقیقی و تنقیدی کتاب ہے۔ اس کی اشاعت ۲۰۱۵ء میں ہوئی۔ اس کتاب میں قیام پاکستان سے لے کر ۲۰۱۵ء تک کے اردو افسانے کا جائزہ پانچ ابواب میں تقسیم کرتے ہوئے پیش کیا گیا ہے۔ باب اول قیام پاکستان سے پہلے اردو افسانہ میں سیاسی و تاریخی نقوش ۱۹۰۰ء سے ۱۹۴۷ء تک کے جائزے پر مشتمل ہے۔ ہر باب کو بھی فصل اول، دوم، سوم اور چہارم میں تقسیم کیا گیا ہے۔ اس کے مطالعے سے پاکستان کے مسائل جن میں ہجرت، مسئلہ کشمیر، مسئلہ فلسطین، مارشل لا، ۱۹۶۵ء کی جنگ، سقوط مشرقی پاکستان، دہشت گردی، نائن الیون وغیرہ کے تناظر میں پاکستانی افسانے کا جائزہ پیش کیا گیا ہے۔

موضوعِ مقالہ کے تحت کام کرنے کے لیے "سماجی تحقیق" عذرا عابدی کی کتاب جو ۲۰۱۸ء میں شائع ہوئی اس کا مطالعہ بھی کیا گیا یہ قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے تعاون سے شائع ہوئی۔ سماجیات جو سماج کے مسائل کا حل سائنسی طریقۂ کار کے مطابق کرتی ہے، اس موضوع کو سمجھنے کے لیے عذرا عابدی کی یہ کتاب اردو میں ایک اہم اضافہ ہے جو سماجی تحقیق کے حوالے سے بنیادی معلومات اور اصطلاحات کا احاطہ کرتی ہے۔ اس میں نہ صرف سماجی تحقیق، اس کے طریقے اور اقسام وغیرہ بیان کی گئی ہیں بلکہ اس سے متعلق اہم تصورات سے بھی آگاہی ملتی ہے۔ اس سلسلے میں "پاکستانی معاشرہ" از ڈاکٹر مبارک علی، ایس ایم شاہد کی تصنیف "پاکستانی معاشرہ اور ثقافت"، ڈاکٹر اقبال آفاقی کی تحقیق "اردو افسانہ فن ہنر اور متنی تجزیے" اور وارث علوی کی کتاب "جدید افسانہ اور اس کے مسائل" سے بھی استفادہ کیا گیا ہے۔

x۔ تحقیق کی اہمیت (SIGNIFICANCE OF STUDY)

تغیر پذیر معاشرتی اقدار کے حوالے سے پاکستانی اردو افسانے کا جائزہ ایک منفرد تحقیقی و تنقیدی کام ہے جس پر اس سے قبل گراں قدر کام نہیں ہوا۔ پاکستانی معاشرے اور ثقافت پر تو بہت سی کتب ملتی ہیں۔ مگر افسانے میں معاشرتی اقدار اور تغیر پذیر اقدار کی پیش کش اس تحقیق کا خاصہ ہے۔ پاکستانی اردو افسانہ مختلف نظریات کی نمائندگی کرنے والے تخلیق کاروں کے متنوع خیالات کو پیش کرتا ہے لہٰذا یہ تحقیق ان تناظرات اور خیالات کا ایک دستاویز کی صورت میں جائزہ لینے اور معاشرے کا تجزیہ کرنے میں معاون ثابت ہو گی۔ اس

صدی میں ہونے والی ٹیکنالوجی کی ترقی، عالمگیریت، دہشت گردی، کورونا کی صورت حال، سیاسی، مذہبی، معاشی حالات اور معاشرتی نظریات نے معاشرے کو کس طرح متاثر کیا، معاشرے کے اہم اداروں میں تغیر و تبدل کی وجوہات اور اقدار کی تغیر پذیری کے پس پردہ عوامل کے تجزیے کے حوالے سے اکیسویں صدی کے افسانے کا مطالعہ اہم ہے کیوں کہ ادیب اپنے معاشرے اور ارد گرد سے ہی موضوعات تخلیق و تحریر کا حصہ بناتے ہیں جس سے معاشرے کی جیتی جاگتی تاریخ عیاں ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس تحقیقی مقالے کے ذریعے تغیر پذیر اقدار کا احاطہ عصری مسائل کو حل کرنے، اس صدی میں پیدا ہونے والی صورت حال اور تغیر کے پس پردہ محرکات عیاں کرنے میں معاون ہے۔ اس تحقیقی مطالعے سے قاری کے ذہنی و فکری مطالعے میں وسعت پیدا ہو گی اور معاشرے کو متاثر کرنے والے عوامل عیاں ہو سکیں گے نیز تخریبی عوامل کو مد نظر رکھتے ہوئے معاشرے کے تعمیری پہلوؤں سے آگاہی ملے گی اور تعمیری پہلوؤں کو مد نظر رکھتے ہوئے ان میں مزید بہتری لانے کی راہیں ہموار ہوں گی۔ یہ مطالعہ دقیانوسی تصورات کو دور کرنے، ورثے کو محفوظ رکھنے اور جامع معیارات کو فروغ دینے اور عصری مسائل کو حل کرنے کے حوالے سے بھی اہمیت کا حامل ہے۔ یہ تحقیق تنقیدی سوچ کو فروغ دیتی ہے اور معاشرے کا باریک بینی سے مشاہدہ کرنے اور مختلف سماجی گروہوں میں ہمدردی اور افہام و تفہیم کو فروغ دینے میں اردو افسانے کے کردار کو اجاگر کرتی ہے۔

ب۔ معاشرتی اقدار (تعارف اور بنیادی مباحث)

انسان کی معاشرتی زندگی کی تعمیر و ترقی اور خوش حال معاشرے کو مستقل بنیادوں پر استوار کرنے کے لیے معاشرتی اقدار بنیادی اہمیت کی حامل ہیں۔ معاشروں کی تشکیل میں اقدار کی اہمیت اس لحاظ سے بھی اہم ہے کہ یہ انسان کے تعلقات، فلاح و بہبود، نظام زندگی کو مربوط کرنے، انسان کو اجتماعی زندگی گزارنے کے اصول و قوانین، معیارات، اخلاقی تناظرات، ثقافتی و تہذیبی روایات کی پاسداری اور یک جہتی کو فروغ دینے میں کلیدی کردار ادا کرتی ہیں۔ کسی بھی معاشرے کی پہچان اس کی اقدار سے ہوتی ہے۔

i۔ اقدار: معنی، مفہوم، اقسام۔

اقدار (Values) کا لفظ سنتے ہی اس کے مختلف معنی اور مفہوم ذہن میں آتے ہیں۔ عام فرد کے ذہن میں اخلاقیات (Ethics) کا تصور ابھرتا ہے۔ اقدار کو شعبہ عمرانیات کے دائرہ اختیار میں بھی سمجھا جاتا ہے اور معاشیات سے تعلق رکھنے والے اقدار کو اشیا کی قدروں کے حوالے سے جانتے ہیں۔ پیشِ نظر تحقیق کے تناظر

میں بات کی جائے تو اقدار کا تعلق انسان کی معاشرتی زندگی اور اس کے ماحول سے ہے؛ انسان کی زندگی کی افزائش ان ہی قدروں سے وابستہ ہے۔ کسی بھی معاشرے میں اقدار انسان کی زندگی کو بہتر اور مستحکم بنیادوں پر استوار کرنے میں نہ صرف اہم کردار ادا کرتی ہیں بلکہ یہ انسان کے جذبات و احساسات اور خواہشات کی صورت بنیادی ضروریات زندگی کے روپ میں عیاں ہوتی ہیں۔ ان کا کوئی ٹھوس یا جامد وجود نہیں بلکہ حسی طور پر ان کا ادراک کیا جاسکتا ہے۔ اقدار فرد کی ترجیحات کہلاتی ہیں اور انسان ہمیشہ اچھی سے اچھی اور معیاری چیز کو ترجیح دیتا ہے یوں اقدار اچھائی اور ترقی کے معیارات کو کہا جاسکتا ہے۔ مختلف اقوام، مذاہب اور معاشروں میں اپنی اپنی مخصوص اقدار پائی جاتی ہیں جو اُن کی زندگی کی خاص پہچان اور ترجمان ہوتی ہیں۔ ان کو ماننا اور ان پر عمل کرنا معاشرے کے نظم وضبط اور حسن کو قائم رکھنے میں اہم کردار ادا کرتا ہے۔ یہاں کسی بھی قسم کی رائے قائم کرنے سے قبل لفظ اقدار / قدر اور معاشرتی اقدار کے لغوی اور اصطلاحی معنی پر روشنی ڈالتے ہوئے ماہرین کی پیش کردہ تعریفوں کا جائزہ لیتے ہوئے "اقدار کسے کہتے ہیں؟" کے تصور کو اجاگر کیا گیا ہے۔

الفاظ کا وجود ایک ایسا گورکھ دھندا ہے جس میں الفاظ ایک ہی وقت میں کئی معنی، مفہوم اور مترادفات رکھتے ہیں: کچھ الفاظ لغوی معنی کے اعتبار سے مختلف مفہوم رکھتے ہیں اور اسی طرح کچھ الفاظ کے مجموعے سے جو مخصوص مفہوم ادا ہوتا ہو، اسے لمبے لمبے فقروں اور غیر ضروری طوالت سے بچانے کے لیے ایک لفظ یا مرکب کی صورت میں پیش کر دیا جاتا ہے جس کو اصطلاح کہتے ہیں۔ لہٰذا تحقیق کے تناظر میں اقدار کے لغوی اور اصطلاحی مفہوم کا جائزہ لینا ضروری ہے۔ اقدار؛ قدر کی جمع ہے اور قدر عربی زبان کا لفظ ہے۔ فرہنگ عامرہ میں اقدار کو قدر کی جمع کے طور پر لکھتے ہوئے قدر کے معنی اس طرح سے درج کیے گئے ہیں:

اقدار۔ اَق دار۔ قدر کی جمع

قدر۔ اندازہ، مقدار، طریقہ، اصل اصول، عزت وقعت، طاقت جمع اقدار [۱]

جب کہ فیروز اللغات میں قدر کا مطلب دیکھیں تو اس سے پتا چلتا ہے کہ یہ عربی لفظ بطور مونث استعمال ہوتا ہے۔ جس کے تین مختلف معنی یوں ہیں: قدر۔ (ع۔ ا۔ مث) (۱) عزت۔ بزرگی۔ توقیر۔ درجہ۔ مرتبہ۔ رتبہ۔ (۲) کسی چیز کا اندازہ۔ مقدار (۳) برابر۔ یکساں [۲]

اردو زبان کی ضخیم لغت "اردو لغت (تاریخی اصولوں پر)" جو ۲۲ جلدوں میں تدوین شدہ ہے اس میں اقدار کا مطلب قیمت اور اندازے کے معنی میں معاشیاتی حوالے سے بیان کرنے کے ساتھ ساتھ مختلف معنی میں بیان کیے گئے ہیں۔

"اقدار:ا۔ پیمانے، اندازے؛ قدرو قیمت، ارادے کے لحاظ سے اہمیتیں۔ کئی لوگ اقدار آرا سے معارضہ کرنے والے ہیں۔ مابعد الطبیعات کا تعلق حقائق سے ہوتا ہے ایک دوسرا علم ہے جس کا تعلق اقدار سے ہے۔ ۲۔(معاشیات) قیمت مبادلہ۔ اقدار زر میں ایک قدرتی یا فطری قدر کہلاتی ہے اور ایک قدر قانونی۔ واحد: قدر (طاقت، قوت)"[۳]

نور اللغات میں بھی اقدار کو بطور مقدار کے معنی میں استعمال کرتے ہوئے معنی واضح کیا گیا ہے۔ "مقدار انداز ظاہر کرنے کے لیے (جیسے) اس قدر پانی کیا ہو گا۔ تم اس قدر گھبراتے کیوں ہو۔۔۔ فارسیوں نے بمعنی خوبی بزرگی بھی استعمال کیا۔ عزت۔ بزرگی۔ توقیر۔ درجہ۔ مرتبہ۔۔۔"[۴]

علمی اردو لغت میں: "اقدار[ع۔امث] قدر کی جمع۔ اصول۔ معیار۔ قواعد" درج ہے۔[۵]

"قومی انگریزی اردو لغت" میں انگریزی مستعمل "value" یعنی قدر کی وضاحت مختلف شعبہ جات کے حوالے سے کی گئی ہے۔ مثلاً لسانیات میں "قدر" صوتیات میں کسی لفظ کی مخصوص آواز کی نوعیت کو ظاہر کرتی ہے۔ اسی طرح اس کے مختلف استعمال ہیں۔ جن میں یہ بطور لفظ، بطور مصوری، قدر تعلیم کے شعبے میں ،اسی طرح اس کو بطور جمع عمرانیات کے شعبے میں وضاحت کرتے ہوئے یوں درج کیا گیا ہے:

"Value، قدر؛ قیمت،؛ مالیت؛ کسی شے کی قدر و قیمت۔۔۔ (جمع) (عمرانیات) کسی قوم کی وہ خصوصیات ، رسوم ، معیارات اور اصول جو اچھے سمجھے جاتے ہیں؛ سماجی اقدار۔(فعل متعدی) قیمت تشخیص کرنا؛ قیمت کا تعین کرنا؛ اہلیت، قابلیت، افادیت یا اہمیت کے لحاظ سے جانچنا، بہت عزت اور احترام کرنا۔"[۶]

یعنی قدر کے بطور جمع معنی میں تبدیلی آتی ہے اور اس تحقیق میں اقدار کو جس معنی کے طور پر لیا گیا ہے اس سے مراد کسی قوم یا معاشرے کے رسوم و رواج ، معیارات اور اصول ہیں ، جن کو اچھا سمجھا جاتا ہے۔ "فرہنگ ادبی اصطلاحات" میں پروفیسر کلیم الدین احمد نے "اقدار" کو مختلف حوالوں سے بیان کیا ہے جس میں اقدار کی مختلف اقسام: فنی، کلچرل، اخلاقی اور مذہبی اقدار کو اس طرح سے درج کیا گیا ہے۔

"Values: قدریں۔ ایک قدر لذت پرستی ہو سکتی ہے کیوں کہ فنی کارنامہ فوری مسرت بخشتا ہے۔ یہ فنی ہو سکتی ہے کیونکہ اس میں صناعت کا حسن ہے۔ یہ کلچرل ہو

سکتی ہے کیونکہ سماج یا تمدن کے لیے معنی خیز ہے۔ یہ اخلاقی یا مذہبی ہو سکتی ہے اور یہ عملی ہو سکتی ہے۔"(۷)

"ادبی اصطلاحات" میں پروفیسر انور جمال اقدار کے حوالے سے بطور اصطلاح وضاحت کرتے ہوئے رقم طراز ہیں کہ:

"اقدار Values: یہ اصطلاح دراصل اخلاقیات کے راستے سے ادب میں داخل ہوئی انسان کے لیے بعض چیزیں اہم اور بعض غیر اہم ہوتی ہیں۔ لہٰذا ہم ان چیزوں کی طرف زیادہ متوجہ ہوتے ہیں جو ہمارے لیے اہم ہوتی ہیں اور ان سے صرف نظر کرتے ہیں جن کو ہم غیر اہم سمجھتے ہیں۔ وہ اقدار ہمارے لیے زیادہ اہم ہوتی ہیں جو ہماری تمناؤں اور خواہشوں کو مکمل کرنے میں مدد دیتی ہیں جو قدریں انسانی فطرت کی زیادہ سے زیادہ تسکین کا باعث بنتی ہیں اور ان کے ذریعے سے بعض دوسری خواہشات کو تسکین ملتی ہے۔"(۸)

اس تعریف کی ذیل میں دیکھا جائے تو اقدار سے مراد وہ سب کچھ ہے جس کی انسان خواہش کرتا ہے اور جسے اہمیت دیتا ہے۔ اس کی مزید وضاحت کرتے ہوئے پروفیسر انور جمال، سید علی عباس جلال پوری اور ابوالاعجاز حفیظ صدیقی نے یونان کے فلاسفروں کی مثال دی ہے۔ جس میں حسن، خیر اور صداقت کو آفاقی اقدار تصور کرتے ہوئے دولت، شہرت، عزت وغیرہ کو اضافی قدریں قرار دیا ہے۔ یعنی انسان جن چیزوں کی قدر کرتا ہے اس میں دولت اور شہرت ایسی خواہشات ہیں جس کی ہر فرد کے نزدیک اہمیت ہوتی ہے لیکن یونانی فلاسفر اس کو غیر اہم سمجھتے ہیں اور خیر، صداقت اور حسن کو آفاقی تصور کرتے ہیں کیوں کہ یہ ایسی اقدار ہیں جو مشترکہ حیثیت رکھتی ہیں۔ سید علی عباس جلال پوری نے اس کے لیے بنیادی اقدار کی اصطلاح استعمال کی ہے۔ ان کے مطابق اقدار کی دو اقسام ہیں: وسائلی اور بنیادی۔ بنیادی اقدار کی وضاحت کی جاچکی ہے جب کہ وسائلی اقدار سے ان کی مراد وہ اشیا ہیں جن کے حصول کے لیے انسان کوشش کرتا ہے۔ دن رات محنت کرتا ہے۔ ابوالاعجاز حفیظ صدیقی نے ان اعلیٰ اقدار کے مفہوم کی وضاحت کے لیے تین تراکیب کی طرف توجہ مرکوز کروائی ہے۔ جن میں "اقدار آفرین، اقدار برترین اور بنیادی اقدار" کی تراکیب شامل ہیں۔(۹)

اقدار انسان کی سماجی زندگی پر گہرائی سے اثرانداز ہوتی ہیں۔ اس کو بڑی سطح پر دیکھا جائے تو اقدار کسی بھی معاشرے کی واضح صورت پیش کرتی ہیں کیوں کہ سماج سے جڑا ہوا فرد جن چیزوں اور اصولوں کو ترجیح

دیتا ہے وہی ترجیحات گروہی صورت میں اپنائی جانے لگیں تو معاشرہ تشکیل پاتا ہے۔ فیض احمد فیض سماجی زندگی کے مختلف شعبہ جات میں سے ادب کا تعلق کلچر سے جوڑتے ہوئے اقدار کی وضاحت ان الفاظ میں کرتے ہیں:

"کلچر سے اقدار (Values) کا وہ نظام مراد ہے جس کے مطابق کوئی سماج اپنی اجتماعی زندگی بسر کرتا ہے ہم جانتے ہیں بعض غیر اہم بعض کو ہم عزیز جانتے ہیں اور بعض کو حقیر گردانتے ہیں۔ انہی ترجیحات کو اقدار کہتے ہیں اور انہی کے عملی اظہار سے ہماری سماجی زندگی کا نقشہ بنتا ہے۔"(۱۰)

"اقدار" بطور لفظ جس کے کئی مختلف معنی ہیں۔ آکسفورڈ عمرانیات کی لغت "A Dictionary of Sociology" میں اس کو بطور شماریات اعداد و شمار کے سکور کے طور پر لیا گیا ہے۔ معاشیات میں قدر کے مختلف معنی ہیں۔ فلسفیوں کے نزدیک اخلاقیات، جمالیات اور سیاسی سطح پر اس کے مختلف معنی ہیں لیکن سماجیات کے حوالے سے اقدار کی وضاحت اس طرح کی گئی ہے۔

"Regarding values as a type of social data, distinctions are often drawn between values. Which are strong, semi-permanent, underlying, and sometimes inexplicit dispositions: and *attitudes, which are shallow…Societies can usually tolerate highly diverse attitudes. Whereas they require some degree of homogeneity and consistency in the values held by people, providing a common fund of shared values which shape social and political consensus…all sociology is concerned with value issues, and many of the classical writer's - most notably Emile Durkheim and Max weber-discussed the role of values in social research at some length."(۱۱)

(اقدار کو اگر معاشرتی مواد کی حیثیت سے دیکھیں تو اقدار کے درمیان اکثر ایک فرق روا رکھا جاتا ہے۔ جو مضبوط، نیم مستقل، بین السطوری اور بعض اوقات مبہم مزاج رکھتی ہیں: اس میں سطحی رویے بھی شامل ہیں۔۔۔ معاشرے عام طور پر انتہائی متنوع رویوں کو برداشت کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ دراصل انہیں اُن اقدار میں جو لوگ اپنا چکے ہوں، کسی حد تک یکسانیت اور مستقل مزاجی کی ضرورت ہوتی ہے۔ یہ امر مشترکہ اقدار کا ایسا نظام فراہم کرتا ہے جس سے سماجی اور سیاسی ہم آہنگی تشکیل پاتی ہے۔۔۔ تمام تر سماجیات اقدار کے مسائل سے متعلق ہے، اور بہت سے

کلاسیکی لکھاریوں نے -خاص طور پر ایمائل ڈرخائم اور میکس ویبر -نے کافی حد تک سماجی تحقیق میں اقدار کی اہمیت پر بحث کی ہے۔)

اقدار میں ایک طویل دورانیے تک یکسانیت اور مستقل مزاجی کی ضرورت ہوتی ہے اور یہ کسی بھی معاشرے میں بسنے والے افراد کا ایک ایسا مشترکہ خزینہ ہوتا ہے جس سے ان افراد معاشرہ میں باہمی اتفاق جنم لیتا ہے۔ سماجیات کی معروف لغت "The Penguin Dictionary of Sociology" کے مطابق اقدار کی تعریف اس طرح سے بیان کی گئی ہے:

> "There is a conventional distinction between values, which are seen to be permanent and important to society, and attitudes, which are fleeting and unstable. While people's attitude may often change, society depends on more or less stable values."(۱۲)

(اقدار، جو معاشرے کے لیے مستقل اور اہم سمجھی جاتی ہیں اور رویے، جو عارضی اور غیر مستحکم ہوتے ہیں، میں ایک روایتی فرق ہے۔ اگرچہ لوگوں کا رویہ اکثر بدل سکتا ہے مگر معاشرہ کم و بیش پائیدار اقدار پر مشتمل ہوتا ہے۔)

محولہ بالا بحث سے واضح ہوتا ہے کہ اقدار؛ قدر کی جمع ہے "قدر" جس کے معنی مقام و مرتبے کے ہیں۔ اس لفظ کے مختلف معنی و مفہوم ہیں۔ اس تحقیق کے پیش نظر "اقدار" کو بطور اصطلاح سماجیات کے تناظر میں دیکھیں تو اس سے مراد کسی بھی معاشرے کے اصول و ضوابط، طور طریقے، رسم و رواج، عادات و افعال وغیرہ ہیں۔ ان سے مراد وہ معیارات ہیں جنہیں کسی بھی معاشرے میں اہمیت دی جاتی ہے۔ معاشرہ ان اقدار کو ترجیح دیتا ہے جو معاشرتی ترقی کی ضامن ہوتی ہیں۔ مثبت اقدار معاشرے کو ترقی کی بلندیوں تک لے جاتی ہے۔ انسان کے لیے بعض چیزیں اہم ہوتی ہیں اور بعض غیر اہم ہوتی ہیں وہ ان چیزوں کی طرف زیادہ توجہ دیتا ہے جو اس کے لیے اہم ہوں۔ جس سے اس کی خواہشات کی تکمیل ہوتی ہے۔ معاشرے میں رہتے ہوئے ہر فرد خوش گوار زندگی بسر کرنے کے لیے بہترین معمولات زندگی چاہتا ہے۔ جس کے لیے مختلف (مثبت یا منفی) حربے استعمال کرتا ہے۔ ممکنہ حد تک بہترین شے حاصل کرنے کے لیے تگ و دو کرتا ہے۔ جس سے وہ اپنے اہداف، خواہشات اور مفادات کی تکمیل کرتا ہے۔ ہر معاشرے کی اقدار اس معاشرے کی ضروریات کے مطابق مختلف ہوتی ہیں۔ اقدار تغیر پذیر ہوتی ہیں مگر ان میں تغیر غیر محسوس انداز میں معاشرے میں

بتدریج رونما ہوتا ہے ۔ معاشرہ ایسی اقدار کو فروغ دیتا ہے جو انسانی افعال کو منظم اور ہم آہنگ کرتے ہوئے معاشرتی ترقی کی ضمانت ہوں۔ اس سیاق میں شنکر راؤ لکھتے ہیں:

> "In sociology the term "value" represents constituent parts of social structure. Social values form an important part of the culture of a society. Social values norms and institutions explain the way in which social processes operate in agiven society. They are the social sources of patterned interactions."(۱۳)

(سماجیات میں "قدر" اصطلاح سماجی ڈھانچے کے جزوی حصوں کی نمائندگی کرتی ہے۔ معاشرتی اقدار معاشرے کی ثقافت کا ایک اہم حصہ تشکیل دیتی ہیں۔ کسی بھی معاشرتی نظام کے افعال کی وضاحت اس معاشرے کی مخصوص اقدار، اصول اور اداروں کے ذریعے ہوتی ہے۔ یہ نظام کو مربوط کرنے والے معاشرتی ذرائع ہوتے ہیں۔)

جب ہم کسی بھی معاشرے کو جزئیات میں تقسیم کر کے دیکھتے ہیں تو ہر جز کی مظہر قدر ہے۔ اقدار سے مل کر ایک ایسا مربوط نظام تشکیل پاتا ہے جس سے ایک مربوط معاشرہ جنم لیتا ہے۔ اقدار اور معاشرہ ایک دوسرے کے لیے لازم وملزوم ہے۔ اقدار معاشرے کا سب سے لازمی حصہ ہیں۔ کسی بھی معاشرے کی تشکیل میں اقدار اہم کردار ادا کرتی ہیں کیوں کہ اس متحرک قوت کے بغیر ایک کامل اور مثالی معاشرے کا تصور نہیں کیا جا سکتا۔ اعلیٰ اقدار سے مثالی معاشرے وجود میں آتے ہیں۔ کسی بھی مخصوص معاشرے کی پہچان اس کی اقدار و روایات سے وابستہ ہے۔ ترقی یافتہ اور مستحکم معاشرے وہ کہلاتے ہیں جو معاشرتی اقدار پر صحیح طریقے سے عمل پیرا ہو کر معاشرے کو فعال بنانے میں اہم کردار ادا کرتے ہیں۔ عام طور پر معاشرے کا اپنا ڈھانچہ ہوتا ہے اور اس کے مختلف حصے مختلف کاموں کو سر انجام دے کر اس کو فعال رکھتے ہیں۔ سسٹم میں تبدیلی اقدار میں تغیر کا موجب بنتی ہے جیسے جیسے انسانی آبادی میں اضافہ ہوتا ہے اس کی ضروریات میں بھی تبدیلی آتی ہے اور ان ضروریات کے مطابق معاشرے اقدار و روایات میں تبدیلی قبول کرتے ہیں ۔ انہیں ضروریات کے پیش نظر انسان کے ماحول میں تبدیلی آتی ہے۔ ہر معاشرے میں معاشرتی نظام کو ہموار رکھنے کے لیے اقدار وضع کی گئی ہیں۔ مثال کے طور پر قبائلی معاشروں اور صنعتی یا زرعی معاشروں کی اقدار میں نمایاں فرق پایا جاتا ہے۔ لہٰذا یہ ضروری نہیں کہ جو چیز ایک معاشرے کے لیے پسندیدہ ہے وہ کسی دوسرے معاشرے کے لیے بھی قابلِ قبول ہو۔ بظاہر ہر معاشرہ ہی اعلیٰ اقدار کو فروغ دیتا ہے۔ لیکن یہ معاشرے میں

رہنے والے افراد پر منحصر ہے کہ وہ کس چیز کو اپناتے ہیں اور کس چیز کو بظاہر اچھا یا برا جانتے ہیں۔ معاشرتی اقدار میں معاشرے کے رہنما اصول اور اخلاقی احکامات خاص اہمیت کے حامل ہوتے ہیں۔ ان اصولوں کو عملی سطح پر نظر انداز کرنے سے معاشرے زوال کا شکار ہوتے ہیں۔ البتہ مثبت یا منفی اقدار میں فرق کرنا نسبتاً مشکل امر ہوتا ہے اس کے پس پردہ ثقافت، مذہب اور ماحول اہم کردار ادا کرتے ہیں۔ دور حاضر میں عالمی سطح پر ترقی کرنے اور معاشرے کو عالمی معیارات کے مطابق ڈھالنے کے لیے معاشرتی ضروریات میں تیزی سے تبدیلیاں رونما ہوئی ہیں جس نے روایتی معاشروں میں بھی تغیر کی لہر برپا کی ہے۔ جیسے جیسے انسان کی ضروریات بدلتی ہیں اس کے ساتھ ساتھ ان کے زندگی گزارنے کے اطوار بھی تبدیل ہو جاتے ہیں۔ معاشرے کی ساخت میں تبدیلی معاشرے کو ترقی یافتہ معاشروں کے ہم پلہ لانے کے لیے کی جاتی ہے اگر ایسا نہ ہو تو معاشرے مظلوم و محکوم بن جائیں۔ یہی وجہ ہے کہ معاشرے کی جدید صورت حال کو مد نظر رکھتے ہوئے جدید قوانین وضع کیے جاتے ہیں جو نظام زندگی جدید تقاضوں کے مطابق ڈھالنے میں اہم کردار ادا کرتے ہیں۔ یہی قوانین قدر کا درجہ بھی اختیار کر جاتے ہیں اور ان کی پیروی نہ کرنا معاشرے میں بگاڑ کا سبب بنتا ہے۔ بنیادی طور پر اقدار و قوانین میں تبدیلی معاشروں کی ترقی کے لیے ہزاروں سال کے تجربات کا نچھوڑ ہوتا ہے جسے معاشرے کی ترقی اور خوش حالی کے لیے عمل میں لایا جاتا ہے اور انہی تجربات سے حاصل ہونے والے مثبت اور منفی نتائج کی روشنی میں روایات ایک نئے سرے سے جدید اقدار کی صورت میں متشکل ہوتی ہیں۔

اقدار کی اقسام

ماہرین سماجیات نے اقدار کو مختلف اقسام میں تقسیم کیا ہے۔ لیکن یہ تعداد ماہرین کے نزدیک مختلف ہے کسی نے دو اقسام بیان کیں، کسی نے تین، کسی نے چار، پانچ اور چھ یہاں تک کہ یہ تعداد تراسی (۸۳) تک جا پہنچی۔ نیشنل کونسل برائے ایجوکیشنل ریسیرچ اینڈ ٹریننگ، نئی دہلی نے تراسی اقسام بیان کی ہیں۔ جو سماجی، روحانی اور اخلاقی حوالے سے ہیں۔ پاکستانی ماہر سماجیات پروفیسر عبدالحمید تگہ اور ڈاکٹر محمد فاروق نے اقدار کو دو اقسام میں تقسیم کیا ہے۔ معاشرتی اقدار اور ثقافتی اقدار۔ سمیتا منا (Samita Manna) اور سپرنا چکرورتی (Suparna Chakarborti) نے اپنی کتاب "Values and Ethics in Business and Profession" میں اقدار کو چار اقسام میں تقسیم کیا ہے۔ ذاتی اقدار، معاشرتی اقدار، تنظیمی اقدار، پیشہ وارانہ اقدار۔ ساتھ ہی یہ بھی واضح کیا ہے کہ ان کا نفاذ معاشرے کے اصولوں کے مطابق ہو گا۔ حوالے سے لکھتی ہیں:

"The life of the individual (Personal Values), the norm of the society (social value), the nature of the institution (organizational value) and also the laws of the formal organization (professional value) and their enactment and enforcement will be determined by the values of society."(۱۴)

(فرد کی انفرادی زندگی (ذاتی اقدار)، معاشرے کے معیارات (معاشرتی اقدار)، ادارے کی نوعیت کے لحاظ سے (تنظیمی اقدار) اور رسمی ادارے کے قوانین کی قانون سازی (پیشہ وارانہ اقدار) اور ان کے نفاذ کا تعین معاشرے کی اقدار کی رو سے کیا جائے گا۔)

میمار ترکشر حمان (Mimar Turkkahraman) اقدار کے حوالے سے اپنے مضمون " Social Values and Value Education" میں اقدار کی مختلف اقسام بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"Values can be categorized in many ways such as by their content (aesthetic, scientific, educational, economic, political, and social values), extensiveness (societal, national and global values) and process (exchange modes) modern and traditional values."(۱۵)

(اقدار کی کئی طرح سے درجہ بندی کی جا سکتی ہے، جیسا کہ: مواد کے لحاظ سے (جمالیاتی، سائنسی، تعلیمی، اقتصادی، سیاسی اور سماجی اقدار)، وسعت کے لحاظ سے (معاشرتی، قومی اور بین الاقوامی) اور طریقہ کار کے لحاظ سے (تبدل کے انداز) جدید اور روایتی اقدار۔)

میمار ترکشر حمان کے مطابق اقدار کو مختلف اقسام میں تقسیم کیا جا سکتا ہے اور انہوں نے چار اقسام بیان کی ہیں۔ پہلی قسم کیفیت کے اعتبار سے اقدار ہیں جن میں معاشی، سماجی، سیاسی، سائنسی و دیگر شامل ہیں۔ دوسری قسم اقدار کی وسعت کے اعتبار سے ہے، جس کا دائرہ بڑی سطح پر دنیا کی مختلف قوموں کو سمیٹے ہوئے ہے۔ اس میں سماجی، قومی اور بین الاقوامی اقدار شامل ہیں۔ طریقہ کار کے اعتبار سے اگر ہم اقدار کی گروہ بندی کریں تو دو اقسام میں تقسیم کر سکتے ہیں۔ اول جدید اقدار اور دوم روایتی اقدار۔ ماہرینِ سماجیات نے ان گروہ بندیوں سے ہٹ کر بھی اقدار کی اقسام بیان کی ہیں جن میں ذاتی، سیاسی، مذہبی، تعلیمی، معاشی،

خاندانی اور اس جیسی دیگر اقدار شامل ہیں۔ متذکرہ بالا تفصیلات کا جائزہ لینے کے بعد اقدار کو نوعیت کے اعتبار سے سمجھنے کے لیے ان کو کچھ اقسام میں تقسیم کیا جارہا ہے۔

ا۔ ذاتی اقدار (Individual values/Personal values)

ذاتی اقدار کا تعلق فردِ واحد کی ذات سے ہے۔ وہ اصول اور نظریات جن کی پیروی ایک شخص اپنی ذاتی زندگی میں کرتا ہے۔ جو اس شخص کی ذاتی دل چسپی اور جذبات کا اظہار ہوتی ہیں ذاتی اقدار کہلاتی ہیں۔ ہر فرد ذاتی اقدار رکھتا ہے، جنہیں مثبت یا منفی سمجھا جاسکتا ہے۔ عام طور پر معاشرے میں ناپسند کیے جانے والے رویے کو منفی قدر کے طور پر لیا جاتا ہے۔ جب کہ مثبت اقدار عوام کی فلاح و بہبود کے لیے اہم ہوتی ہیں۔ ہر دور میں چند ایسی شخصیات رہی ہیں جن کی فلاحی خدمات اور عظیم کارناموں کی بدولت معاشروں نے ترقی کی۔ صفائی ستھرائی کا خیال رکھنا، وقت کی پابندی کرنا، علم کی تلاش، دوسروں کی مدد کرنا، طاقت کے حصول کو اہمیت دینا، سادہ زندگی گزارنا یا پھر نمود و نمائش کرنا وغیرہ۔ کسی بھی شخص کی ذاتی اقدار میں شامل ہیں۔ یعنی ایسی اقدار جو مکمل طور پر کسی کی ذاتی منشا کے مطابق ہوں، جن سے وہ ذہنی یا جذباتی طور پر مرغوب ہو اور بغیر کسی روک ٹوک کے ان کو اہمیت دے، ذاتی اقدار کہلاتی ہیں۔

۲۔ آفاقی / عالمی اقدار (Group/Global/Universal Values)

اس میں وہ تمام اصول و ضوابط شامل ہیں جن کی پیروی عالمی سطح پر کی جاتی ہے۔ ان اقدار کا تعلق پوری دنیا میں رہنے والے لوگوں سے ہوتا ہے اور توقع کی جاتی ہے کہ عالمگیر سطح پر انھیں اپنایا جائے گا۔ مثال کے طور پر سماجی نظم و ضبط، پر امن معاشرہ، انسانیت کا احترام، ترقی وغیرہ یہ اقدار ہر معاشرے کی مشترکہ ہوتی ہیں۔ روایتی اقدار کے ضمن میں معاشرے ایک دوسرے سے مختلف ہوتے ہیں۔ گلوبلائزیشن جدید معاشروں میں جدتیں لاتی ہے۔ یوں متنوع اقدار کے حامل معاشروں میں بھی مشترکہ اقدار واضح ہو کر سامنے آتی ہیں۔ ایسے میں عالمی سطح پر دوسرے معاشروں کے ساتھ قابلِ قبول اقدار کو بانٹا اور پھیلایا جاتا ہے۔

۳۔ انسانی اقدار (Human Values)

انسانی اقدار وہ خصوصیات، اصول و نظریات ہیں جو انسانی فطرت کے لیے بنیادی اور اہم ہیں۔ اس میں وہ اقدار شامل ہیں جو انسانی زندگی کو خوش گوار رکھنے میں اہم کردار ادا کرتی ہیں اور انسان کی رہنمائی کرتی ہیں کہ اسے دوسرے انسانوں اور حیوانوں کے ساتھ کیسے پیش آنا ہے۔ انسان میں ان کی موجودگی انسان کو

انسان بناتی ہیں۔ ان اقدار میں ہمدردی اور دوسروں کے ساتھ محبت کا جذبہ شامل ہے۔ عمرانہ خاتون اردو ادب اور انسانی اقدار کی بازیافت کے ابتدائیے میں انسانی اقدار کے حوالے سے تحریر کرتی ہیں کہ:

"انسانی اقدار کی پاسداری ہماری زندگی کو اخلاقی اعتبار سے رفعت، عروج، وقار اور عظمت عطا کرتی ہے اور ان اقدار کا فقدان نفرت، حقارت، دہشت، تشدد، انتشار، خود غرضی اور حرص و طمع کو جنم دیتا ہے۔"(۱۶)

۴۔ مذہبی اقدار (Religious Values)

ہر مذہب کچھ مخصوص اقدار کا ترجمان ہوتا ہے جس کے پس منظر میں مذہبی تعلیمات کا ایک سلسلہ موجود ہوتا ہے۔ مذہبی اقدار میں وہ تمام اقدار شامل ہیں جو عالمی مذاہب سے تعلق رکھنے والے افراد کے لیے ضروری سمجھی جاتی ہیں کہ وہ ان اقدار و روایات کو اپنائیں گے۔ ان کا تعلق دین، مقدس متون اور الہامی کتب سے ہوتا ہے۔ یہ انسان کے طرز عمل کو اس کے مذہب کے مطابق عمل پیرا ہونے کی تلقین کرتی ہیں۔ کسی بھی معاشرے کی مذہبی اقدار اس معاشرے کی تشکیل و ترقی میں اہم کردار ادا کرتی ہیں۔

۵۔ اخلاقی اقدار (Moral/Ethical Values)

اخلاقی اقدار کا تعلق اخلاقیات سے ہے۔ ایسی اقدار جو اخلاقی طور پر صحیح راستہ فراہم کرتی ہیں اور اس قابل بناتی ہیں کہ ہم کسی بھی معاشرے کے بہترین فرد کہلا سکیں۔ اخلاقی اقدار اخلاقیات کے مروجہ پیمانوں کی مدد سے خیر اور شر میں فرق کرتی ہیں۔ انسان میں فطرتاً یہ صلاحیت موجود ہوتی ہے کہ وہ برائی کے مقابلے اچھائی کے امتیاز کو جانتا ہے۔ ان اقدار میں ہمارا دوسروں کے ساتھ حسن سلوک، صبر، ہمدردی، مہربانی، برداشت وغیرہ ایسی اقدار ہیں جو انسان کو کسی بھی دوسرے انسان سے افضل بناتی ہیں۔ اخلاقیات مجموعی معاشرتی ترقی اور خوش حالی کو فروغ دیتی ہیں۔ مہذب معاشرے کی تعمیر کے لیے اعلیٰ اخلاقی اقدار کے ساتھ ساتھ معاشرے کے مقرر کردہ اصولوں کے پیش نظر زندگی بسر کی جاتی ہے۔

۶۔ قومی اقدار (National Values)

قومی اقدار میں کسی بھی قوم کی بنیادی خصوصیات شامل ہیں۔ اس میں وہ اصول شامل ہیں جو انسان کو فطری طور پر حب الوطنی، قومی اتحاد اور قومی بیداری کی طرف راغب کرتے ہیں۔ قومی اقدار بنیادی طور پر دنیا میں ایک قوم کی حیثیت سے موجودگی کا احساس دلاتی ہیں۔ یہ قوم کے رویوں طرز عمل اور افعال میں رہنمائی کرتی ہیں۔

۷۔ سیاسی اقدار (Political Values)

سیاسی اقدار کسی بھی سماج کی ضرورت ہیں۔ سیاسی اقدار کا مقصد فرد کو مفید اور ذمہ دار شہری بنانا ہے تاکہ وہ اپنے حقوق اور فرائض سے آگاہ ہو سکیں۔ سیاسی اقدار فرد کو پرچم کا احترام، جمہوری نظام اور مساوات جیسے اصولوں سے روشناس کراتی ہیں۔ یہ ہمارے قومی اتحاد اور وجود کے لیے بے حد ضروری ہیں۔ کسی بھی معاشرے کی اقدار آئینی نظام کے خلاف وجود نہیں رکھتیں۔ معاشرتی اقدار قومی اور سیاسی اقدار سے ہی متعین ہوتی ہیں۔ معاشرے کے نظام میں سیاسی اقدار متحرک کردار ادا کرنے کے ساتھ ساتھ دنیا کے سامنے بھی باوقار بناتی ہیں۔ سیاسی اقدار معاشی حالات، درآمدات، برآمدات، دوسرے ملکوں کے ساتھ تعلقات، پیداوار کے ذرائع، ملک کے اندرونی اور بیرونی حالات کی نمائندگی کرتی ہیں۔

۸۔ خاندانی اقدار (Family Values)

خاندانی اقدار میں وہ اصول یا نظریات شامل ہیں جن کو خاندان، کنبے یا اس طرح کے مشترکہ نظام میں اپنایا جاتا ہے۔ بعض اوقات یہ روایتی یا ثقافتی اقدار کہلاتی ہیں۔ جو مختلف ذرائع سے حاصل کی جاتی ہیں۔ سیکھنے کا پہلا مقام جہاں بچہ پہلی مرتبہ کچھ سیکھ لیتا ہے وہ اس کا گھر یعنی خاندان ہے۔ کچھ خاندانوں کے لیے " صحیح یا غلط کیا ہے؟" یہ سیکھانے کے لیے مذہب سے حاصل شدہ تعلیمات سے استفادہ کیا جاتا ہے۔ خاندان بھی مختلف قسم کے ہوتے ہیں اور ان کے نزدیک مختلف چیزوں کی اہمیت مختلف طرح سے ہوتی ہے۔ مثال کے طور پر شاہی خاندان ملازموں سے کام کروانا شان سمجھتے ہیں، جب کہ کچھ خاندان اپنا کام خود کرنے کو اہمیت دیتے ہیں۔ بعض خاندان عورتوں کا تعلیم یافتہ ہونا پسند نہیں کرتے اور کچھ باشعور خاندان عورت کی تعلیم میں روشن مستقبل دیکھتے ہیں۔ کسی بھی فرد کی شخصیت اس کے خاندان کی نمائندہ ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کے کسی کو جاننے اور سمجھنے کے لیے اس کا خاندانی پس منظر دیکھا جاتا ہے۔

۹۔ ثقافتی اقدار (Cultural Values)

کسی بھی معاشرے میں اقدار اہم کردار ادا کرتی ہیں۔ معاشرے اپنی اقدار کے ساتھ اپنا وجود رکھتے ہیں اور انہی اقدار کی وجہ سے معاشروں کی اہمیت بڑھتی یا کم ہوتی ہے۔ اقدار کا اہم پہلو یہ ہے کہ یہ ثقافت کی نمائندگی کرتی ہیں۔ ثقافت اقدار کی بنیاد تشکیل کرنے میں اہم کردار ادا کرتی ہے۔ ثقافت کو اقدار سے الگ کیا جائے تو اس کے ارکان اپنی وحدت اور قدر کھو دیں گے۔

"Cultural Values are these collective conceptions of what is considered good, desirable, and proper --or bad, undesirable, and improper--in a culture. ... Values may be specific such as honoring one's Parents and owning a home, or they may be more general, such as health, love, and democracy, of course, the members of a society do not uniformly share its values... The values of a culture may change, but most remain relatively stable during anyone person's lifetime."(۱۷)

(ثقافتی اقدار وہ اجتماعی تصورات ہیں جن کو اچھا، مطلوبہ اور مناسب سمجھا جاتا ہے۔۔۔ یا ثقافت میں برا، ناپسندیدہ اور نامناسب۔۔۔ اقدار مخصوص بھی ہو سکتی ہیں؛ جیسا کہ کسی کے والدین کی عزت کرنا اور کسی گھر کی ذمے داری لینا۔ یا یہ قدرے عام ہو سکتی ہیں: جیسا کہ صحت، محبت اور جمہوریت۔ بلاشبہ کسی معاشرے کے ارکان یکساں انداز میں اس کی اقدار نہیں بانٹتے۔ کسی ثقافت کی اقدار میں تبدیلی ممکن ہے، لیکن عام طور پر یہ کسی ایک فرد کی زندگی میں زیادہ تر مستحکم رہتی ہیں۔)

ثقافتی اقدار مخصوص ثقافتوں کی علم بردار ہوتی ہیں جو مخصوص نسلوں کی علم بردار ہوتی ہیں اور ثقافت کے مخصوص پہلوؤں کو تشکیل دیتی ہیں۔ اس میں زبان، رسم و رواج، رسومات، آرٹ اور مذہبی عقائد شامل ہوتے ہیں۔ یہی ثقافتی اقدار معاشرے کو معاشرتی قدروں کے لیے بنیاد فراہم کرتی ہیں۔

۱۰۔ معاشرتی اقدار (Social Values)

معاشرتی اقدار وہ اصول اور عقائد ہیں جو وسیع پیمانے پر معاشرے کے افراد کے طرز عمل اور فیصلوں کی رہنمائی کرتے ہیں۔ یہ اقدار انفرادی اور اجتماعی رویے کی تشکیل، معاشرتی اصولوں کو متاثر کرنے اور اخلاقی تحفظات کی رہنمائی کے لیے ایک بنیاد کے طور پر کام کرتی ہیں۔ معاشرتی اقدار معاشرے کی اکثریت کے وضع کردہ معیارات ہیں جو اس معاشرے کی اکثریت اپنی شناخت کا لازمی حصہ گردانتی ہے۔ یہ معاشرتی معیارات اور بنیادی عقائد انسان کی زندگی میں توازن اور معنی شامل کرتے ہوئے افراد کو ایک ساتھ رہنے کے قابل بناتے ہیں۔ زندگی میں کس چیز کو کتنی اہمیت دینی ہے یا کس معیار کو قائم رکھنا ہے اور وقت کے ساتھ ساتھ آگے کیسے بڑھنا ہے؟ یہ تمام ایک تغیر پذیر متحرک عمل ہے۔ اگرچہ کچھ بنیادی اقدار وقت کے ساتھ ساتھ برقرار رہتی ہیں لیکن سماجی رویوں، ثقافتی تبدیلیوں اور بیرونی عوامل انہیں متاثر کرتے ہیں۔ کسی بھی

معاشرے کا حصہ ہوتے ہوئے اقدار سے آگاہی فطری امر نہیں ہے بلکہ انھیں مشاہدے اور دوسروں سے میل ملاپ کے ذریعے سیکھا جاتا ہے اور اسی طرح یہ ایک سے دوسرے تک منتقل ہوتی ہیں۔ معاشرے میں مستقل تبدیلیاں رونما ہوتی رہتی ہیں۔ اس تبدیلی سے معاشرے پر مثبت اور منفی دونوں طرح کے اثرات مرتب ہوسکتے ہیں۔ مثبت اثرات کو عام کرنے اور مزید بہتری کے ساتھ جاری رکھنے کی ضرورت ہوتی ہے جب کہ منفی اثرات کو مثبت میں تبدیل کرنے کی ضرورت ہوتی ہے۔ ارچنا سنگھ "Archana Singh" معاشرتی اقدار کی وضاحت کرتے ہوئے لکھتی ہیں:

> "Social values, refers to socially collective beliefs and systems of beliefs that operate as guiding principles in life. These social values are means by which natural groups define social order- what is acceptable and what is not acceptable. These values have two significant features: first, social values that carry a normative component; second, social mechanism. Social values are legitimated by the fact that they are shared prescriptions. These are the outcome of implicit or explicit decisions by groups in society."(۱۸)

(معاشرتی اقدار سے مراد معاشرتی طور پر اپنائے جانے والے اجتماعی عقائد ہیں اور یہ عقائد کا وہ نظام ہے جو فرد کو زندگی گزارنے کے رہنما اصولوں سے آگاہ کرتے ہیں۔ معاشرتی اقدار کو معاشرتی نظام کی وضاحت کرنے والے گروہ سراہتے ہیں کہ یہاں کیا قابل قبول ہے اور کیا قابل قبول نہیں ہے۔ ان اقدار کی دو نمایاں خصوصیات ہیں: پہلی وہ معاشرتی اقدار جو معیاری اجزا رکھتی ہیں اور دوسری خصوصیت اس کے تکنیکی پہلو ہیں۔ معاشرتی اقدار کے جائز ہونے کی وجہ یہ ہے کہ یہ پہلے سے معاشرتی گروہوں کی جانب سے طے شدہ مشترکہ فیصلوں کا نتیجہ ہوتی ہیں۔) بلاشبہ معاشرتی اقدار میں اشتراک اس معاشرے کے افراد میں اتحاد و یگانگت کی ضمانت بن جاتا ہے۔ عبدالرحمٰن بن خلدون نے اس نقطہ نظر پہ زور دیتے ہوئے تحریر کیا ہے:

> "معاشرتی اقدار خود معاشرے کے مرتب کردہ امور و اعیان ہوتے ہیں۔ یہ اقدار جماعت کے مشترکہ عمل سے وجود میں آتے ہیں۔"(۱۹)

گو کہ ہر شخص کے رہنے سہنے کے ذاتی معیارات ہوتے ہیں۔ ان ذاتی معیارات میں دوسروں کا خیال رکھنا، اپنی جسمانی تندرستی کا خیال رکھنا، کاروبار کو پروان چڑھانے کے لیے اقدامات کرنا وغیرہ شامل ہیں۔ اس کے علاوہ معاشرے کا ہر فرد معاشرے کا رکن ہونے کی حیثیت سے چند مشترکہ اصولوں پر عمل پیرا ہوتا ہے معاشرتی اقدار معاشرے میں نظم و استحکام پیدا کرتی ہیں۔ اس میں بنیادی اقدار جس میں خیر و شر سے متعلق اخلاقی اور انسانی اقدار کی اہمیت مسلم ہے۔ مستحکم معاشرے وہ ہیں جن کی معاشرتی اقدار معاشروں کو منظم طریقے سے چلانے کے لیے سازگار ہوں۔ معاشرے کے مختلف افعال کو درست طریقے سے چلانے میں معاشرتی ادارے اہم کردار ادا کرتے ہیں۔ اسی طرح معاشرتی زندگی میں اقدار ضروری ہیں کیوں کہ اقدار معاشرے کو تشکیل کرنے میں بنیاد فراہم کرتی ہیں اس سے گروہی سالمیت میں اضافہ ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جہاں مشترکہ اقدار اخلاقی مد میں کام نہیں کرتیں وہاں معاشرتی مسائل بڑھ جاتے ہیں۔ معاشرتی اقدار کے زوال سے معاشرتی مسائل وجود میں آتے ہیں۔ جب کوئی ہدف معاشرتی اقدار سے مطابقت نہیں رکھتا تو حقیقی اور مثالی معاشرے میں فرق آجاتا ہے جو معاشرتی مسائل کی وجہ بنتا ہے۔ بالآخر معاشرتی مسائل معاشرتی اقدار اور اصولوں کے مابین نامناسب رویوں سے پیدا ہوتے ہیں۔

یہ ضروری ہے کہ معاشرتی زندگی ان اصولوں کے مطابق تشکیل دی جائے جو معاشرے سے منظور شدہ ہوں اور ان کو معاشرے کی خوشنودی کے لیے معاشرے کے افراد تک منتقل کیا جائے۔ اس سے انسان کی زندگی میں فلاحی تبدیلی آسکتی ہے۔ جس سے معاشرے میں نفسا نفسی کی کیفیت ختم ہو سکتی ہے اور عدل و انصاف کے ساتھ ظلم و ستم اپنے آپ ختم ہو جاتا ہے۔ پر امن دنیا اور معاشرے کے لیے ضروری ہے کہ ثقافتیں مشترکہ اقدار کو فروغ دیں جو معاشروں کی ترقی اور خوش حالی کا سبب بنیں۔ اخلاقی، ثقافتی اور مذہبی اقدار معاشرے کی ترقی اور نشو نما میں اہم کردار ادا کرتی ہیں۔ یہ بات ذہن میں رکھنی چاہیے کہ پاکستان میں مختلف ثقافتیں پائی جاتی ہیں اور یہ ایک بھرپور ثقافتی ورثہ رکھتا ہے۔ اس کے مختلف خطوں میں ثقافتی ورثے کے اعتبار سے اقدار مختلف ہو سکتی ہیں جس میں ان کے لباس، رسوم اور طرز بود باش میں فرق پایا جاسکتا ہے لیکن ان میں کچھ مشترکہ اقدار ایسی پائی جاتی ہیں جنہیں بڑے پیمانے پر قبول عام حاصل ہے یہی مشترکہ اقدار پاکستانی معاشرے کی معاشرتی اقدار کہلاتی ہیں۔ معاشرتی اقدار میں ثقافتی، مذہبی، خاندانی، تعلیمی، معاشی اور اخلاقی اقدار شامل ہیں۔ پاکستانی کی معاشرتی قدروں میں اسلامی شعائر کا احترام، حب الوطنی اور اخلاقی اقدار معاشرے کی اولین اقدار میں شامل ہیں۔ اس کے علاوہ بڑوں کا احترام، اعلیٰ تعلیم کا حصول، مشترکہ خاندانی

نظام، جمہوری نظام وغیرہ پاکستانی معاشرے کی اقدار کی عکاسی کرتی ہیں۔ وقت کے ساتھ ساتھ جیسے معاشرے ترقی کرتے ہیں ان کی اقدار میں بھی تبدیلی رونما ہونے لگتی ہے۔ ڈاکٹر قاسم یعقوب کے مطابق:

> "قحط، جنگ، معاشی تنزلی یا نو آبادیاتی ادوار میں سماجی اقدار بے ترتیب ہونے لگتی ہیں۔ سماج کی مشترکہ اقدار جس نظامِ حیات کو مکمل اور بہتر تصور کر رہی ہوتی ہیں، ان کے مطابق زندگی گزارنا مشکل ہو جاتا ہے۔ یوں فرد سماجی اقدار سے انحراف کرنے لگتا ہے۔ نئی قدروں کو جنم دیتا ہے یا منحرف اقدار میں زیادہ سہولت محسوس کرتا ہے۔ مگر پاکستانی سماج میں یہ انحراف (جو فرد سماجی اقدار سے کرتا ہے) کسی ہنگامی حالت کا مرہون نہیں، بلکہ منافقت، دورخی یا گھٹیا پن کا شاخسانہ ہے۔ فرد سماجی اقدار کو کسی اور شکل میں دیکھتا ہے، جب کہ عملی سطح پر اسے کسی اور طور پر نافذ کرنے کے حق میں ہے۔"(۲۰)

پاکستانی معاشرے میں پائی جانے والی معاشرتی اقدار اور ان اقدار کی تغیر پذیری کا مطالعہ اگلے ابواب میں پیش کیا گیا ہے۔

ii۔ معاشرتی تغیر اور اسباب

بلاشبہ معاشرتی تغیر ہی معاشرے سے جڑے عوامل میں تغیر کا سبب بنتا ہے اگر معاشرتی اقدار میں وقوع پذیر ہونے والی تبدیلیوں کا جائزہ لیں تو علم ہوتا ہے کہ ان قدروں میں تبدیلی کا محرک دراصل معاشرتی تغیر ہے کیوں کہ معاشرے میں تبدیلی کے اثرات ہر شعبۂ زندگی پر مرتب ہوتے ہیں؛ کسی ایک سطح پر تبدیلی پورے معاشرے کو متاثر کرتی ہے۔ لہٰذا یہاں معاشرتی تغیر اور اس کے اسباب کا جائزہ لینا ضروری ہے۔

معاشرہ جس کے لیے انگریزی متبادل "سوسائٹی" (Society) مستعمل ہے؛ اردو زبان کے لفظ سماج اور معاشرے کے ہم پلہ ہے۔ جب کہ اردو زبان میں یہ دونوں لفظ سنسکرت اور عربی زبان سے لیے گئے ہیں۔ سنسکرت زبان کا لفظ "سماج" اور عربی زبان کا لفظ "معاشرہ" اصطلاح میں ایک دوسرے کے مترادف ہیں۔ معاشرے کی تعریف جو معاشرے اور سماج پر مشتمل موضوعات پر عام دیکھنے کو ملتی ہے وہ یہی کی جاتی ہے کہ لوگوں کے ایک جگہ مل جل کر رہنے سے معاشرہ وجود میں آتا ہے۔ یعنی فرد معاشرے کا اہم رکن ہے اور افراد کے ملنے سے معاشرہ قائم ہوتا ہے۔ انسان معاشرتی حیوان ہے اور یہ مختلف سرگرمیوں کو گروہ کی صورت میں سرانجام دیتا ہے۔ کائنات کے رموز سمجھنے کے لیے ہر شعبے نے اہم کردار ادا کیا۔ فلسفیوں نے بھی

اس جہان پر غور و فکر کرتے ہوئے حقائق پیش کیے۔ اسی طرح مختلف ماہرین سماجیات نے معاشرے کی مختلف تعریفیں پیش کیں ہیں۔ یہاں مقصد یہ نہیں ہے کہ ہم جاننے کی کوشش کریں کہ معاشرہ کیا ہوتا ہے یا ماہرینِ سماجیات نے معاشرے کی کیا تعریفیں پیش کی ہیں۔ بلکہ یہاں دلائل سے یہ بات کرنا مقصود ہے کہ معاشرے میں تغیر کیسے آتا ہے؟ معاشرے تبدیل کیسے ہوتے ہیں اور ان میں تبدیلی کے اسباب اور اثرات کیا ہوتے ہیں؟ اس تغیر پذیری کو سمجھنے کے لیے ضروری ہے کہ مختصراً اصطلاح "معاشرے" پر روشنی ڈالی جائے۔ یہ اصطلاح اٹھارویں صدی میں یورپی جدیدیت کے عروج کے وقت استعمال میں آئی۔ دی کیمبرج ڈکشنری آف سوشیالوجی (The Cambridge Dictionary of Sociology) میں "سوسائٹی" اصطلاح کی وضاحت اس طرح سے کی گئی ہے۔

> "The term "Society" is used to describe a level of organization of groups that is relatively self-contained. However, the boundedness of groups is always relative and so sociologists may refer to human society, where the reference is to the interdependencies among all social groups such as family society, where the reference is to the typical interactions among the individuals making up a grouping of close kin. Equally, the term society may be used to indicate the wider activities of those under the authority of a particular state, for example, French society or Indian society."[۲۱]

(گروپوں کی تنظیم کی ایک سطح، جو نسبتاً خود مختار اور آزاد ہوتی ہے، کو بیان کرنے کے لیے "معاشرہ" کی اصطلاح کا استعمال کیا جاتا ہے۔ تاہم، گروہوں کی حد بندی ہمیشہ مخصوص تعلق کی بنا پر ہوتی ہے اور اس لیے ماہرین سماجیات انسانی معاشرے کا حوالہ دے سکتے ہیں، جہاں افراد کے درمیان روایتی روابط قریبی رشتہ داروں کا گروہ تشکیل دینے میں ایک خاص تعلق کی صورت بنتے ہیں۔ یکساں طور پر، معاشرہ کی اصطلاح کسی خاص ریاست کے زیرِ اختیار افراد کی وسیع تر سرگرمیوں کی نشاندہی کرنے کے لیے استعمال کی جاسکتی ہے، مثال کے طور پر: فرانسیسی معاشرہ یا ہندوستانی معاشرہ۔)

کیمبرج ڈکشنری آف سوشیالوجی کی یہ تعریف اس بات کی وضاحت کرتی ہے کہ معاشرہ ایک خود مختار اکائی کی صورت اپنا تشخص بناتا ہے۔ اہم بات یہ ہے کہ یہ گروہ اسی وقت معاشرہ کی شکل پاتے ہیں جب افرادِ گروہ کے درمیان کچھ مشترک خوبیاں اور اقدار ہوں۔ یہ اشتراک ہی معاشرے کی اکائی کی بنیاد بنتا ہے۔ اس تعریف میں اس بات کی مزید وضاحت کی گئی ہے کہ معاشرہ کی اصطلاح ایک ریاست میں موجود افراد، جو اس ریاستی حکومت کے زیر اثر ہوتے ہیں، اُن کی مشترک سرگرمیوں کی نشاندہی اور وضاحت کے لیے بھی استعمال کی جاتی ہے۔ یعنی ایک حکومت جو ایک مخصوص جغرافیائی حدود کے اندر قائم ہے، اس کے زیر اثر رہنے والے افراد جو وسیع تر ملکی مفاد میں مشترک سرگرمیاں سرانجام دیتے ہیں، ایک ہی معاشرے کا حصہ بنتے ہیں۔ جس طرح فرانس کی سرحدوں میں رہنے والے افراد فرانسیسی معاشرہ کی تشکیل کرتے ہیں اور ہندوستان کی سرحدوں میں بسنے والی افراد ہندوستانی معاشرہ کی تشکیل کرتے ہیں۔

"کشاف تنقیدی اصطلاحات" میں معاشرے کی جو تعریف بیان کی گئی ہے اس سے اس اصطلاح کا مفہوم واضح ہو جاتا ہے۔

> "معاشرہ (Society) سماجی تعلقات کا وہ نظام جس میں اور جس کے ذریعے ہم زندگی گزارتے ہیں معاشرہ یا سماج کہلاتا ہے۔ سماجی تعلقات کا یہ نظام بالفاظ دیگر ہمارا سماجی ماحول ہمارے اوہام عقائد، افکار و تصورات، ہمارے فلسفہ حیات اور ہمارے کردار کی تشکیل و تعمیر میں بہت حد تک دخیل ہوتا ہے۔ معاشرہ کا لفظ ادبی تحریروں میں سماجی تعلقات کے نظام کے علاوہ کبھی پوری انسانی برادری کے لیے، کبھی ایک قوم کے لیے اور کبھی چند خاندانوں پر مشتمل ایک گروہ کے لیے بھی استعمال ہوتا ہے۔"(۲۲)

کسی معاشرے میں افراد کے طرز زندگی، رسم و رواج، اخلاق و عادات، عقائد و تصورات، معمولات، اقدار و روایات کا عمل دخل ہوتا ہے اور اس کا دائرہ برادری اور خاندانوں کی گروہی صورت سے شروع ہو کر ملکی سطح تک پہنچ جاتا ہے۔ ان کی تخصیص کرنا پیچیدہ عمل ہے۔ اگر پاکستانی معاشرے کو لیا جائے تو اس میں پاکستانی عوام کی مشترکہ خصوصیات شامل ہوں گی اسی طرح اس کی مزید تقسیم شہری اور دیہی معاشرے کی صورت کی جاسکتی ہے۔ اس کی مزید درجہ بندی مختلف مذہبی گروہوں اور برادریوں کی صورت بھی کی جاسکتی ہے۔ یہی چیز بڑی سطح پر مختلف ملکوں کے حوالے سے بھی ہو سکتی ہے۔ مثلاً اسلامی ممالک کو اسلامی معاشرے تصور کرنا ایک معاشرتی درجہ بندی ہے۔ اسی طرح سے پاکستان اور ہندوستان اور دیگر ممالک مل کر مشرقی

معاشرہ تشکیل دیتے ہیں۔ جب کہ یورپ اور امریکہ کو مشترکہ اقدار کی بنیاد پر مغربی معاشرہ کہا جاتا ہے۔ جب تک دنیا فنا نہیں ہو جاتی؛ معاشرے کی ابدیت پر یقین برقرار رکھا جا سکتا ہے۔ لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ معاشرے لا محالہ دوسرے تمام مظاہر کی طرح تبدیل ہوتے رہتے ہیں۔ تبدیلی کی اس حقیقت نے طویل عرصے تک ذہنوں کو متاثر کیا اور اب تک سماجی سائنس کے میدان میں ان مسائل کا حل تلاش کیا جاتا ہے۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کسی بھی معاشرے کی حدود اور اقدار وروایات اگر پہلے سے طے شدہ ہیں تو ان میں تغیر کیسے آ سکتا ہے؟ معاشرتی تغیر سے کیا مراد ہے؟ اس تبدیلی کی سمت کیا ہے؟ معاشرتی تبدیلی کی صورتیں کون کون سی ہیں؟ ان کا ذریعہ اور وجہ کیا ہے؟ کیا اس کے پیچھے کارفرما کوئی کلیدی عنصر ہے یا پھر بہت سے مختلف عوامل اور عناصر ایک ساتھ کام کر رہے ہوتے ہیں؟ یہ پیچیدہ سوال ہیں- اور ان میں پیچیدگی کی وجہ یہ نہیں کہ یہ سوال مشکل ہیں بلکہ ان سوالوں کی انسانی زندگی میں اہمیت اس کی وجوہات میں سے ہے۔ جیسا کہ انسان کو معاشرتی حیوان کہا گیا ہے؛ یوں معاشرے کی تبدیلی افراد کی تبدیلی سے منسوب ہے۔ "کنگزلے ڈیوس"(Kingsley Davis) کے خیال کے مطابق معاشرے کو تبدیل کرنے کا مطلب انسان کو تبدیل کرنا ہے۔ اس حوالے سے کنگزلے ڈیوس(Kingsley Davis) کی کتاب Human Society اہمیت کی حامل ہے۔ جس میں "انسانی معاشرے" پر تفصیلی گفتگو کی گئی ہے۔ اس کتاب میں شامل ان کا آخری مضمون معاشرتی تغیر کے حوالے سے بے حد اہم ہے۔ ان کے مطابق:

> "Since men are social creatures, social change means human change. To change society is to change man...By social change is meant only such alterations as occur in social organization – that is, the structure and functions of society. Social Change thus forms only a part of what is essentially a border category called "cultural change". The latter embrace's all changes occurring in any branch of culture, including art, science, technology, philosophy, etc. As well as changes in the forms and rules of social organization."(۲۳)

(چونکہ انسان معاشرتی مخلوق ہیں، اس لیے معاشرتی تبدیلی کا مطلب انسانی تبدیلی ہے۔ معاشرے کو بدلنا انسان کو بدلنا ہے۔۔۔ معاشرتی تبدیلی سے مراد صرف ایسی تبدیلیاں ہیں جو معاشرتی تنظیم میں ہوتی ہیں۔ یعنی معاشرے کی

ساخت اور افعال میں۔ اس طرح معاشرتی تبدیلی کا بنیادی حصہ وہ ہے جسے "ثقافتی تبدیلی" کہا جاتا ہے۔ مؤخر الذکر (معاشرہ) ثقافت کی کسی بھی شاخ میں رونما ہونے والی تمام تبدیلیوں کو قبول کرتا ہے، بشمول آرٹ، سائنس، ٹیکنالوجی، فلسفہ وغیرہ۔ نیز معاشرتی تنظیم کی نوعیت اور قواعد میں تبدیلیاں بھی قابل قبول ہوتی ہیں۔)

کنگزلے ڈیوس کی رائے اس بات کی مکمل وضاحت کر دیتی ہے کہ انسان اور سماج ایک دوسرے کا ہی عکس ہیں۔ سماجی تبدیلیوں سے مراد وہاں بسنے والے افراد کے افعال میں تبدیلیاں ہیں، یعنی جب کسی معاشرے کے افراد مجموعی طور پر کچھ تبدیلیوں کو قبول کر لیتے ہیں تو وہ تبدیلیاں سماج کا حصہ بن جاتی ہیں اور یوں ایک معاشرہ ایک نئی شکل و صورت اختیار کرتا ہے۔ یہ تبدیلیاں معاشرے کی ساخت میں بھی ہوتی ہیں اور معاشرے کے مجموعی طرز عمل میں بھی ہوتی ہیں۔ یہ تبدیلیاں کئی صورتوں میں ظاہر ہو سکتی ہیں۔ کبھی اس کا اظہار آرٹ کے مختلف بیانیوں کی صورت میں ہو سکتا ہے اور کبھی اس کا اظہار سائنس اور ٹیکنالوجی کے میدان میں ترقی کی شکل میں معاشرے کا منظر نامہ بدلنے کی کی صورت میں ہو سکتا ہے۔ تھیوڈور کیپلو کے مطابق:

> "Social change is the process whereby measurable differences appear in a social system over a given interval of time. The differences may appear in the scale, the form, or the content of such a system or its relationship with other systems."(۴۴)

(سماجی تبدیلی ایک ایسا عمل ہے جس کے ذریعے ایک سماجی نظام میں ایک مقررہ وقفہ کے بعد قابل پیمائش فرق ظاہر ہوتا ہے۔ فرق اس طرح کے کسی نظام کے پیمانے، شکل، یا مواد یا دوسرے نظاموں کے ساتھ اس کے تعلق میں ظاہر ہو سکتا ہے۔)

تھیوڈور کیپلو نے سماجی تبدیلی کو قابل پیمائش قرار دیتے ہوئے اس بات کی وضاحت کی ہے کہ یہ تبدیلی ایک مخصوص وقفہ کے بعد ہی پرکھی اور جانچی جا سکتی ہے۔ ایک مخصوص دورانیے کے بعد معاشرے میں رونما ہونے والی تبدیلیوں کو پرکھا جا سکتا ہے، کیونکہ دیرپا تبدیلی وہی ہو گی جو معاشرے میں کسی خاص وقت کے لیے راسخ ہو چکی ہو اور افراد معاشرہ نے اس تبدیلی کو ایک قدر کے طور پر قبول کر لیا ہو۔

معاشرے مختلف وجوہات کی بنا پر تبدیل ہوتے ہیں، جن کے پس پردہ لاتعداد عوامل کار فرما ہوتے ہیں، اس کی کئی وجوہات ہو سکتی ہیں ان وجوہات میں کچھ ظاہری حالات ہوتے ہیں، جن میں قدرتی آفات ہیں۔ مثال کے طور پر سیلاب کی صورت میں معمولات زندگی اس طرح سے متاثر ہوتے ہیں کہ فصلیں تباہ ہونے کی وجہ سے پیداوار میں کمی آتی ہے۔ اسی طرح جب لوگ نقل مکانی کرتے ہیں جیسے دیہاتوں سے شہروں

کی طرف یوں بھی ان کے رہنے سہنے کے طریقے میں فرق آجاتا ہے۔ اسی طرح معاشرے تبدیل ہونے کی ایک وجہ تعلیم ہے۔ اعلیٰ تعلیم یافتہ خاندان اور ان پڑھ افراد کے سماجی شعور اور طرزِ معاشرت میں خاصہ فرق ہوتا ہے۔ تعلیم انسان کی سوچ میں وسعت اور گہرائی پیدا کرتی ہے جس سے انسان کا شعور بیدار ہوتا ہے۔ اسی کے باعث وہ معاشرے کا بہترین رکن ہونے کا کردار ادا کرنے کے قابل ہو جاتا ہے۔ اسی طرح اس کی ایک وجہ مختلف معاشروں کا ملاپ ہے، جس کی وجہ سے یہ ایک دوسرے کے اثرات قبول کرتا ہے۔ یوں افراد ایک جدید طریقہ زندگی سے روشناس ہوتے ہیں۔ ٹیکنالوجی کی ترقی ثقافتی سطح پر بھی معاشرے کو متاثر کرتی ہے۔ جن میں دو مختلف ثقافتوں کے میل ملاپ سے ان کے رسم ورواج اور رہن سہن کے انداز میں تبدیلی پیدا ہوتی ہے۔ مثال کے طور پر پاکستانی ثقافت پر ہندو ثقافت کے اثرات کی وجوہات میں ہندو مسلم اتحاد اور کئی سالوں تک ایک دوسرے کے ساتھ رہنا شامل ہے۔ اسی طرح نظریات میں تبدیلی رونما ہوئی۔ یہی تبدیلی مزید براں ٹیلی ویژن اور فلم کے ذریعے سے بھی رونما ہوئی یوں دوسری ثقافتوں سے تعلق رکھنے والے ڈراموں اور فلموں نے بھی گہرے ثقافتی اثرات مرتب کیے۔ سماجی رابطے کے مختلف ذرائع نے جہاں دنیا کو ایک گاؤں کی مانند سمیٹ کر رکھ دیا ہے وہیں اس تبدیلی کے اثرات دنیا بھر کی ثقافتوں پر بھی بہت گہرے ہوئے ہیں۔ دنیا بھر میں سیاسی اتار چڑھاؤ بھی معاشرے میں تبدیلی کا پیش خیمہ بنا ہے۔ اسی طرح مختلف ممالک کی معاشی صورت حال بھی معاشرتی اقدار میں تبدیلی کا سبب بنتی رہی ہے۔ معاشرتی مسائل کے حوالے سے انسائیکلو پیڈیا میں معاشرتی تبدیلی اور تغیر کی اہم وجوہات مختصراً اس طرح سے بیان کی گئی ہیں:

> "There are many possible sources of social change. As suggested earlier, new technologies (tools and procedures) may contribute to change. Historians and social scientists have written about the social effects of technologies including the printing press, steam engines, trains, assembly lines, light bulbs, movies, forestry techniques, automobiles, televisions, and programmable chips. Change can also result from new policies introduced by national government or by actions of foreign governments or groups that threaten or actually invade a society, environmental variables have also been important in bringing about social change;

prolonged droughts, floods, hurricanes, earthquakes, volcanic eruptions have contributed to social transformations in societies around the world. By the last decades of the 20th century, globalization become a powerful source of change in many societies."(۲۵)

(معاشرتی تبدیلی کے بہت سے ممکنہ ذرائع ہیں۔ جیسا کہ پہلے بیان کیا گیا ہے، نئی ٹیکنالوجیاں (آلات اور طریقہ کار) تبدیلی کا سبب بن سکتی ہیں۔ مورخین اور سماجی سائنس دانوں نے ٹیکنالوجی کے سماجی اثرات کے بارے میں لکھا ہے، جن میں پرنٹنگ پریس، بھاپ کے انجن، ٹرینیں، اسمبلی لائنیں، لائٹ بلب، فلمیں، جنگلات کی تکنیک، آٹو موبائل، ٹیلی ویژن اور پروگرام کی جاسکنے والی چپیں شامل ہیں۔ قومی حکومت کی طرف سے متعارف کرائی گئی نئی پالیسیوں یا غیر ملکی حکومتوں یا گروہوں کی کارروائیوں کے نتیجے میں، جو معاشرے کے لیے خطرہ یا اس پر حقیقی حملہ ہو سکتا ہے، بھی تبدیلی کا سبب ہو سکتی ہیں۔ ماحولیاتی تغیرات بھی سماجی تبدیلی لانے میں اہم رہے ہیں۔ طویل خشک سالی، سیلاب، سمندری طوفان، زلزلے اور آتش فشاں کے پھٹنے نے بھی دنیا بھر کے معاشروں میں سماجی تبدیلیوں میں اہم کردار ادا کیا ہے۔ ۲۰ ویں صدی کی آخری دہائیوں تک، عالمگیریت بہت سے معاشروں میں تبدیلی کا ایک طاقت ور ذریعہ بن گئی۔)

ونسنٹ۔ این۔ پریلو نے سماجی تبدیلیوں کے محرکات بیان کرتے ہوئے سائنسی ترقی، قومی پالیسیوں، غیر ملکی حکومتوں کی مداخلت اور ماحولیاتی تبدیلیوں کا ذکر کیا ہے۔ یوں یہ امر واضح ہو جاتا ہے کہ ٹیکنالوجی کے میدان میں جنم لینے والی تبدیلیاں معاشرے کے رہن سہن کو جہاں متاثر کرتی ہیں وہیں معاشرے کے فکری زاویوں کا رخ بھی تبدیل کر دیتی ہیں۔ ہم معاشرے میں ان تبدیلیوں کے مظاہر کا بآسانی مطالعہ کر سکتے ہیں۔ یہ تبدیلیاں رابطے کے ذرائع کی صورت میں ہوں یا ابلاغ کے مظاہر کی شکل میں معاشرے پر گہرے اثرات مرتب کرتی ہیں۔ اسی طرح قومی حکومت کی طرف سے متعارف کروائی گئی تبدیلیاں بھی معاشرتی تبدیلیوں کا بڑا ذریعہ بنتی آئی ہیں۔ ہم تاریخِ عالم کے مطالعہ سے ایسی بے شمار مثالیں ڈھونڈ سکتے ہیں جہاں حکومتوں کی تبدیلیوں نے زبان، طرز معاشرت اور اقدار کو یکسر بدل کر رکھ دیا۔ اسی طرح غیر ملکی مداخلت جو ظاہری بھی ہو سکتی ہے اور ڈھکی چھپی بھی، اپنے اثرات دکھاتی ہے اور معاشرتی تبدیلیوں کا پیش خیمہ بن جاتی ہے۔

وقت کی رفتار کے ساتھ جہان نو کی تشکیل میں انسان نے جہاں بہت کچھ پایا وہاں بہت کچھ کھویا بھی ہے۔ انسان اپنے علم و حکمت کی بدولت مسلسل ترقی کا سفر طے کرتا چلا گیا یہاں تک کہ یہ تبدیلی کے اثرات

رسم ورواج سے لے کر معاشرے کے مضبوط شعبوں پر بھی اثر انداز ہوتے ہیں۔ جس سے بڑی سطح پر قوانین میں تبدیلی بھی رونما ہوتی ہے تبدیلی کا عمل تیزی سے ہو یا سست روی کا شکار ہو، لیکن یہ اس قدر طاقت ور عمل ہوتا ہے کہ اس سے مذاہب بھی متاثر ہوتے ہیں بظاہر دیکھنے میں کہا جاسکتا ہے کہ مذاہب میں تبدیلی رونما نہیں ہوسکتی، جب کہ حقیقت اس کے متضاد ہے کیوں کہ عملاً اس کی تعبیر اور تشریح میں بھی تبدیلیاں رونما ہوتی ہیں۔ انسانی تاریخ اس کا منہ بولتا ثبوت ہے۔ جس کی عملی صورت ہر فرد اپنا محاسبہ کرتے ہوئے دیکھ سکتا ہے۔ اگر انسان صرف اپنے بچپن سے جوانی تک کے سفر پر نظر دوڑاتے ہوئے تقابل کرے تو با آسانی فرق واضح کیا جا سکتا ہے۔ بالکل اسی طرح معاشرہ کوئی جامد شے نہیں ہے۔ اس میں مسلسل تغیر پیدا ہوتا رہتا ہے۔ معاشرے میں کسی بھی چیز کو حتمی نہیں کہا جاسکتا۔

ہر شے مرحلہ وار پروان چڑھتی ہے۔ کسی بھی سطح پر تغیر و تبدل کے مختلف مراحل ہوتے ہیں، جو پورے نظام میں تبدیلی کے زمرے میں اہم کردار ادا کرتے ہیں۔ ہر معاشرے میں تغیر پذیری وقت کے ساتھ ساتھ اور انسانی ضرورت کے تحت رونما ہوتی ہے۔ یہ تبدیلی عام طور پر معاشرتی اداروں (خاندان، تعلیمی ادارے، معاشی ادارے، سیاسی ادارے وغیرہ) سے شروع ہوتی ہے۔ کیوں کہ ان اداروں میں افراد اپنے فرائض سر انجام دے رہے ہوتے ہیں اور یہ تبدیلی ان کی سوچ اور عقل کی بدولت پروان چڑھتی ہے۔ تغیر پذیری کے مراحل پر بات کرتے ہوئے مختلف ماہرین سماجیات نے مختلف نظریات پیش کیے ہیں۔ ماہرین سماجیات پروفیسر عبدالحمید تنگہ اور ڈاکٹر محمد فاروق نے معاشرتی تبدیلی میں اہم کردار ادا کرنے والے چار مراحل کی نشان دہی کی ہے۔ جس میں سب سے پہلا مرحلہ آگہی کا ہے۔ یعنی کوئی بھی نئی چیز اس وقت تک معاشرے میں رائج نہیں ہوسکتی جب تک لوگ اس سے آگاہ نہ ہوں۔ جب بھی معاشرے میں کوئی نئی چیز متعارف کروانا مقصود ہو تو اس کے لیے سب سے پہلے آگہی مہم چلائی جاتی ہے۔ اس کی مثال اس طرح سے پیش کی جاسکتی ہے کہ جب بھی معاشرے میں نئی مصنوعات آتی ہیں تو ان کا اشتہار دیا جاتا ہے اور ایسے ایسے اشتہار بنائے جاتے ہیں جن سے لوگ متاثر ہو کر وہ چیز خرید لیں۔ اسی طرح نئی چیز متعارف کروانے کے لیے مختلف کمپنیوں کی جانب سے آگہی مہم چلائی جاتی ہے۔ جدید حالات کے پیش نظر؛ کورونا جس نے عالمی سطح پر تباہی مچائی، اس سے بچاؤ کے لیے لوگوں میں شعور پیدا کیا گیا۔ اس قسم کی آگہی مہم کے لیے ذرائع ابلاغ بنیادی کردار ادا کرتے ہیں۔ جس میں ریڈیو، ٹی وی، اخبار و رسائل، اشتہارات اور سوشل میڈیا وغیرہ کے ذریعے معلومات ہر فرد تک پہنچ جاتی ہے۔ دوسرا مرحلہ دل چسپی کا ہے۔ جب لوگ کسی چیز کی آگاہی حاصل کر لیتے ہیں تو اگلا

مرحلہ ان کے متاثر ہونے کا ہے کہ وہ کسی شے سے کتنا متاثر ہوئے ہیں۔ اس میں کتنی دل چسپی لیتے ہیں۔ ہر چیز کو پہلے کے مقابلے میں یا تو بہتر کر کے پیش کیا جاتا ہے یا اس کا اشتہار اس قدر متاثر کن ہوتا ہے کہ لوگ فوری طور پر اس کی طرف بڑھتے چلے جاتے ہیں اور وہ اس کے بارے مختلف ذرائع سے مزید معلومات حاصل کرتے ہیں۔ اس کے بعد تیسرا مرحلہ تجربے کا ہوتا ہے۔ اس کے فوائد و نقصانات کے پیش نظر اس چیز کو حاصل کر کے دیکھا جاتا ہے کہ وہ چیز کیسی ہے؟ اور آخری مرحلہ اس چیز کو اختیار کرنے یا پھر رد کر دینے کا ہوتا ہے۔ جب کوئی شخص کسی چیز کو استعمال میں لا کر دیکھتا ہے کہ وہ اس کے لیے کتنی فائدہ مند یا نقصان دہ رہی تو وہ یا تو اس چیز کو رد کر دیتا ہے یا پھر اپنا لیتا ہے۔ بڑی سطح پر جب کسی چیز کو اختیار کر لیا جاتا ہے تو وہ بڑی تبدیلی کا مرتکب ٹھہرتی ہے۔

معاشرتی تبدیلی اور اقدار

دنیا اور اس کے مظاہر میں تبدیلی فطری عمل ہے البتہ کہیں تبدیلی کا عمل غیر معمولی ہوتا ہے اور کہیں تغیر اور تبدل کا عمل تیزی سے رونما ہوتا ہے۔ معاشرے کی ساخت میں ایک بڑی تبدیلی اس کے جامع معیارات میں تغیر کی صورت ہوتی ہے جن کو "اقدار" کہا جاتا ہے۔ اقدار معاشرتی ڈھانچے کی جزوی حقیقت ہیں، جنہیں جامد تصور کرنا محض غلط فہمی ہے۔ عام طور پر اقدار میں تبدیلی آہستہ آہستہ رونما ہوتی ہے لیکن یہ معاشرتی تبدیلی پر منحصر ہے کہ وہ کتنی تیزی سے اثر پذیر ہوتی ہے۔ صنعتی اور شہری معاشروں میں اقدار کی تبدیلی تیزی سے رونما ہوتی ہے۔ جب کہ روایتی اور دیہی معاشروں میں یہ تبدیلی آہستہ آہستہ آتی ہے۔ معاشرتی اقدار نہ صرف تبدیلیوں سے گزرتی ہیں بلکہ معاشرتی تبدیلی میں اہم کردار ادا کرتی ہیں۔ اس حوالے سے چودھری شنکر راؤ کا خیال ہے معاشرتی ساخت کو متاثر کرنے اور تبدیلی لانے والے عوامل میں معاشرے کے وہ معیارات بھی شامل ہوتے ہیں جن کو اقدار کہا جاتا ہے۔

> "Values refer to the constituent facts of social structure... Social values not only undergo changes, but also contribute to social change."(۲۶)

(اقدار معاشرتی ساخت کے جزوی حقائق کا درجہ رکھتی ہیں۔ معاشرتی اقدار نہ صرف تبدیلیوں سے گزرتی ہیں بلکہ معاشرتی تبدیلی میں بھی اہم کردار ادا کرتی ہیں۔)

کسی بھی معاشرے کی معاشرتی اقدار میں تبدیلی کی مختلف وجوہات ہوتی ہیں جیسا کہ معاشرتی تبدیلی کے اسباب کے ضمن میں بیان کیا گیا ہے۔ چند عوامل جو اقدار کی تبدیلی میں اہم کردار ادا کرتے ہیں ان میں ٹیکنالوجی کی ترقی اور وسیع پیمانے پر اس کے استعمال سے لوگوں کے رویوں میں فرق آ جانا۔ سائنس اور ٹیکنالوجی کی ایجادات کے علاوہ سیاسی اور معاشی تبدیلیاں، عالمگیریت یعنی جب معاشرے دنیا کے دیگر معاشروں سے ملتے ہیں تو نئے نظریات کی آمیزیش سے تبدیلیاں، وسیع پیمانے پر بلند شرح تعلیم، شہروں کا بڑھنا اور صنعت کاری میں اضافے وغیرہ کی وجہ سے اقدار میں تبدیلی رونما ہوتی ہے۔ معاشرتی تبدیلی کی شرح اور سمت کو معاشرتی اقدار اور اخلاقی اصول متاثر کرتے ہیں۔ جب کہ جدید مغربی معاشرے ہر طرح کی تبدیلی فوری قبول کرتے ہیں اور ان کا خیر مقدم کرتے ہیں۔ ڈاکٹر محمد فاروق معاشرتی رویہ جات اور اقدار پر بات کرتے ہوئے اس قسم کے خیالات کا اظہار کرتے ہیں:

> "ملک کے شہری اور دیہاتی معاشروں میں معاشرتی تغیر کی قبولیت کے مدارج میں فرق پایا جاتا ہے۔ ترقی پسند اور تعلیم یافتہ طبقہ معاشرتی تغیر کو جلدی قبول کر لیتا ہے لیکن رجعت پسند اور پسماندہ طبقہ کسی بھی معاشرتی نئی قدر کو اپنانے میں لیت و لعل یعنی پس و پیش سے کام لیتا ہے۔"(۲۷)

معاشرتی تغیر کے ضمن میں رویہ جات کا فرق عام بات ہے لیکن اس کی وجہ سے ترقی کی راہ میں رکاوٹیں حائل ہوتی ہیں۔ گو بعض پس ماندہ علاقے ذات پات، رشتے داری، خاندانی اقدار کے پیش نظر جدید نظریات کو قبول کرنے سے گریز کرتے ہیں۔ معاشرتی تبدیلی کے اثرات ثقافت میں تبدیلی کے موجب بھی بنتے ہیں لیکن تبدیلی کا اثر ثقافتی سطح پر نہ بھی قبول کیا جائے تو معاشرتی ادارے اس تبدیلی کو مفید سمجھتے ہوئے فوری قبول کرتے ہیں۔ نئی اقدار کو اپنانے اور معاشرتی تغیر کی راہ میں حائل رکاوٹوں میں: قدامت پسندی، آمد و رفت کی ناقص صورت حال، تعلیمی فقدان، معاشی بد حالی وغیرہ ایسے عوامل ہیں جو تغیر پذیری کو متاثر کرتے ہیں۔

ادب اور معاشرتی اقدار

ادب کے لیے انگریزی میں لاطینی زبان سے ماخوذ لفظ "Literature" مستعمل ہے۔ اردو میں یہ لفظ (ادب) مختلف معنی و مفہوم اور اصطلاحی اعتبار سے ارتقائی مراحل طے کرتے ہوئے بالآخر اپنے مخصوص معنوں میں تخلیقی اسالیب کے اظہار کے لیے استعمال ہونے لگا۔ نظم و نثر کی تمام اصناف ادب سے متعلق ہیں۔

ادب اور سماج کے مابین گہرا ربط ہے۔ ادب کی بنیادی خوبی انسان کے جذبات و احساسات کو اسلوب کے سپرد کرتے ہوئے ایسی تخلیق پیش کرنا ہے جو فرد کے جذبات کی ذات سے نکل کر اجتماعی احساسات میں منتقل ہو جاتا ہے۔ ادیب دراصل معاشرے کی مصوری اپنے قلم کی طاقت سے کرتا ہے۔ فرد کا تعلق سماج سے ہے اور تخلیق کار کے احساسات و جذبات میں مشاہدے کا عمل دخل ہوتا ہے اور یہ مشاہدہ اس کے ماحول، معاشرے اور تہذیب کی عکاسی کرتا ہے۔ لہٰذا ادب میں معاشرتی اقدار کا پایا جانا فطری امر ہے۔ انسان کی زندگی کے مختلف پہلوؤں کا عکاس "ادب" کوئی جامد شے نہیں۔ یہ کسی ایک قوم یا جغرافیائی حدود تک محدود نہیں ہوتا بلکہ اس میں ہر دور کے مختلف اثرات پائے جاتے ہیں جو مستقبل کے تقاضوں کا احاطہ اور حال کی آواز ہوتے ہیں۔ ادب انسان کی زندگی، داخلی اور خارجی حالات اعمال و افعال کا مجموعی طور پر اظہار کرتا ہے۔ اسی پس منظر میں ڈاکٹر عارف ثاقب لکھتے ہیں:

> "ادب کی تخلیق ایک جاری و ساری عمل ہے جو تاریخ کے ہر دور میں اپنے ماحول اور اس سے وابستہ سماجی اقدار سے خام مواد حاصل کرتا ہے۔ ماحول کی تبدیلی اور اس کے نتیجے میں سماجی اقدار کی تغیر پذیری اور ادب کے نئے زاویوں اور تخلیق کے نئے سانچوں کا تعین کرتی ہے اور یوں ایک نیا طرز احساس جنم لیتا ہے۔"(۲۸)

اس اقتباس سے ماحول کی تبدیلی اور اس کے نتیجے میں پیدا ہونے والے حالات اور ادب پر اس کے اثرات کا پایا جانا عیاں ہے۔ چوں کہ یہ تخلیق کار کے مشاہدات کا نچوڑ ہوتا ہے یہی وجہ کہ یہ فرد کی زندگی سنوارنے کا کام بھی کرتا ہے۔ معاشرے کی پائیدار ترقی کے لیے ادب کا مطالعہ نہایت ضروری ہے۔ معاصر ادب معاشرتی اقدار و روایات کو مختلف تکنیکی اور اسلوبی حربوں سے اجاگر کرتا ہے یہی وجہ ہے کہ پیش نظر تحقیق میں اکیسویں صدی میں تخلیق ہونے والے پاکستانی اردو افسانوں کے مطالعے سے تغیر پذیر معاشرتی اقدار کی عکاسی کا تحقیقی اور تنقیدی جائزہ پیش کیا گیا ہے۔

پاکستان خطۂ عرض پر ایک اسلامی خود مختار ریاست کے طور پر وجود رکھتا ہے جو اپنے الگ تشخص، دو قومی نظریے کی بنیاد پر ہندوستان سے جدا ہوا۔ برصغیر پاک و ہند کی تقسیم اور مطالبہ پاکستان کے پس پردہ محرکات میں سے ایک محرک اسلامی معاشرے کا قیام تھا، ایک ایسی فلاحی ریاست جہاں مسلمانوں کا اپنا مخصوص معاشرتی نظام ہو تاکہ وہ اپنے افکار و نظریات، رہنے کے اطوار اور دیگر سیاسی اور معاشی حالات کے مطابق زندگی بسر کر سکیں۔ برصغیر کے مسلمانوں کو اس بات کا شدت سے احساس تھا کہ وہ ہندوستان میں اپنے

مذہبی، تہذیبی اور ثقافتی نظریات کے مطابق زندگی نہیں گزار سکتے جس کی بنا پر وہ ایک ایسا پاکیزہ معاشرہ قائم کرنا چاہتے تھے جس کی بنیاد اسلامی تعلیمات کے مطابق ہو۔ یہی وجہ ہے کہ ہندوستانی معاشرے اور پاکستانی معاشرے میں حد فاصل قائم ہے۔

پاکستان میں مسلمانوں کی کثیر آبادی کے علاوہ مختلف مذاہب، ذاتوں اور زبانوں سے تعلق رکھنے والی آبادی بھی موجود ہے لیکن عوام کی اکثریت مسلمان ہونے کی وجہ سے مذہب اسلام ثقافتی تانے بانے کی تشکیل میں اہم کردار ادا کرتا ہے۔ ایک ہی معاشرے میں رہتے ہوئے لوگوں کے مختلف رسم ورواج، رہن سہن کے طور طریقوں میں فرق کا پایا جانا ثقافتی فرق کہلاتا ہے۔ پاکستانی ثقافت کو چار حصوں میں تقسیم کیا جاتا ہے۔ جس میں پنجابی، سندھی، پختون اور بلوچی نمایاں ہے۔ ان کو ایک معاشرہ بنانے میں جو مشترک اقدار کردار ادا کرتی ہیں ان میں اردو زبان جو پاکستان کے چاروں صوبوں میں بولی اور سمجھی جاتی ہے۔ تعلیمی اداروں اور دفاتر میں بھی اردو اور انگریزی زبان کا استعمال کیا جاتا ہے جس سے معاشرے میں یکجہتی پائی جاتی ہے۔ اسی طرح ان چاروں صوبوں کا مذہب اسلام ہے یوں پاکستانی معاشرے میں اسلام کے اصولوں اور اقدار کے تحت زندگی گزارنے کو اہمیت حاصل ہے۔ اسی طرح تمام صوبوں کے مذہبی رسوم جن میں حج، عیدین، محرم اور دیگر قومی اقدار یکساں ہیں اسی طرح تعلیمی نظام، سیاسی نظام، خاندانی نظام وغیرہ یکساں اقدار پر مشتمل ہے۔ گو کہ دیہی اور شہری زندگی میں فرق پایا جانا ناگزیر ہے۔ دیہی زندگی کے برعکس شہری زندگی پر معاشرتی تبدیلی کے اثرات نمایاں ہیں۔ اسی طرح معاشرتی تغیر کی رفتار علاقوں کی مناسبت سے بھی مختلف ہے مثلاً جن علاقوں میں صنعتی ترقی میں تیزی سے اضافہ ہو رہا ہے وہاں معاشرتی تبدیلیاں تیزی سے رونما ہو رہی ہیں۔

ج۔ سماجیات کے نظریات اور معاشرتی اقدار

کسی بھی معاشرے اور اس کی اقدار و روایات کا مطالعہ؛ معاشرتی فلاح و بہبود، خوش حال نظام کی تشکیل اور ترقی کے لیے یکساں ناگزیر عمل ہے۔ معاشرتی تانے بانے میں مختلف اداروں کی کارکردگی اور ان کے طفیل ان کی ذمے داریاں اہم کردار ادا کرتی ہیں۔ معاشرے کی بھلائی اور خیر خواہی کے لیے کوشاں افراد معاشرتی حقائق پر غور و فکر کرتے ہیں اور معاشرے کا مطالعہ کرتے ہوئے نتائج اخذ کرتے ہیں جن پر عمل پیرا ہو کر کوئی بھی معاشرہ ترقی کی منازل طے کرتا ہے۔ مغربی مفکرین کے علاوہ مسلمان مفکرین نے بھی معاشرے کے رموز پر اپنے خیالات پیش کیے۔ انیسویں صدی کے صنعتی انقلاب سے جب معاشرہ متاثر ہوا تو معاشرتی

مسائل کے حل اور حالات کو سمجھنے کے لیے ان مفکرین کے خیالات میں سائنسی رنگ بھر کر علم کی شکل میں ڈھال دیا گیا۔ اس حوالے سے ابن خلدون جو مسلمان مفکر تھے اور فرانسیسی مفکر آگسٹ کومٹے کی خدمات کو سراہتے ہوئے انھیں عمرانیات کا بانی تسلیم کیا جاتا ہے۔

"سماجیات" دیگر سماجی علوم کی طرح علم کی ایک ایسی شاخ ہے جس کا دائرہ کار وسیع ہے اور اسے دیگر علوم سے جدا نہیں کیا جا سکتا، یہ سماجی مطالعے کے لیے استعمال کی جانے والی اصطلاح ہے۔ انگریزی میں Sociology عمرانیات کا مترادف ہے۔ اس میں سماج، اس کی ساخت، وجود اور کردار کا مطالعہ کرنے کے ساتھ ساتھ تغیر برپا کرنے والے عوامل وغیرہ کا مطالعہ کیا جاتا ہے۔ جس میں سماجی افعال، سماجی اداروں اور سماجی نظام کو تاریخی، معاشی، سیاسی، مذہبی، روایتی تہذیبی و تمدنی حوالے سے پرکھا جاتا ہے اور معاشرے میں استحکام پیدا کرنے والے عوامل پر توجہ مرکوز کی جاتی ہے۔ سماجیات کے تحت جدید تحقیق کے لیے سائنسی طریقہ کار اختیار کیا جاتا ہے۔ نیز سماجی مطالعے کے لیے قدیم اور جدید نظریات سے بھی استفادہ کیا جاتا ہے۔ اس سلسلے میں ماہرین سماجیات کی آرا اور نظریات قابل غور ہیں، جن میں مشرقی اور مغربی مفکرین کے پیش کردہ نظریات کو اہمیت حاصل ہے۔ ان نظریات میں کلاسیکی اور جدید نظریات شامل ہیں لیکن فکر اور نظریے میں واضح فرق موجود ہے۔

معاشرتی مسائل اور ان کے حل کے بارے میں سوچ بچار عمرانی فکر کہلاتی ہے اور اس کا تعلق دانش ورانہ اور فلسفیانہ خیالات سے ہے جو کسی خاص وقت یا جگہ کے لیے مخصوص ہوتے ہیں۔ ان کا تعلق معاشرے کی نشوونما، ترقی یا پھر زوال سے ہے۔ ایسے لوگ معاشرے میں بہت کم پائے جاتے ہیں جو حالات وواقعات اور ان کے اسباب پر غور و فکر کرتے ہیں۔ ایسے افراد کو مفکرین کہا جاتا ہے۔ فکر ایک سوچ ہے جو درست بھی ہو، سکتی ہے اور غلط بھی، یعنی یہ مفروضے کا مقام رکھتی ہے۔ سماجی فکر کے نتیجے میں معاشرتی ڈھانچے اور اس کے حوالے سے نقطۂ نظر پیش کیے جاتے رہے ہیں۔ جب کہ نظریات سائنسی اصولوں کے تحت حالات کو سمجھنے اور مسائل حل کرنے میں معاون ہوتے ہیں۔ ان نظریات پر تحقیق و تنقید کی جا سکتی ہے۔ دلائل کی روشنی میں ترمیم و تردید کرتے ہوئے انھیں اپنایا جا سکتا ہے یا پھر رد کیا جا سکتا ہے۔ ایک اچھا نظریہ مشاہدے کے لیے راہ ہموار کرتا ہے۔ یہ حال اور مستقبل کی تحقیق میں اہم کردار ادا کرتا ہے۔

اس تحقیق کے سلسلے میں ایمائل ڈرخائم کا نظریہ "معاشرتی حقائق" منتخب کیا گیا ہے۔ ایمائل ڈرخائم کا تعلق سماجیات کے تین بڑے مکاتبِ فکر میں سے فعالیت / فعلی (Functionalist) مکتب فکر سے ہے۔ اس

نظریے کو بیان کرنے سے قبل سماجیات کے بنیادی مکاتب فکر کا مطالعہ پیش کیا جائے گا۔ عمرانیات کے بنیادی طور پر تین مکاتبِ فکر ہیں جو مختلف انداز اور مختلف زاویوں سے معاشرے کا مطالعہ کرتے ہیں انھیں "Theoretical Perspectives" بھی کہا جاتا ہے۔

۱۔ فعلی مکتبِ فکر (Functionalist School of Thought)

۲۔ تصادمی مکتبِ فکر (Conflict School of Thought)

۳۔ تفاعلی مکتبِ فکر (Interactionist School of Thought)

یہ تینوں مکاتیب فکر حقیقت میں وہ تصورات ہیں جن کی مدد سے معاشرتی مسائل اور تصورات کو سمجھنے میں مدد ملتی ہے۔ کین براؤن (Ken Browne) نے ان نظریات کو سمجھنے کے لیے ایک مثال "بازار" کی دی ہے۔ جس میں فرض کیا گیا ہے کہ بازار میں چار افراد ہیں۔ دکان دار، خریدار، پولیس والا اور جیب کترا۔ یوں بازار میں جیب کترے کی نظر صرف لوگوں کی جیب پر ہوتی ہے، جب کہ دکان دار گاہکوں کو اپنی دکان کی طرف راغب کرنے کی کوشش میں ہوتا ہے۔ خریدار معیاری چیز کی تلاش میں اور پولیس والا جرائم پر قابو رکھنے کی غرض سے موجود ہوتا ہے۔ یوں چاروں افراد کی توجہ کا مرکز مختلف ہے۔ یہ چاروں انداز دراصل بازار کو دیکھنے کے چار مختلف پہلو ہیں ان کو چار مختلف نظریاتی پہلو کہا جاسکتا ہے جو اپنی اپنی جگہ درست ہیں۔ اسی طرح ان تینوں مکاتیب فکر کا معاشرے کے بارے مختلف تصور ہے جو اپنی اپنی جگہ درست اور مختلف ہے۔ ان کا مختصر تعارف ذیل میں پیش کیا گیا ہے۔

۱۔ فعلی مکتبِ فکر (Functionalist School of Thought)

سماجی مطالعے کے لیے اس مکتبِ فکر کے ماننے والے ماہرین معاشرہ کو فعال بنانے کے لیے اس بات پر یقین رکھتے ہیں کہ مستحکم معاشرے کا انحصار معاشرے کو فعال بنانے والے اداروں پر ہے۔ معاشرے کا ایک حصہ دوسرے پر منحصر ہے۔ اس لیے معاشرے میں ایک جگہ کچھ ہو تو اس کے اثرات دوسری جگہ پر بھی دیکھے جاتے ہیں۔ اس مکتبِ فکر سے تعلق رکھنے والے ماہرین اس کی وضاحت اس طرح سے کرتے ہیں:

> "Functional integration refers to the interdependence among the parts of social system. Just as the human body is made up of interrelated parts, each of which plays a role in maintaining the whole, so social systems are composed of interconnected

parts that both support and depend on one another. Each part has some contributions that it must make if the whole system is to work well. These contributions are its functions...that is, functions are the effects that some social groups, event, or institution has within a system of relationships to other such phenomena."(۲۹)

(فعالیت کے انضمام سے مراد سماجی نظام کے حصوں کا ایک دوسرے پر انحصار کرنا ہے۔ جس طرح انسانی جسم میں اعضا ایک دوسرے سے منسلک ہوتے ہیں، جن میں سے ہر ایک پورے جسم کو برقرار رکھنے میں اپنا کردار ادا کرتا ہے، اسی طرح سماجی نظام ایک دوسرے سے جڑے ہوئے حصوں پر مشتمل ہے جو ایک دوسرے کی حمایت کرتا ہے اور ایک دوسرے پر منحصر ہوتا ہے۔ ہر حصے کو لازماً کسی طور شریک ہونا پڑتا ہے تاکہ پورا نظام بہترین کام کر سکے۔ یہ شراکت دراصل اس کے افعال ہوتے ہیں۔...یعنی افعال وہ اثرات ہیں جن کے حامل کچھ سماجی گروہ، واقعات یا ادارے اپنے جیسے مظاہر کے ساتھ تعلقات کے نظام میں ہوتے ہیں۔)

فعلی مکتب فکر کا اہم مفکر کریگ کیلہان معاشرے کو ایک ایسی اکائی قرار دیتا ہے جس میں بسنے والے افراد اپنی اپنی قابلیت اور حیثیت کے مطابق معاشرے میں ہونے والی تبدیلیوں کا حصے دار بنتے ہیں۔ معاشرے میں ہونے والی تبدیلیاں چند افراد کے تبدیل ہونے سے رونما نہیں ہوتیں بلکہ معاشرے میں بسنے والے افراد کم یا زیادہ اس تبدیلی کے حصے دار بنتے ہیں۔

یعنی فعلی نظریے کے مطابق معاشرے کے مختلف حصے ایک دوسرے سے الحاق ہیں۔ ہربرٹ سپنسر Herbert Spencer نے معاشرے کا موازنا انسانی جسم سے کیا۔ اس مکتبہ فکر سے تعلق رکھنے والے ماہرین معاشرے کو انسانی جسم سے تشبیہ دیتے ہیں ان کا ماننا ہے کہ جس طرح انسانی جسم کے اعضا ایک دوسرے سے منسلک (interconnected) ہیں اور جسم کا ہر حصہ دوسرے سے جڑا ہے جو جسم کو فعال رکھنے میں اپنا اپنا کردار ادا کرتا ہے۔ مثلاً اگر دل پھیپھڑے، جگر، آنکھیں، بازو یا دیگر اعضا اپنا اپنا کام درست طریقے سے سرانجام دیں تو انسانی جسم بھی درست حالت میں رہتا ہے لیکن کسی ایک عضو میں خرابی یا تکلیف پورے جسم میں تکلیف کا سبب بنتی ہے۔ اسی طرح معاشرے کے تمام جزو اپنا اپنا کام سرانجام دیتے ہیں۔ کسی ایک جزو میں خرابی پورے معاشرے میں خرابی پیدا کرتی ہے۔ معاشرہ ایک اکائی ہے اور اس کے اجزا میں بنیادی پانچ ادارے ہیں۔ جن میں خاندان، مذہب، تعلیم، معیشت اور سیاست ہے۔ یہ پانچوں معاشرے میں استحکام لاتے

ہیں اور کسی ایک ادارے کے اچھے یا برے کردار کا اثر دوسرے پر پڑتا ہے۔ مثلاً معاشی طور پر خرابی پورے معاشرے کی بدحالی کا سبب بنتی ہے اس سے معاشرہ مکمل طور پر متاثر ہوتا ہے۔ اسی طرح ایک بہتر خاندان بہتر معاشرے کی بنیاد اور ضامن ہے، اسی طرح معاشرے کی ترقی کا انحصار تعلیم پر ہے۔ شعبہ تعلیم اگر اپنے فرائض ادا کرنے میں ناکام ہو جاتا ہے تو بچے تعلیم یافتہ نہ ہوں گے اور پورے ملک کی ترقی متاثر ہو گی۔ اسی طرح پولیس کی مثال لی جائے تو جب وہ اپنا صحیح کردار ادا نہ کرے ملزمان کو گرفت میں نہ لائے رشوت خوری پر اتر آئے تو ایک تو یہ شعبہ ختم ہو جائے گا دوسرا معاشرے میں جرائم بڑھ جائیں گے جو معاشرے کو بری طرح متاثر کریں گے۔ نئے حالات اور چیلنجز معاشرتی تبدیلی کا سبب بنتے ہیں۔ میکیونیز (Macionis) کے مطابق:

> "The Structural –functional approach is a framework for building theory that sees society as a complex system whose parts work together to promote solidarity and stability."(۳۰)

(ساختی-فعالیت نقطہ نظر نظریہ کی تعمیر کا ایک سانچہ ہے جو معاشرے کو ایک پیچیدہ نظام کے طور پر دیکھتا ہے جس کے حصے یکجہتی اور استحکام کو فروغ دینے کے لیے مل کر کام کرتے ہیں۔)

میکیونیز کی اس تعریف سے واضح ہو جاتا ہے معاشرے کی ساخت کے حوالے سے فعلی نظریہ ایک فریم فراہم کرتا ہے جس کے تحت معاشرے کے پیچیدہ نظام کو مستحکم کرنے اور فعال بنانے کے لیے اس کے تمام حصے یعنی ادارے مل کر کام کرتے ہیں۔ ہر ادارے کا معاشرے میں کوئی نا کوئی کردار یا فنکشن ضرور ہوتا ہے جب وہ اپنا یہ کردار ادا کرنا بند کر دے تو ساخت خود بہ خود ختم ہو جاتی ہے۔ یعنی معاشرے کی کوئی چیز اس وقت تک وجود قائم رکھتی ہے جب تک یہ اپنا کردار ادا کرتی رہے۔ اس کی ضرورت اسی وقت تک محسوس کی جاتی ہے۔ مختصر یہ کہ جو چیزیں ہمارے سماج اور ثقافت کو فائدہ پہنچاتی ہیں وہی معاشرے میں زندہ رہتی ہیں۔ جب کوئی چیز اپنا کردار ادا کرنا بند کر دے تو وہ معدوم ہو جاتی ہے۔ معاشرہ انہی چیزوں کو اپناتا ہے جس سے معاشرے کو فائدہ ہو دیگر اپنے آپ ختم ہو جاتی ہیں۔ اس مکتبِ فکر سے تعلق رکھنے والے ماہرین میں ڈرخائم، ویبر، سپنسر مرٹن اور پارسنز کی خدمات قابل ذکر ہیں۔ یہ نہ صرف سماجی استحکام کی بات کرتے ہیں بلکہ مشترکہ اقدار کی اہمیت پر زور دیتے ہیں۔

۲۔ تصادمی مکتبِ فکر (Conflict School of Thought)

اس مکتبِ فکر کے تحت معاشرے کا تجزیہ تصادم و مسابقت کی بنیاد پر ہوتا ہے کہ کیسے معاشرے میں

پائے جانے والے سماجی رویوں میں تصادم کی بنیاد پر معاشرے میں تبدیلی رونما ہوتی ہے۔ یہ نظریہ تصادم کی وجوہات تلاش کرتے ہوئے مساوات کی اہمیت پر زور دیتا ہے اور سماج میں آمریت اور سرمایہ دار طبقے کی وجہ سے پیدا ہونے والی معاشرتی تبدیلی اور مسائل کا احاطہ کرتا ہے۔ اس نظریے کے دائرہ کار کے حوالے سے ماہرین سماجیات لکھتے ہیں:

> "Conflict theory emphasizes the role of coercion and power in society and the ability of some to influence and control others."(۳۱)

(نظریہ تصادم معاشرے میں جبر اور قوت کے کردار پر زور دیتا ہے کہ کیسے یہ کسی پر اثر انداز ہونے اور اسے کنٹرول کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔)

مارگریٹ اینڈرسن کی یہ تعریف اس بات کی وضاحت کرتی ہے کہ جبر کا یہ کردار کمزور کو اپنا مطیع بنائے رکھنے کی کوشش کرتا ہے تاکہ وہ معاشرے میں اس کی حاکمیت پر سوال اٹھانے کی جرأت نہ کر سکے۔ یوں وہ معاشرے پر اس انداز میں اثر انداز ہوتا ہے کہ اس کا قبیل معاشرتی ذرائع سے خوب لطف اندوز ہوتا رہے اور دوسرے اس کے خدمت گار کے طور پر اپنے فرائض سر انجام دیتے رہیں۔یعنی نظریہ تصادم معاشرے میں پائے جانے والے جبر اور طاقت کے کردار کا مطالعہ کرتا ہے کہ کیسے طاقت بعض صورتوں میں دوسروں پر تسلط قائم کرتے ہوئے اثر انداز ہوتی ہے۔

اس نظریے کی بنیاد اس بات پر ہے کہ معاشرے میں ہر جگہ اور سطح پر تصادم پایا جاتا ہے۔ یہ تصادم دو افراد کے درمیان بھی ہو سکتا ہے اور دو گروہوں کے درمیان بھی۔ طبقاتی کش مکش معاشرے کو متاثر کرتی ہے۔ افراد کے درمیان ایک مقابلہ جاری ہے جس کے تحت معاشرے میں حاکمیت کا دور دورہ ہے۔ سرمایہ دار طبقے کے پاس وسائل کی فراوانی ہے اور اسی گہما گہمی میں مقابلے کی دوڑ لگی ہوئی ہے۔ معاشرہ وسائل اور طاقت کے حصول کے لیے کوشاں ہے۔ جس سے معاشرے میں ترقی ہوئی اور یکساں تبدیلی آئی لیکن معاشرے کی ساخت میں تصادم اور یہ تبدیلی افراد کے درمیان سماجی و اقتصادی مفادات کی بنیاد پر ہے۔ اس کا نتیجہ عدم مساوات کی صورت میں سامنے آتا ہے یوں امیر طبقہ امیر سے امیر تر ہوتا جا رہا ہے اور غریب کا استحصال کیا جا رہا ہے وہ سخت محنت کے باوجود بھی غربت کا شکار ہوتا جا رہا ہے جو معاشرے میں ایک بڑی خرابی کا مرتکب ہے۔

"According to conflict theory, inequality exists because those in control of a disproportionate share of society's resources actively defend their advantage. The masses are not bound to society by their shared values but by coercion at the hands of the powerful. In conflict theory, the emphasis is on social control, not on consensus and conformity. Those with the most resources exercise power over others; inequality and power struggles are the result."(۳۲)

(تصادم کے نظریہ کے مطابق، عدم مساوات کا وجود اس لیے ہے کیونکہ معاشرے کے وسائل کے غیر متناسب حصے پر قابض افراد اپنے فائدے کا فعال طور پر دفاع کرتے ہیں۔ عوام اپنی مشترکہ اقدار سے معاشرے کے پابند نہیں ہوتے بلکہ طاقتوروں کے ہاتھوں مجبور ہوتے ہیں۔ تصادم کے نظریہ میں، سماجی کنٹرول پر انحصار ہے، اتفاق اور مطابقت پر نہیں۔ سب سے زیادہ وسائل رکھنے والے دوسروں پر طاقت کا استعمال کرتے ہیں، یہ عدم مساوات اور اقتدار کی کشمکش کا نتیجہ ہے۔)

مارگریٹ اینڈرسن نے وضاحت کی ہے کہ تصادم کا یہ نظریہ کس اصول پر کام کرتا ہے۔ طاقت ور اپنے تسلط کو قائم رکھنے کے لیے مجبور افراد کو ہمیشہ اپنا مطیع رکھنے کی کوشش کرتا ہے۔ ایسے معاشروں میں مساوات اور برابری کا اصول کہیں کارفرما دکھائی نہیں دیتا۔ طاقت ور اپنے مفادات کو تحفظ دینے کے لیے ہی قانون سازی کرتا ہے۔ اقدار اور روایات اسی طاقت ور طبقے کے زیر اثر نمو پاتی ہیں۔ یہ طاقت ور افراد کسی قاعدے اور کسی اصول کے ماتحت نہیں ہوتے بلکہ قوانین تشکیل دینے والے ادارے ان کے زیر اثر ہونے کی وجہ سے ایسے قوانین بناتے ہیں جو ان کے جرائم پر ان کی پکڑ کی بجائے انہیں تحفظ فراہم کرتے ہیں۔

نظریہ تصادم کے مطابق، معاشرے میں عدم مساوات کی وجوہات میں معاشرے کے وسائل کی غیر مساوی تقسیم سر فہرست ہے۔ کیوں کہ معاشرے کے وسائل جن میں سماجی اور اقتصادی ذرائع شامل ہیں اس پر افراد غیر قانونی طور پر قابض ہوتے ہیں اور ان وسائل کو اپنے مفاد کے لیے اپناتے ہیں۔ یہ لوگ معاشرے کی مشترکہ اقدار کے پابند نہیں ہوتے بلکہ طاقت ور جبر و طاقت کے ذریعے غریب کا استحصال اور اس پر حکمرانی کرتا ہے۔ تصادم کا یہ نظریہ معاشرے کی اس غیر مساوی تقسیم کے برعکس مستحکم نظام کا خواہاں ہے۔

معاشرتی تبدیلی کی یہ تصویر اس مثال سے واضح کی جاسکتی ہے کہ ایک شخص کارخانے کا مالک ہے اور اس نے کارخانے میں کام کرنے کے لیے مزدور رکھے ہوئے ہیں اور اس کارخانے میں مزدور محنت کرتے ہیں اس طرح کارخانہ ترقی کرتا ہے۔ یعنی کارخانے کی ترقی کا دارومدار اس میں کام کرنے والے یا اس کو عروج پر پہنچانے والے مزدور پر ہے۔ لیکن اسی مزدور کو جس کی محنت سے کارخانے میں ترقی ہوئی، اسے اپنے کام کی اتنی سی اجرت بھی نہیں ملتی جس سے مساوات کا نظام قائم ہو۔ بلکہ مزدور وہیں کا وہیں رہ جاتا ہے اور کارخانے کا مالک امیر سے امیر تر ہو جاتا ہے، یوں مزدور طبقہ محنت کے باوجود پسماندگی کا شکار ہوتا ہے۔ اس مکتبِ فکر کے حوالے سے کارل مارکس کی خدمات اہم گردانی جاتی ہیں نیز مارکس کو اس مکتبِ فکر کا بانی کہا جاتا ہے۔ کارل مارکس کے علاوہ فریڈرک، اینجل، ہیگل، رینڈل کالنز، سی رائٹ ملز اور ڈیرنڈورف کی خدمات قابل ذکر ہیں۔

۳۔ تفاعلی مکتبِ فکر (Interactionist School of Thought)

اس مکتبِ فکر کی نظر میں لوگ علامتوں (Symbols) اور زبان (Language) کے ذریعے ایک دوسرے سے تفاعل کرتے ہیں۔ یہ Symbolic Interactionist School of Thought بھی کہلاتا ہے۔ اس نظریے کے تحت معاشرے اور اس کی ساخت کا مطالعہ اس بنیاد پر کیا جاتا ہے کہ لوگ آپس میں کیسے انٹریکٹ کرتے ہیں؟ ان کے باہمی روابط اور رویہ جات کا مطالعہ معاشرے کو سمجھنے کے لیے ضروری ہوتا ہے۔ اس کی مدد سے لوگوں کے مسائل، حالات، جذبات اور ان کی سوچ وغیرہ کا اندازہ لگانے کے لیے چھوٹے پیمانے پر تحقیق کی جاتی ہے۔ یہ مکتبِ فکر دراصل نچلی سطح پر افراد کے درمیان باہمی تعلقات کا مطالعہ کرتا ہے۔ اس مکتبِ فکر کے ماننے والوں کا خیال ہے کہ ماضی میں یا آغاز میں کیا ہوا یہ جاننا اہم نہیں ہے۔ ان کی توجہ کا مرکز کوئی بڑی سطح نہیں بلکہ اس نظریے کے حامی اس بات کو اہمیت دیتے ہیں کہ فردِ واحد پر توجہ دی جائے اور افراد کے باہم ملنے سے جو صورت حال رونما ہوتی ہے اس کا مطالعہ کیا جائے۔ نیز ان کے باہمی تعلقات کس نوعیت کے ہیں ان کا مشاہدہ کیا جائے کہ افراد معاشرے کی سرگرمیوں سے کس طرح متاثر ہوتے ہیں اور کس حد تک اس میں حصہ لیتے ہیں۔

> "Symbolic interactionist approaches are based on a micro level analysis, which focuses on small groups rather than on large-scale social structures...Theorists using this perspective focus on the process of interaction-defined as immediate

reciprocally oriented communication between two or more people and the part that symbols play in giving meaning to human communication. A symbol is anything else. Examples of symbols include signs, gestures, written language, and shared values. Symbolic interaction occurs when people communicate through the use of symbols"(۳۳)

(علامتی تعامل پسندانہ نقطہ نظر جزیات کے تجزیے پر انحصار کرتا ہے، یہ بڑے پیمانے پر سماجی ڈھانچے کی بجائے چھوٹے گروہوں پر توجہ مرکوز کرتا ہے۔۔۔ اس نقطہ نظر کو استعمال کرنے والے نظریہ کار تعامل کے عمل پر توجہ مرکوز کرتے ہیں۔ جس کی تعریف دو یا دو سے زیادہ لوگوں اور اس حصے، جس کی علامتیں انسانی رابطے کو مطلب فراہم کرتی ہیں، کے درمیان فوری اور باہمی رابطے کے طور پر کی جاتی ہے۔ علامت کچھ اور شے ہے۔ علامتوں کی مثالوں میں نشانات، اشارے، تحریری زبان اور مشترکہ اقدار شامل ہیں۔ علامتی تعامل اس وقت ہوتا ہے جب لوگ علامتوں کے استعمال کے ذریعے بات چیت کرتے ہیں۔)

اس نظریے کے تحت معاشرے کا مطالعہ یہ ثابت کرتا ہے کہ لوگوں کے آپس میں ملنے ایک دوسرے کی ضروریات پوری کرنے اور لوگوں کے قریب آنے سے ہی معاشرہ قائم رہتا ہے۔ اگر لوگ آپس میں تفاعل نہ کریں تو معاشرہ رک جائے اور اس میں موجود لوگ محض افراد کا ہجوم ہوں۔ افراد کے باہم تفاعل کرنے کا ذریعہ زبان ہے جو افراد کو کو مختلف رشتوں میں جوڑتی ہے اور اس زبان میں الفاظ کو مختلف معنی بھی لوگ خود عطا کرتے ہیں۔

فرد اور سماج کے باہمی ربط کے حوالے سے مختلف نظریات ہیں۔ ہربٹ اسپنسر گاسر (Herbert Spencer Gasser) نے جہاں انفرادی شعور کا نظریہ پیش کیا وہیں ڈرخائم اور ہیگل کے اجتماعی شعور کے نظریات اہمیت کے حامل ہیں۔ جہاں سماج کی تشکیل میں فرد اور مجموعی طور پر افراد اہم کردار ادا کرتے ہیں وہیں۔ سماج کے فرد پر گہرے اثرات ہوتے ہیں۔ بحیثیت مجموعی اجتماعی زندگی کے مختلف عوامل ایک دوسرے سے مربوط ہوتے ہیں یہی عوامل مل کر معاشرے پر اور معاشرہ فرد پر اثرانداز ہوتا ہے۔

پیش نظر تحقیق کا مقصد چوں کہ تغیر پذیر اقدار کا مطالعہ ہے تو یہاں یہ بات اہم ہے کہ ان نظریات کے تناظر میں وضاحت پیش کی جائے کہ معاشرتی تبدیلی ہی اقدار و روایات کی تبدیلی کا سبب بنتی ہے تو اس تحقیق کے لیے سماجی استحکام کے نظریے کو کیوں مد نظر رکھا گیا؟ اس سوال کا جواب سادہ اور آسان الفاظ میں

یہی ہو سکتا ہے کہ معاشرے میں استحکام پیدا کرنے کے لیے ضروری ہے کہ تغیر پذیر اقدار کا مطالعہ کرنے کے ساتھ ساتھ ان عناصر کا مطالعہ کیا جائے جو معاشرے کی بربادی یا خوش حالی کا سبب بن رہی ہیں۔

ایمائل ڈرخائم تعارف اور نظریہ

انیسویں صدی کا معروف فرانسیسی ماہرِ عمرانیات اور فعلی مکتبِ فکر کا بانی ایمائل ڈرخائم (Emile Durkheim) ۱۵ اپریل ۱۸۵۸ء کو فرانس میں پیدا ہوا اور ۱۵ نومبر ۱۹۱۷ء کو پیرس میں وفات پائی۔ ڈرخائم کا مکمل نام ڈیوڈ ایمائل ڈرخائم ہے۔ معاشرے کی ساخت کے حوالے سے ڈرخائم کے خیالات اس کی شہرت کا سبب بنے۔ آگسٹ کومٹے جو سماجیات کا بانی ہے اس کے افکار و نظریات کو عملی جامع ڈرخائم نے دیا۔ ڈرخائم کی توجہ کا مرکز یہ تھا کہ روایتی اور جدید معاشروں نے کس طرح ترقی کی۔ ڈرخائم کے نظریات کی بنیاد سماجی حقائق پر ہے جو معاشرے کے اصولوں، اقدار و روایات اور معاشرے کی ساخت پر مبنی ہے۔ ڈرخائم کے نظریات کا مطالعہ قاری کو معاشرتی حقائق کے تناظر میں تاریخی تفہیم اور ان کو تنقیدی شکل دینے میں مدد کرتا ہے۔ اس کا ذکر سیون لیوکس (Seven Lukes) کی تحقیق ڈرخائم کی حالات زندگی اور خدمات کا تاریخی اور تنقیدی مطالعہ (Emile Durkheim His life and work,A Historical and Critical Study) میں اس طرح سے ملتا ہے:

> "Study of Durkheim seeks to help the reader to achieve a historical understanding of his ideas and to form critical judgment about their values." (۳۴)

(ڈرخائم کا مطالعہ قاری کو اپنے تصورات کی تاریخی تفہیم حاصل کرنے اور اپنے خیالات کے بارے میں تنقیدی فیصلہ کرنے میں مدد کرنے کی کوشش کرتا ہے۔)

ڈرخائم کا تعلق یہودیوں کے ایک بڑے مذہبی گھرانے راہبین سے تھا اور امید کی جاتی تھی کہ ڈرخائم بھی اس مذہبی وراثت کو سنبھالیں گے۔ لیکن ڈرخائم کا رجحان سیکولر تعلیم کی طرف تھا۔ ڈرخائم نے سائنس کے مضامین میں تعلیم حاصل کی اور مختلف کالجوں میں تدریسی خدمات سرانجام دینے کے بعد بورڈاکیس یونیورسٹی میں فلسفے پر لیکچرز دیے۔ بعد ازاں ۱۸۹۶ میں سماجی سائنس کے پروفیسر مقرر ہوئے۔ ۱۹۰۲ میں ڈرخائم کی تقرری سوربون میں تعلیم کے پروفیسر کے طور پر عمل میں آئی یہاں ۱۹۱۳ میں ڈرخائم پہلے سماجیات کے پروفیسر کے طور پر خدمات سرانجام دیتے رہے۔ ڈرخائم کی ذاتی دل چسپی بھی سائنسی سماجیات میں تھی اور یہ

سماج کا سائنسی مطالعہ کرنے میں دل چسپی رکھتے تھے۔ لیکن اس دور میں سماجیات کو منظم شعبے کی حیثیت حاصل نہ تھی۔ ڈرخائم نے اس کو بطور منظم اور مستقل شعبے کی حیثیت سے متعارف کرانے کے لیے اہم خدمات سر انجام دیں اور نئے تصورات و نظریات سے بھی بہرہ مند کیا۔ آگست کومٹ اور ہربرٹ اسپنسر کے ساتھ ساتھ ڈرخائم کو بھی سماجیات کے بانیوں میں شمار کیا جاتا ہے۔ ایمائل ڈرخائم کے اہم کام ان کی درج ذیل کتب کی صورت میں ملتے ہیں:

۱۔ سماج میں تقسیم کار	The division of labour in society (1893)
۲۔ سماجیاتی تحقیق کے طریقے	The Rules of Sociological Method (1895)
۳۔ خودکشی: ایک سماجیاتی مطالعہ	Suicide: A Study in Sociology (1897)
۴۔ مذہبی زندگی کی ابتدائی شکلیں	The Elementary Forms of Religious Life (1912)

۵۔ Pedagogical Evolution in France یہ کتاب ڈرخائم کی وفات کے بعد ۱۹۳۸ میں منظر عام پر آئی۔ اسی طرح ڈرخائم کی دیگر تحریریں مضامین وغیرہ ان کی وفات کے بعد کتابی صورت میں مرتب کیے جاتے رہے ہیں۔

سماجی استحکام (Social Solidarity)

ڈرخائم نے نظریۂ سماجی یک جہتی کا تصور اپنی کتاب "The division of labour in society" میں پیش کیا ہے۔ اس کتاب کو ڈرخائم نے اپنے پی ایچ ڈی کے مقالے کی حیثیت سے لکھا تھا اور بعد میں باقاعدہ کتابی صورت میں ۱۸۹۳ء میں پیش کیا۔ یک جہتی انسان کے مشترکہ طور طریقوں اور مشترکہ افکار و خیالات کی وجہ سے عمل میں آتی ہے۔ ڈرخائم قدیم اور ترقی یافتہ معاشروں کا تقابل کرتے ہوئے قدیم معاشرے کو میکانی معاشرہ (Mechanical Society) اور ترقی یافتہ معاشرے کو عضوی (Organic Society) کہتا ہے۔ میکانی معاشرے کو دیہی معاشرے سے تشبیہ دی جاسکتی ہے جہاں سماجی تغیر میں مزاحمت پائی جاتی ہے۔ اس معاشرے کے لوگ قدیم رسم و رواج کا مرکز ہوتے ہیں۔ اس کے برعکس عضوی معاشرے کی مثال بلدیاتی معاشرے سے دی جاسکتی ہے جہاں قدیم رواج کی بجائے فیشن کا دور دورہ ہوتا ہے نئی نئی راہیں پائی جاتی ہیں اور سماجی تغیر آسان ہوتا ہے۔ سماجی یک جہتی دراصل اس اجتماعی ضمیر، خیالات اور جذبات کو کہتے ہیں جو سماج میں رچ بس گیا ہو۔ یہ یک جہتی افراد کے مشترکہ افکار و خیالات کی وجہ سے عمل میں آتی ہے اور وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ یہ سماج کی شناخت بن جاتی ہے، جس سے سماج مضبوط اور مستحکم ہوتا ہے۔

خودکشی(Suicide)

خودکشی پر ڈرخائم کی تحقیق صرف معاشرتی مسئلے کا مطالعہ نہیں ہے بلکہ وہ اس کے ذریعے ایک نئی سماجیاتی طرز تحقیق سے روشناس کراتے ہیں۔ عام طور پر لوگوں کا خیال ہوتا ہے کہ خودکشی ایک ذاتی عمل ہے لیکن ڈرخائم نے اسے سماجی عمل قرار دیا ہے اور تحقیق سے ثابت کیا ہے کہ کیسے یہ ایک سماجی عمل ہے۔ فرد خودکشی کیوں کرتا ہے اس میں نفسیاتی عوامل سے زیادہ سماجی حقائق ہی صرف اسے واضح کرسکتے ہیں کہ کیسے فرد پر معاشرتی دباؤ، انفرادی سطح پر بدنظمی یا گروہی بندھن کے کمزور پڑ جانے کی صورت خودکشی ہوتی ہے۔ ایک طبقے کے مقابلے میں دوسرے طبقے میں خودکشی کی تعداد کیوں کم یا زیادہ ہے، اس حوالے سے ڈرخائم نے خودکشی کی مختلف اقسام بیان کی ہیں۔ جن میں ا۔ انائی خودکشی(Egoistic Suicide)، ۲۔ لامعمولاتی خودکشی (Anomic Suicide)، ۳۔ ایثارانہ خودکشی(Altruistic Suicide)

سماجی حقائق(Social Facts)

ایمائل ڈرخائم نے معاشرے، معاشرے کی ساخت اور اس سے منسلک اداروں کا بغور مطالعہ کیا اور اس مطالعے سے حاصل شدہ نتائج کو سائنسی طریقہ کار کے مطابق جانچنے کے لیے نظریات پیش کیے۔ ڈرخائم کے اہم کاموں کے پس پردہ دو مرکزی خیالات بنیادی محرکات بنے ہیں۔ پہلا یہ کہ معاشرے کا مطالعہ سائنسی طریقۂ کار کے مطابق کیا جاسکتا ہے۔ دوسرا معاشرے میں فرد سے زیادہ گروہ اہمیت کا حامل ہے۔ اس سلسلے میں ان کا نظریہ معاشرتی حقائق (Social Facts) کو خاص اہمیت حاصل ہے۔ ڈرخائم کا یہ نظریہ ان کی کتاب "The Rules of Sociological Method" میں بیان کیا گیا ہے۔

> "He saw the domain of sociology as the study of social facts and not individuals. He believed both that societies had their own realities which could not simply be reduced to the actions and motives of individuals, and individuals were moulded and constrained by their social environments. In 1895 he wrote The Rules of Sociological Method, in which he demonstrated that law was a social fact, embodied in formal, codified rules

and not dependent on individuals or on any particular act of law enforcement for its existence."[۳۵]

(اس نے سماجیات کی حدود کو افراد کی بجائے سماجی حقائق کے مطالعہ کے طور پر دیکھا۔ اس کا خیال تھا کہ معاشروں کی اپنی حقیقتیں ہوتی ہیں جنہیں محض افراد کے اعمال اور مقاصد تک محدود نہیں کیا جاسکتا، اور افراد اپنے معاشرتی ماحول کے مطابق ڈھلنے پر مجبور ہوتے ہیں۔ ۱۸۹۵ء میں اس نے معاشرتی طریقہ کار کے اصول لکھے، جس میں اس نے یہ ظاہر کیا کہ قانون ایک سماجی حقیقت ہے، جو رسمی، ضابطہ اخلاق میں مجسم ہے اور اس کے وجود کے لیے افراد یا قانون نافذ کرنے کی کسی شق کا ہونا لازم نہیں ہے۔)

ڈرخائم کے نزدیک معاشرتی حقائق معاشرے کی ساخت اور تہذیبی اقدار و روایات کو کہتے ہیں۔

"Social Facts are the social structures and cultural norms and values that are external to, and coercive of, actors."[۳۶]

(معاشرتی حقائق معاشرے کی ساخت میں پائے جانے والے وہ ثقافتی، اصول و اقدار ہیں جو ان پر عمل پیرا ہونے والوں پر بیرونی طور پر زبردستی نافذ کیے جاتے ہیں۔)

جیسا کہ پہلے بیان کیا گیا ہے سماجیات کا مقصد معاشرتی حقائق یعنی معاشرے اور اس کے اقدار و روایات کا سائنسی مطالعہ ہے۔ یہ وہ معاشرتی حقائق ہیں جو فرد کی استطاعت سے باہر ہوں اور جس پر عمل کرنے کے لیے فرد اپنے آپ کو معاشرتی طور پر مجبور پاتا ہو۔ انسان سماج میں رہتے ہوئے زندگی کے تمام شعبۂ جات کے حوالے سے عمل اور رد عمل کرنے پر مجبور ہوتا ہے۔ مثال کے طور پر ایک ادارے میں ملازمت کے لیے ادارے کے اوقات کار اور کام کے حوالے سے فرد اس کا پابند ہوتا ہے۔ بیماری، خوشی، غمی کی صورت میں بھی ادارے کی پالیسی کے مطابق ہی چھٹی کر سکتا ہے۔ اسی طرح طلبہ جامعات کے قاعدے قانون؛ داخلہ، نصاب، امتحانات وغیرہ کے متعلق فیصلے جو ادارے کی انتظامیہ کی جانب سے کیے جاتے ہیں، ان کا پابند ہوتا ہے۔ بالکل اسی طرح معاشرے میں رہتے ہوئے فرد معاشرے کی اقدار و روایات کا پابند ہوتا ہے۔

ڈرخائم معاشرتی حقائق کے مطالعے پر زور دیتا ہے اور معاشرتی حقائق سے اس کی مراد رویے، اقدار قوانین، رسم و رواج اور عقائد ہیں جن میں معاشرتی ادارے بھی شامل ہیں جو فرد پر بیرونی دباؤ ڈالتے ہیں اور ڈرخائم کا خیال ہے کہ ان حقائق کے مطالعے سے ماہرین سماجیات معاشرے کا تجزیہ کر سکتے ہیں کہ معاشرہ کیسے کام کرتا ہے اور اس میں لوگوں کے رویے، اقدار اور افعال کیسے تشکیل پاتے ہیں کیوں کہ یہ غیر متعین ہیں اور

معاشرتی تبدیلی اور ترقی کے ساتھ ساتھ مسلسل تبدیل ہو رہے ہیں۔ لہٰذا ماہرین کو ان تبدیلیوں کا مطالعہ کرنے کی ضرورت ہے تاکہ وہ جن معاشروں کا مطالعہ کر رہے ہیں ان کے بارے میں گہری سمجھ بوجھ رکھتے ہوں۔ اس مطالعے سے مثبت سماجی تبدیلی کے طریقوں میں نشان دہی کرنے میں مدد ملتی ہے۔

ڈرخائم کے خیالات سے آج بھی ماہرین سماجیات کسی نا کسی طور پر استفادہ کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ جب کہ ماڈرن ازم اور پوسٹ ماڈرن ازم جدید نظریات کی صورت اختیار کر چکے ہیں۔ ڈرخائم کے کام اور معاشرتی حقائق کے نظریے سے متعلق محمد اقبال چودھری لکھتے ہیں:

> "His methodological contribution is in the form of The Rules of Social Facts. Which is still a classical work on sociology and his theoretical contribution to sociology still holds true even today."(۳۷)

(معاشرتی تحقیق کے حوالے سے The Rules of Social Facts ڈرخائم کا ایسا کلاسیک کام ہے کہ سماجیات میں اس کے نظریات اس دور میں بھی اہمیت کے حامل ہیں۔) ڈرخائم کے "معاشرتی حقائق" سے اخذ شدہ نظریے کو نظری دائرہ کار میں بیان کیا گیا ہے۔

د۔ پاکستانی اردو افسانہ (اجمالی جائزہ)

اردو کے ذخیرہ الفاظ میں بیشتر زبانوں کے الفاظ شامل ہیں۔ کچھ تراش خراش کے بعد دخیل الفاظ، کچھ بغیر کسی تبدیلی کے اردو میں شامل کر لیے گئے انہی میں فارسی الاصل "افسانہ" بھی ہے۔ جس کا تعلق فکشن کی دنیا سے ہے۔ "افسانہ" اردو کی افسانوی نثری صنف ہے جو مختصر کہانی کے طور پر نمایاں اہمیت کی حامل ہے۔ دیگر ادبی اصناف کی طرح اردو ادب میں یہ صنف بھی مغرب سے مستعار ہے۔ کہانی کہنے کا فن کچھ نیا نہیں، آج اس قدر ترقی یافتہ دور میں بھی کہانیاں لکھی، پڑھی اور سنی جاتی ہیں۔ البتہ اس کی ہیئت اور موضوعات میں وقت کے ساتھ ساتھ تبدیلی آتی رہی ہے۔ کہانی کاروں نے اس فن میں مختلف تجربے کیے۔ اردو ادب میں آج ہم کہانی تخلیق کرنے کے جس تجربے کو افسانہ کہتے ہیں یہ انگریزی ادب میں Short Story کے ہم پلہ ہے۔ افسانہ جدید دور کی پیداوار ہے۔ افسانہ خالصتاً تخلیقی اظہار ہے اس لیے دیگر مظاہرِ تخلیق کی طرح افسانے میں جمالیاتی تجربہ ایک فطری امر ہے۔ اس جمالیاتی تجربے کے ساتھ ساتھ افسانے کی یہ خصوصیت انتہائی اہمیت کی حامل ہے کہ اس کے موضوعات زمین سے پھوٹتے ہیں اور ایک مخصوص معاشرتی ماحول میں پروان

چڑھتے ہیں۔یوں بلاحجت یہ بات کہی جاسکتی ہے کہ افسانے معاشرتی رسوم ورواج اور اقدار کا سہارا لے کر جنم لیتے ہیں۔ جدید دور میں تہذیبی ارتقا، انسان کی مشینی زندگی اور گوناگوں مصروفیات کے پیش نظر کہانی کہنے کے فن نے بھی ترقی کی منازل طے کیں۔انسان زندگی میں ذہنی اور جذباتی سکون کی تلاش میں مختلف مشاغل اپناتا ہے۔یوں محدود اور مختصر لمحات میں تفریحی مقاصد کے حصول کے لیے فرد جب ادب سے رجوع کرتا ہے تو افسانہ کی صورت اسے ایک ایسی کہانی ملتی ہے جو مختصر وقت اور ایک ہی جست میں اس کے ذوق مطالعہ کو تسکین فراہم کرتی ہے۔ شاعری کی نسبت افسانہ ایک شعوری تخلیقی عمل ہے۔ شعوری تخلیقی عمل اپنے لیے مضامین اپنے ارد گرد کے ماحول سے چنتا ہے۔یوں یہ صنف معاشرے کے حالات وواقعات سے جڑی ہوتی ہے۔سید وقار عظیم نے بھی افسانے کی موجودہ صورت حال اور مستقبل کے ضمن میں اس قسم کے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ افسانہ مصروفیت کے اس دور میں تھکے ہوئے دماغ کو آرام وسکون پہنچانے کا بہترین ذریعہ ہے یہی وجہ ہے کہ روز بروز یہ صنف مقبولیت حاصل کرتی جارہی ہے۔[۳۸]

افسانے کا ارتقا انگریزی ادب میں انیسویں صدی، جب کہ اردو میں افسانہ تحریر کرنے کی ابتدائی کاوشیں بیسویں صدی کے آغاز کے ساتھ ہی ملتی ہیں۔یہ ابتدائی کوششیں مغربی افسانے کی طرز پر کی گئی ہیں۔افسانہ کیا ہے؟ افسانے کے فنی فکری لوازمات کون کون سے ہیں؟ افسانے کا ارتقا کب اور کیسے ہوا؟ افسانے کے مختلف ادوار کون کون سے ہیں؟ افسانے نے ارتقا کے مراحل کن حالات میں طے کیے؟ وغیرہ پر کئی ایک تحقیقی اور تنقیدی مضامین، کتب وغیرہ اردو ادب میں تصنیف وتالیف ہوئی ہیں۔ جن کے مطالعے سے اس صنف نثر (افسانہ) کی ارتقائی تاریخ ایک مستقل، مضبوط اور مربوط انداز میں اجاگر ہوتی ہے۔اردو افسانے کا انسائیکلو پیڈیا "اردو افسانے کی روایت" مرزا حامد بیگ کی جدید تحقیق ہے، جس میں انہوں نے افسانے کی ابتدا ۱۹۰۳ء میں راشد الخیری کے پہلے مطبوعہ افسانے "نصیر اور خدیجہ" کی مخزن میں اشاعت سے جوڑی ہے نیز افسانے کا متن پہلی مرتبہ اس کتاب میں شامل کیا گیا ہے۔ جب کہ مرزا حامد بیگ اس بات کا اعتراف بھی کرتے ہیں کہ ڈاکٹر آغا مسعود رضا خاکی نے اپنی تحقیق میں راشد الخیری کو پہلا اردو افسانہ نگار مانا ہے اور اس کے بعد ڈاکٹر انوار احمد نے اپنے پی ایچ ڈی کے مقالے کے لیے تحقیق کی اور افسانے کا متن تلاش کیا۔[۳۹] اس سے قبل معاصرین کے مقابلے میں فکر وفن کے اعتبار سے بہتر افسانے تحریر کرنے کی بدولت پریم چند اور سجاد حیدر یلدرم کو اردو کا پہلا باقاعدہ افسانہ نگار تسلیم کیا جاتا رہا۔ ان دونوں افسانہ نگاروں کے ہاں اس دور کے دو نمایاں رجحان ملتے ہیں۔ پریم چند حقیقت پسندی کے تناظر میں اس صنف میں طبع آزمائی کرتے

ہوئے نظر آتے ہیں جب کہ یلدرم کے ہاں روایتی رومانوی رجحان ملتا ہے۔ اس دور میں لکھے جانے والے افسانوں میں اصلاحی پہلو نمایاں ہے۔

افسانے میں ایجاز و اختصار کے ساتھ ہر دور کی زندگی کے عصری تقاضوں کو اپنے اندر سمونے کی بھرپور صلاحیت موجود ہے جس کی وجہ سے ادب کے قارئین کو افسانے نے متوجہ کرنے میں کوئی کسر نہ چھوڑی۔ مختلف حالات اور تحریکوں کے سائے میں افسانے نے ارتقائی مراحل طے کیے۔ افسانے کے ان ارتقائی مراحل میں ۱۹۳۲ء میں سجاد ظہیر کا مرتب کردہ مجموعہ "انگارے" ہے۔ اس میں پانچ افسانے سجاد ظہیر کے، دو افسانے احمد علی، اور ایک ایک افسانہ رشید جہاں اور محمود الظفر کا تھا۔ اس کے علاوہ اس میں رشید جہاں کا ایک ڈراما بھی شامل تھا۔ گو کہ اس مجموعے کو خاص مذہبی فرقے کے خلاف تعصب اور فحش قرار دیتے ہوئے ضبط کر لیا گیا مگر یہاں اس مجموعے کا ذکر اس لیے ضروری ہے کہ اس نے اردو افسانے کو بے باکی اور جرات مندانہ لب و لہجہ عطا کیا جو پاکستانی افسانے کے ابتدائی دور میں بھی دیکھنے کو ملتا ہے۔ انگارے کی اشاعت کے بعد ۱۹۳۶ء میں ترقی پسند تحریک کے تحت بھی افسانے کے موضوعات میں تبدیلی رونما ہوئی جس کے نتیجے میں معاشرے کی حقیقی تصویریں پیش کی گئیں۔ اسے پاکستانی افسانے سے کسی طور بھی جدا نہیں کیا جا سکتا۔ اسی کے رد عمل کے طور پر پاکستان میں اسلامی ادب اور پاکستانی ادب کی تحریکوں نے سر اٹھایا۔

قیام پاکستان سے پہلے اردو افسانے کی روایت خاصی ثروت مند تھی اور بعد میں بھی اس صنف میں کیے جانے والے تجربات اور اظہارات میں روز بروز ترقی ہوتی رہی۔ البتہ قیام پاکستان کے بعد جہاں پاکستان میں ہر ذی روح متاثر ہوئی، اردو افسانہ اور اس کے موضوعات میں بھی بڑی تبدیلی رونما ہوئی۔ پاکستانی اردو افسانہ خالص پاکستانی معاشرے اور یہاں کے حالات کا عکاس نظر آتا ہے۔ ادیب معاشرے کے حالات و تغیرات سے متاثر ہوتا ہے اس کے احساسات و جذبات کسی طور پر بھی خود کو معاشرے سے جدا نہیں کر سکتے۔ وجدانی طور پر اس کی تحریریں معاشرے کی عکاس بن جاتی ہیں۔ لہٰذا یہ کہنا بے جا نہ ہو گا کہ کسی بھی دور کے ادب میں معاشرتی اقدار واضح طور پر اپنے عہد کی ترجمانی کرتی ہیں۔ معاشرے اور ماحول کے مختلف پہلوؤں کو اجاگر کرتے ہوئے ادیب نہ صرف اپنی فکری بصیرت قاری تک پہنچاتا ہے بل کہ کسی بھی دور کے افسانوں میں اس دور کی تاریخ کے عملی نمونے دیکھے جا سکتے ہیں۔ تاریخ کا مطالعہ جہاں کسی بھی دور کی تحریری تاریخ سے آگاہ کرتا ہے وہیں ادب کے مطالعے سے اس کی عملی صورتیں بھی دیکھی جا سکتی ہیں۔ قیام پاکستان کے بعد تحریر کیا جانے والا افسانہ جب قاری کی نظر سے گزرتا ہے تو وہ اس عہد کی صورتِ حال، سیاسی و سماجی حالات اور بدلتی

ہوئی قدروں کا آئینہ بن جاتا ہے۔ اس عہد کے افسانے میں تشکیل نو پانے والا معاشرہ اور نئے آہنگ میں ڈھلتی ہوئی قدریں متحرک تصویر کے روپ میں سامنے آ کھڑی ہوتی ہیں جس میں جہاں سماجی زندگی کی حقیقی تصویر پیش کرنے میں افسانے کا کردار بے حد اہم رہا ہے۔ اس حوالے سے محمد علی صدیق لکھتے ہیں:

> "پاکستان کی سماجی زندگی کے مطالعے کے لیے بھی اردو افسانہ نے جس نوع کا مواد ہمارے سامنے رکھا ہے وہ ہماری سماجی تاریخ کا اہم اور حساس ترین باب ہے۔ ہم اردو افسانے کے آئینہ میں پاکستان کی بدلتی ہوئی صورت حال کا جس طرح ادراک کر پاتے ہیں وہ پاکستان کی سیاسی، معاشی اور معاشرتی تاریخ پر تحقیقی کتب کے ذریعے ممکن تو ہے لیکن اس نوع کے مطالعہ میں جس چیز کی کمی رہ جائے گی وہ خود پاکستانی سماج کی وہ جیتی جاگتی تصویر ہو گی جس کے بغیر آنے والے زمانہ کا مورخ خود کو ایک اہم اوزار Tool سے محروم سمجھے گا۔"(۴۰)

قیام پاکستان کے بعد تخلیق ہونے والے افسانوں کا مطالعہ اس دور کے سماجی حالات، اقدار و روایات کی عکاسی اور معاشرے کی حقیقی تصویریں اجاگر کرنے میں معاون ہے۔ قیام پاکستان کے بعد اس صنف میں طبع آزمائی کرنے والوں میں ایسے نام بھی شامل ہیں جو قیام پاکستان سے قبل بھی افسانے تحریر کر رہے تھے اور قیام پاکستان کے بعد بھی انہوں نے افسانے لکھے۔ البتہ اس دور میں لکھے جانے والے افسانوں کے موضوعات میں ہجرت اور فسادات کی عکاسی نمایاں ہے۔ ایک نئے وطن کی تشکیل ایک نئی سماجی صورت حال، اخلاقی قدروں کا زوال، خون ریزی اور معاشرتی قدروں میں واضح تبدیلی اس عہد کے افسانوں میں دیکھی جا سکتی ہے۔ پاکستانی افسانے میں یہ نیا پن ہندوستانی افسانے سے جدا شناخت قائم کرتا گیا۔

پاکستان میں افسانہ تحریر کرنے والوں میں سے چند معروف افسانہ نگاروں میں سعادت حسن منٹو، احمد ندیم قاسمی، محمد حسن عسکری، قدرت اللہ شہاب، غلام عباس، ممتاز مفتی، شوکت صدیقی، خدیجہ مستور، ہاجرہ مسرور، ممتاز شیریں، اشفاق احمد، انتظار حسین اور دیگر نے نئے ملک کے مسائل، ہجرت، ملک کی تعمیر و ترقی، تشکیل وغیرہ کے ساتھ ساتھ سرحد کے دونوں اطراف ختم ہونے والی انسانی قدریں، سرکاری کارندوں کی بے حسی اور بربریت کو بیان کرتے ہوئے اس دور کی سیاسی و سماجی زندگی کو پیش کیا ہے۔ ان ادیبوں نے اس دور کے حالات اپنی تخلیقات میں اس انداز میں پیش کیے ہیں جن سے اس وطن کی تاریخ اور اس دور کے حالات کی بھرپور عکاسی ہوتی ہے۔ اس دور میں تحریر ہونے والے زیادہ تر افسانوں میں فسادات کے ضمن میں

سماج کے کسی ایک پہلو اور بعض افسانوں میں مختلف صورتوں کی مکمل عکاسی کی گئی ہے۔

۱۹۴۷ء کے بعد تحریر ہونے والا افسانہ "ٹوبہ ٹیک سنگھ" سعادت حسن منٹو کا ایک ایسا شاہکار افسانہ ہے جو تقسیم اور نقل مکانی کے کرب کا عکاس ہے۔ یہ افسانہ منٹو کے آخری مطبوعہ افسانوی مجموعے "پھندنے" میں شامل پہلا افسانہ ہے۔ اس دور میں تخلیق ہونے والے افسانے معاشرے میں موجود فرد کی بے بسی، مجبوری، شکست وریخت کی الگ الگ تصویریں پیش کرتے ہیں۔ "ٹوبہ ٹیک سنگھ" اس صورت حال کا مکمل عکاس افسانہ ہے۔ اس دور کے حالات سے جہاں عام انسان اس قدر متاثر ہوا، وہیں وہ نفسیاتی مریض جو ہر طرح کے حالات سے بالاتر ہوتے ہیں، ان پر بھی ہجرت اور تقسیم نے گہرے اثرات مرتب کیے یہ افسانہ اس دور کی سماجی صورت حال کی عکاسی کرنے میں معاون ہے۔ افسانے سے اقتباس ملاحظہ ہو:

> "سخت سردیاں تھیں جب لاہور کے پاگل خانے سے ہندو سکھ پاگلوں سے بھری ہوئی لاریاں پولیس کے محافظ دستے کے ساتھ روانہ ہوئیں متعلقہ افسر بھی ہمراہ تھے۔ واہگہ کے بارڈر پر طرفین کے سپرنٹنڈنٹ ایک دوسرے سے ملے اور ابتدائی کارروائی ختم ہونے کے بعد تبادلہ شروع ہو گیا جو رات بھر جاری رہا۔ پاگلوں کو لاریوں سے نکالنا اور ان کو دوسرے افسروں کے حوالے کرنا بڑا کٹھن کام تھا۔ بعض تو نکلتے ہی نہیں تھے۔ ۔۔پاگلوں کی اکثریت اس تبادلے کے حق میں نہیں تھی۔"(۴۱)

افسانے کے اس اقتباس سے تقسیم کے بعد پیدا ہونے والی سماجی صورت حال، ہنگامہ خیزی اور ہجرت کا وہ الم ناک پہلو جس میں لوگ اپنا سب کچھ چھوڑ کر در در بھٹکنے کے لیے مجبور تھے واضح ہوتا ہے۔ اس معاشرتی خلفشار کی بدولت ہر فرد متاثر ہوا یہاں تک کہ نفسیاتی مریض بھی بے چین ہو گئے۔ منٹو نے ایسے ہی بے شمار افسانے تحریر کیے جو اس دور کے سماج کی حقیقی تصویریں پیش کرتے ہیں۔ افسانوی مجموعہ "سیاہ ہاشیے" کے افسانوں میں بھی تقسیم کی بازگشت سنائی دیتی ہے۔

احمد ندیم قاسمی کے افسانے دیہاتی طرز معاشرت کے عکاس ہیں۔ جس میں پنجاب کے دیہاتی، سادہ لوح، خوش اخلاق اور ملنسار کرداروں کے ذریعے اس دور کے افراد میں پائی جانے والی معاشرتی اقدار اور اخلاقی قدروں کی عکاسی ملتی ہے۔ جہاں ہر فرد مہمان نواز ہے۔ ان کی طرز زندگی، لباس، خوراک اور رہن سہن وغیرہ سادہ ہے۔ کسان، چوپال، فطری مناظر کے بیان کے ساتھ ساتھ شہری زندگی اور معاشرتی مسائل کی عکاسی بھی کی گئی ہے۔ ترقی پسند تحریک کے زیر اثر احمد ندیم قاسمی کے افسانوں میں محنت کش اور محکوم طبقے کی

موثر تصاویر ملتی ہیں۔ ان کے اہم افسانوں میں "گھر سے گھر تک"، "کپاس کا پھول"، "نیلا پتھر" شامل ہیں۔ ان افسانوں میں "پرمیشر سنگھ" تقسیم کی روداد لیے ہوئے ہے۔ تقسیم سے لے کر علامتی افسانے تک احمد ندیم قاسمی کے افسانوں کا مطالعہ معاشرتی تغیر پذیر اقدار کا عکاس ہے۔ جس میں دیہاتی زندگی سے شہری زندگی کا سفر نمایاں ہے۔ ایم۔ خالد فیاض احمد ندیم قاسمی کے آخری دور میں لکھے گئے "کوہ پیما" کے افسانوں پر اظہار خیال کرتے ہوئے تحریر کرتے ہیں:

> "کوہ پیما کے افسانوں میں ایک تبدیل شدہ فضا اور رنگ ملتا ہے۔۔۔اسی حوالے سے احمد ندیم قاسمی کا افسانہ "عاجز بندہ" ایک مخصوص سماج، کلچر اور اس کلچر کی ذہنی صورت کا تخلیقی اظہاریہ بن جاتا ہے۔"(۴۲)

احمد ندیم قاسمی کے افسانوں کا ایک ترتیب سے مطالعہ ان کے عہد اور تغیر پذیر معاشرے کی مختلف صورتوں جن میں دیہی زندگی سے شہری زندگی، مٹی کے برتنوں سے چینی کے برتنوں تک کا سفر غرض سادگی سے تصنع تک معاشرے میں آنے والی تبدیلیوں کا احاطہ کرتا ہے۔

انسانی زندگی اور معاشرتی نظامِ اقدار، زندگی کی تلخیوں، مفلسی اور معاشرتی رواجوں میں بندھے انسانوں کی بے بسی کو غلام عباس نے بھی اپنے گہرے سیاسی اور سماجی شعور کے ساتھ افسانوں میں پیش کیا ہے۔ آنندی، جاڑے کی چاندنی اور کن رس میں شامل ان کے اہم افسانوں میں آنندی، کتبہ، اوور کوٹ، دھنک، سیاہ سفید، وغیرہ ان کے شاہ کار افسانے ہیں۔ ان افسانوں میں طبقاتی کش مکش، خواہشات کی ناآسودگی، نفسا نفسی، جبر اور محرومی کی صرف عکاسی ہی نہیں کی گئی بلکہ قاری پر ان خواہشات کی بے مقصدیت کو بھی غلام عباس نے گہری بصیرت کے ساتھ بیان کیا ہے۔ جیسے "کتبہ" کے مرکزی کردار شریف حسین کی سادہ سی زندگی میں اس کی خواہشات اور ترقی کے خواب دیکھنا اس افسانے کا نہ صرف المیہ ہے بلکہ شریف حسین کے مزار پر لگایا گیا کتبہ قاری کو انسان کے اصل کی جانب جھنجھوڑنے میں اہم کردار ادا کرتا ہے۔ سماج کے تلخ اور ترش حقائق کے بیان اور آنندی میں غلام عباس کی معاشرتی حقیقت نگاری کے حوالے سے انور سدید لکھتے ہیں:

> "اس افسانے کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ غلام عباس نے زندگی، تہذیب اور معاشرے کے بارے میں اپنی طرف سے کچھ نہ کہتے ہوئے بھی سب کچھ کہہ دیا۔ اس نے بقول ن۔م راشد افسانہ پڑھنے والوں کے دلوں میں از سر نو کئی سوال پیدا کر دیے

ہیں۔ کیا خیر و شر کا کوئی مجرد وجود ہے یا یہ دونوں اضافی اقدار ہیں۔ کیا قحبہ خانے کو شہر سے ہٹا کر جنسی آلودگی کو ختم کیا جا سکتا ہے؟ کیا قانون کے تازیانے سے خیر کے فروغ میں کوئی مدد مل سکتی ہے؟۔۔۔ غلام عباس نے یہ افسانہ لکھ کر اخلاق کے اس مصنوعی پردے کو نمایاں طور پر دکھانے کی کاوش کی ہے جو پہلے ہی پھٹا ہوا ہے لیکن جس کے روزنوں سے معاشرہ اپنا چہرہ دیکھنے کی جرأت نہیں کرتا"(۴۳)

آنندی معاشرے کے اس دوغلے پن کو پوری طرح عیاں کرتا جس میں سماج میں پائی جانے والی گندگی جس کو معاشرہ قبول کرنے سے انکاری ہے وہیں یہ پھیلائی ہوئی گندگی اسی معاشرے میں بسنے والے افراد کی ہے معاشرے میں اس گندگی کی حیثیت اسی طرح کی ہے جیسے دیگر برائیاں جن کو انسان بظاہر برا جانتا ہے لیکن ان کو ترک کرنا اور ان کے بغیر گزارہ کرنا اس کے معاشرتی تضاد کو عیاں کرتا ہے۔ اس عہد میں لکھے جانے والے افسانوں میں گھٹن زدہ ماحول، نچلے طبقے کے مسائل، جنسی استحصال کی مختلف صورتیں عیاں ہیں۔ افسانہ نگاروں نے اپنے خاص اظہاریے میں افسانے تخلیق کیے۔ اشفاق احمد نے زیادہ تر اخلاقی اور اصلاحی افسانے لکھے جن میں محبت اور امن کا پیغام دیا۔ ان کا افسانہ "گڈریا" اور "بابا" فسادات کے پس منظر میں تحریر کیا گیا ہے۔ اسی طرح جمیلہ ہاشمی کا افسانہ "بن ماس"، ہاجرہ مسرور کا افسانہ "امت مرحوم" اور بڑے انسان بنے بیٹھے ہو"، عبداللہ حسین کا افسانہ "ماجرین"، "جلا وطن" اس کیفیت کو پیش کرتے ہیں۔ غرض اس دور کے لکھنے والے معروف ادیب ہوں یا غیر معروف ہر ایک نے ہجرت اور فسادات کی سفاکیوں اور درندگی کو اپنی تحریروں میں پیش کیا جن میں بڑے بزرگوں، بچوں اور بطور خاص خواتین کی بے حرمتی کو فن کے آئینے میں ڈھالتے ہوئے معاشرے کی تلخ تصویریں پیش کی گئیں۔ اسی صورت حال نے پاکستانی ادب کو وہ مواد فراہم کیا جس سے اس کی الگ شناخت قائم ہو سکی۔ پاکستان کے حالات تقسیم کے بعد کا کچھ عرصہ گزر جانے کے بعد بھی ساز گار نہ ہو سکے۔ جہاں ہجرت کا کرب اور فسادات کا المیہ تقسیم کے ابتدائی سالوں میں پاکستانی افسانے کا موضوع رہا، وہیں پاکستان کے بدلتے ہوئے حالات نے افسانے کو نئے موضوعات اور تکنیک کے مختلف تجربات سے آشنا کیا۔ پاکستان کے غیر مستحکم سیاسی و سماجی حالات (جس میں ۱۹۶۵ء میں ہونے والی پاک بھارت جنگ، ۱۹۷۱ء میں سقوط ڈھاکہ کا المیہ، جمہوری نظام کی جگہ آمریت مارشل لا:۱۹۵۸ء، ۱۹۶۹ء، ۱۹۷۷ء، ۱۹۹۹ء) جس کے نتیجے میں معاشرتی اداروں میں آنے والی بڑی تبدیلیاں معاشرتی تغیر کا موجب بنی۔ مارشل لا کے ہر دور نے عوام کو خاص طور پر متاثر کیا۔ اس کے اثرات معاشرے کے حساس افراد، جن میں ادیب طبقہ شامل

ہے، ان پر بھی مرتب ہوئے کیوں کہ اظہار پر پابندیاں عائد کر دی گئیں۔ اس دور کے افسانے میں بھی علامتی اور مزاحمتی انداز اختیار کیا گیا۔ پاکستانی اردو افسانے میں ۶۰ اور ۷۰ کی دہائی میں نہ صرف معاشرتی تغیر پذیری نمایاں نظر آتی ہے بلکہ اس دور کے افسانوں میں روایت سے واضح انحراف بھی موجود ہے کیوں کہ قومی اور بین الاقوامی سطح پر ۱۹۶۰ء اور ۱۹۸۰ء کے درمیان سیاسی اور سماجی حالات میں ایسی تبدیلیاں رونما ہوئی جس سے ساری دنیا شدید متاثر ہوئی۔ اس دور میں تخلیق ہونے والے افسانے خوف، تنہائی، انتشار، شناخت کا مسئلہ، مشینی زندگی کے بعد بڑھتی ہوئی مایوسی اور دل شکستگی کی کیفیات کو نمایاں کرتی ہے۔ اس دور میں اظہار کے لیے علامتی اور تجریدی انداز اختیار کیا گیا ہے۔ جس کی عمدہ مثال انتظار حسین کا افسانہ "آخری آدمی" ہے۔ اس افسانے میں انسان کی مادیت پسندی پر غالب اخلاقی اور روحانی زوال کی کہانی ملتی ہے۔ جو "الیاسف" کے کردار کے ذریعے پیش کی گئی ہے۔ یہ کہانی انتظار حسین کے خاص داستانوی اسلوب اور علامتی انداز میں بیان کردہ انسانوں کے بندر بن جانے کی کہانی ہے کہ کیسے انسان اپنے لالچ، حرص و ہوس کی چکا چوند میں اتنا کھو جاتا ہے کہ روحانیت کا زوال اس کے معاشرتی زوال کے مقابل آجاتا ہے۔ "الیاسف" افسانے کا کردار جو معاشرے کا وہ آخری آدمی ہے جو سب سے آخر میں بندر بنتا ہے، معاشرے میں رہ کر جہاں ہر کوئی برائی میں ڈوبا ہوا تھا وہاں ان کی حالت دیکھنے کے بعد الیاسف اپنے اندر کی برائی سے بچنے کی کوشش کرتا ہے اور اپنی ذات سے لڑنے اور خود کو بندر بننے سے بچانے کی کوشش کرتا ہے مگر جب اپنی ذات کی اصلیت اسے پانی میں نظر آتی ہے وہ چیخ اٹھتا ہے۔ افسانے سے اقتباس ملاحظہ ہو:

> "الیاسف کو بستی کے خالی اور اونچے گھروں سے خفقان ہونے لگا۔۔۔ جھیل کے کنارے بیٹھ کر اس نے پانی پیا، جی ٹھنڈا کیا۔۔۔ اسے پانی میں اپنی صورت دکھائی دے رہی تھی۔ اس کی چیخ نکل گئی اور الیاسف کو الیاسف کی چیخ نے آلیا اور وہ بھاگ کھڑا ہوا۔"(۴۴)

اقتباس سے بہ خوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ فطرت کے بنائے گئے اصولوں سے منکر ہو کر اپنے ہی کارناموں کی بدولت انسان نے اپنے لیے جو راہیں منتخب کی بعد میں خود ہی ان سے خائف ہونے لگا۔ جیسا کہ اقتباس میں خالی اور اونچے گھر، جو ہر فرد کی خواہش رہی، ان کو پا لینے کے بعد بھی انسان کی تشفی نہ ہو سکی۔ انتظار حسین نے چند اشخاص کے بدلتے ہوئے نفس کو بیان کر کے پورے معاشرے کے افراد کی بدلتی ہوئی روحانی صورت حال کو پیش کیا ہے۔ دنیاوی چیزوں اور ہوس پرستی میں گر کر لوگ اپنی آخرت کو بھول بیٹھے ہیں اور انسانی وجود سے دور بھاگ کر مادی اشیا زمین، زر، قصر اور محلوں سے دل لگائے بیٹھے ہیں جس سے انسان کی

روحانی اور اخلاقی اقدار مسمار ہو رہی ہیں۔ افسانہ بندر کہانی علامتی پیرائے میں لکھا ہوا ایک ایسا افسانہ ہے جس میں موجودہ معاشرے کے نوجوان طبقے کو اپنے مشرقی کلچر سے کنارہ کشی کر کے مغربی تہذیب کی طرف راغب ہوتے دکھایا گیا ہے۔ انسانوں کی تقلیدی روش کو بندر کی نقالی کے علامتی پیرائے میں بیان کیا گیا ہے۔ تنہائی کا کرب اور وجود کی شناخت کا مسئلہ انتظار حسین کے اس دور میں لکھے گئے افسانوں کا اہم موضوع رہا۔ انتظار حسین کے ہاں اس سے قبل تحریر کردہ افسانوں میں ہجرت کا کرب، ماضی کی یادوں میں تہذیب و تمدن، اخلاقیات اور معاشرتی اقدار ایک بہترین نظام زندگی کے روپ میں ملتی ہیں۔ اس کی وضاحت کے لیے حامد رضا صدیقی کی تحریر ملاحظہ ہو جو انہوں نے انتظار حسین کے افسانوں کے مطالعے کے بعد قلم بند کی ہے۔

> "انتظار حسین نے اپنے ابتدائی دور میں چھوٹے چھوٹے گاؤں کی کچی سڑکوں، گلی کوچوں، کھیت کھلیان، مندر، مسجد، کوچہ و بازار۔۔۔ جیسے مختلف رنگ کے تہذیبی بیانیہ کو پیش کیا ہے۔ مگر اس کے بعد وہ اپنے تیسرے افسانوی مجموعے "آخری آدمی" سے اپنی افسانوی تخلیق میں ایک نیا موڑ لیتے ہیں اور یہاں سے وہ۔۔۔ انسان کے باطن کی جانچ پرکھ شروع کر دیتے ہیں۔۔۔ انتظار حسین یہاں سے انسان کے اخلاقی و روحانی زوال کو اپنا موضوع بناتے ہیں۔"(۴۵)

انتظار حسین کے افسانے جہاں ماضی سے رشتہ استوار رکھتے ہوئے نظر آتے ہیں وہیں حال کے تہذیبی زوال کے عکاس ہیں۔ ۱۹۷۸ میں شائع ہونے والا مجموعہ "گواہی" (جس کے مرتب اعجاز راہی ہیں) ان ۱۴ افسانوں پر مشتمل مجموعہ ہے جو اس دور کے ظلم و ستم اور جبریت کے خلاف مزاحمتی ردعمل کا نمائندہ ہے۔ جس میں نہ صرف معاشرتی قدروں میں واضح تبدیلی کی جھلک ملتی ہے بلکہ اس تبدیلی سے ادیب کس طرح متاثر ہوا اور اس نے روایت سے انحراف کرتے ہوئے نئے بیانیہ کو اظہار کا وسیلہ بنایا اس کا بھی عکاس ہے۔ اعجاز راہی اس مجموعے کے ابتدائیہ میں تحریر کرتے ہیں کہ:

> "قدروں کے زوال کی صورت حال سے جس طرح آج کا لکھنے والا دوچار ہوا ہے شعور کی آنکھ نے یہ منظر نہ دیکھے تھے۔ بنجر شباہتوں کی دہلیز پر ہر شے پہچان کے لبادے اتار چکی ہے کہ آمریت پسندی نے خوف و دہشت کے جن صحراؤں کو ذہن کی وادیوں میں دھکیل دیا ہے یہی پرانے رویوں سے بغاوت کے ایک نئے رجحان کی علامت بنا۔"(۴۶)

یہ مجموعہ سیاسی جبریت، بے انصافی، خوف اور استحصال، خاص طور پر پاکستان کی سیاست میں ہونے والی نمایاں تبدیلیوں اور مارشل لا کے باعث پیدا ہونے والے مسائل کا علامتی اظہاریہ ہے۔ اس مجموعے کے

افسانوں میں علامتی پیرائے میں نہ صرف احتجاج کیا گیا بلکہ بھرپور مزاحمت کے اعلیٰ نمونے دیکھنے کو ملتے ہیں۔ یہ صورت حال معاشرتی قدروں میں واضح تبدیلی کا باعث بنی۔ ڈرخائم کے نظریے کے مطابق ان افسانوں کے مطالعے سے بہ خوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ کیسے معاشرے کے ایک ادارے میں پیدا ہونے والی خرابی یا تبدیلی پورے معاشرے کو متاثر کرتی ہے۔ اس دور میں نہ صرف انتشار کی مختلف صورتیں دیکھی جا سکتی ہیں بلکہ معاشرتی اقدار کے زوال سے پیدا ہونے والے مسائل بھی افسانے کا موضوع رہے۔ اس عہد میں لکھنے والے مشہور افسانہ نگاروں میں ہاجرہ مسرور، خدیجہ مستور، جیلانی بانو، خالدہ حسین، واجدہ تبسم، احمد جاوید، ڈاکٹر انور سجاد، احمد داؤد، منشایاد، رشید امجد، اعجاز راہی، مرزا حامد بیگ، مظہر الاسلام، اسد محمد خان وغیرہ شامل ہیں۔ ان کے افسانے داخلی کیفیات اور خارجی احوال کو علامتوں اور استعاروں کے ذریعے بیان کرنے پر قدرت رکھتے ہیں۔ ان افسانہ نگاروں نے اپنے عہد کا آئینہ حالات کے تسلسل کے ساتھ ایسے پیش کیا کہ علامت اس عہد کا عکس بن کر ابھری۔ ان چند افسانہ نویسوں کے علاوہ بیسویں صدی کے آخری دو عشروں میں جو افسانہ نگار ابھر کر سامنے آئے ان میں نیلوفر اقبال، محمد الیاس، پروین عاطف، ابدال بیلا، فرحت پروین، اصغر علی جاوید، امجد طفیل، عباس خان کے نام خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ ۱۹۹۹ء تا ۲۰۰۷ء تک؛ رشید امجد کا مرتب کردہ مجموعہ "مزاحمتی ادب (اردو)" جو اکادمی ادبیات سے شائع شدہ ہے۔ اس کے حصہ اول میں شامل منتخب افسانے گواہی کے افسانوں کی طرح مزاحمتی آوازیں ہیں۔ اس عہد کی سماجی صورت حال اور اقدار و روایات میں تغیر اس مجموعے میں شامل افسانوں کے ذریعے بہ خوبی عیاں ہوتا ہے۔ پاکستان کے مسلسل بدلتے حالات کا جائزہ لینے میں یہ مجموعہ معاون و مددگار ہے اور ان جابرانہ حالات کے خلاف ادیب کی جانب سے احتجاج دیکھنے کو ملتا ہے۔ مثال کے طور پر اس مجموعے میں شامل پہلا افسانہ "کہر" "آصف فرخی" کا افسانہ ہے جس میں کراچی کے حالات، سیاسی و سماجی مسائل، اخبار اور ٹی وی کی سرخیاں، جو فرد کے ذہنی سکون میں رکاوٹ کا باعث ہیں، آصف فرخی نے تخلیقی اظہاریے افسانے کی صورت قلم بند کیے۔ افسانے سے اقتباس ملاحظہ ہو۔

> "ایک جگہ سے خبریں آ رہی تھیں۔۔۔ میں نے روک کر دیکھا۔ وہی سرخیاں!" صدر کا پارلیمنٹ کے مشترکہ اجلاس سے خطاب۔ اپوزیشن کے لیڈر ڈیسک بجا بجا کر نعرے لگا رہے ہیں۔۔۔ گو مشرف گو۔۔۔ تامل ناڈو میں شادی ہال میں آگ لگ گئی۔ عراق میں خودکش بم دھماکے۔۔۔ وہی روز روز جیسی خبریں۔"(۴۷)

افسانے کے اس اقتباس سے قومی اور بین الاقوامی سطح پر پائے جانے والے حالات جن سے انسان پوری طرح سے زچ آچکا تھا اجاگر ہوتے ہیں۔ اس افسانے کی کہانی بیانیہ انداز میں اس دور کے حالات کی عکاسی کرتی ہے۔ فرد کی مایوسی اور خوف کی کیفیات افسانے میں اس وقت رونما ہوتی ہیں جب کہانی کار کی بیوی گھر سے باہر نکلنے میں بھی خوف محسوس کرتی ہے۔ ملکی اور سیاسی حالات ٹی وی اور اخبار کی سرخیوں پر گردش میں ہیں۔ جہاں افسانے میں خاص طور پر کراچی کے حالات کی عکاسی کی گئی ہے وہیں ہمیں تغیر پذیری تین مختلف سطحوں پر دیکھنے کو ملتی ہے ایک وہ حالات جو مصنف کے مطابق تبدیل ہو چکے جس کا ذکر افسانے میں بھی کیا گیا ہے کہ اب موسم بھی بدل گیا ہے اور شہر بھی۔ دوسرا وہ حالات ہیں جو اس دور میں پائے جاتے ہیں جن کا موازنہ دور حاضر سے کیا جائے تو تبدیلی نمایاں ہوتی محسوس ہو گی۔ جیسا کہ افسانے کی کہانی میں صبح صبح اخبار کا آنا، ٹی وی پر دو چار چینلز کا وجود، بچی کا کارٹون لگانا وغیرہ یہ وہ حالات ہیں جو آج کے سوشل میڈیا کے دور میں یکسر بدل چکے ہیں۔

۱۹۴۷ء میں تشکیل پانے والے پاکستانی معاشرے اور دور حاضر میں معاشرتی صورت حال کا جائزہ لیا جائے تو پے در پے ہونے والے حادثات و واقعات، سیاست، معاشی ترقی وغیرہ کے عروج وزوال نے معاشرے کو یکسر تبدیل کر دیا۔ مختلف رکاوٹوں اور مسائل کے برعکس ترقی پذیر ممالک میں پاکستان بھی شامل ہے جو ملک و قوم کی خوش حالی کے لیے مسلسل کوشاں ہے۔ گو پاکستان کے سیاسی حالات کے پیش نظر ادیب کے آزادئ اظہار پر بارہا قدغن لگائی گئی مگر اس کے باوجود افسانوں میں معاشرے کا پورا پورا وجود ادیب کی بھرپور صلاحیتوں کے ساتھ عیاں ہوتا ہے۔ پاکستان میں دیہی معاشرہ ہو یا شہری زندگی ہر سطح پر وطن پاکستان کے قیام سے لے کر اب تک کا معاشرہ، رسم و رواج، انداز ہائے زندگی، اقدار و روایات، افراد کی ترجیحات، رہن سہن وغیرہ میں واضح تبدیلی دیکھی جا سکتی ہے۔ اس تغیر پذیری کو اجاگر کرنے کے لیے یہاں چند مشہور افسانوں سے مثالیں پیش کی جا رہی ہیں: ۱۹۶۸ء میں منظر عام پر آنے والا قدرت اللہ شہاب کا مشہور افسانوی مجموعہ "ماں جی" ہے۔ اس میں شامل افسانہ "ماں جی" اس قدر مقبول ہوا کہ شہرت کی بلندیوں تک جا پہنچا۔ یہ افسانہ عظمت اور فضیلت کی مجسم تصویر ہے جو قدرت اللہ شہاب کے آخری دور میں تحریر کردہ افسانوں میں شامل ہے اس وقت ان کا فن پختہ ہو چکا تھا۔ جہاں قدرت اللہ شہاب اس افسانے میں معاشرے کے تلخ حقائق اجاگر ہوتے ہوئے نظر آتے ہیں وہیں اس دور کی سادہ طرز زندگی اور معاشرتی اقدار نمایاں ہوتی ہیں۔ ماں جیسا عظیم کردار سادگی کا پیکر اور اخلاقیات کا نمونہ ہے۔ افسانہ شعور کی رو تکنیک کے تحت بیانیہ انداز میں لکھا

گیا ہے جس میں صیغہ واحد متکلم مصنف ہے جو اپنی ماں کی محنت و عظمت کا اعتراف کرتے ہوئے غیر محسوس انداز میں اس دور کے معاشرے کی خوب عکاسی کرتا ہے۔ مثلاً ماں جی کے پاس پہننے کو صرف تین جوڑے تھے جن کو وہ خاص اہتمام سے رکھتیں۔ اسی طرح اگر پہننے کو اور جوڑا آجاتا تو وہ ضرورت مند کے حوالے کر دینا، کپڑے استری کرنے کے لیے دھو کر تکیے کے نیچے رکھ دینا، سادہ غذا کا استعمال، بچوں اور عزیزوں کا بھلا کرنا، اپنے کام خود کرنا، مسجد کے چراغ میں تیل کا اہتمام وغیرہ پورے افسانے میں اس دور کی سادگی، ملنا جلنا اور آج کے دور سے ایک مختلف معاشرہ نظر آتا ہے۔ یہ افسانہ مکمل طور پر معاشرتی اقدار کی تغیر پذیری کو اجاگر کرتا ہے۔ افسانے سے مثال ملاحظہ ہو:

"پچھلی صدی کے بڑے بوڑھے سات سمندر پار کے سفر کو بلائے ناگہانی سمجھتے تھے۔"(۴۸)

دور حاضر میں ہر شخص گرین کارڈ کے حصول کے لیے کوشاں ہے۔ ہر فرد پاکستان سے باہر جانے اور وہاں کی آسائشوں اور حالات سے متاثر ہے جب کہ کچھ عرصہ پہلے تک وطن کو چھوڑنے کے بارے سوچنا بھی معیوب سمجھا جاتا تھا۔ یہاں افسانہ نگار نے مہارت سے اقدار کی تغیر پذیری کو بیان کیا ہے۔ اسی طرح افسانے کے اختتام پر بھی معاشرتی اقدار المیے کا روپ اختیار کر لیتی ہیں جب مصنف کو ماں کی فاتحہ اور قرآن خوانی کے موقع پر ماں کی سادہ غذا مکئی کی روٹی اور نمک مرچ کی چٹنی یاد آتی ہیں، جب کہ معاشرہ پلاؤ اور زردے کا اہتمام لازمی قرار دیتا ہے۔ عبداللہ حسین کے افسانوں میں بھی تاریخی اور عصری آگاہی ملتی ہے۔ ۱۹۸۱ء میں منظر عام پر آنے والے افسانوی مجموعہ "نشیب" کے افسانوں میں معاشرتی نشیب و فراز، فکرِ معاش اور ایسے معاشرتی مسائل اجاگر کیے گئے ہیں جو پاکستانیوں کو سمندر پار سفر کرنے پر مجبور کرتے ہیں۔ اس کے پس پردہ محرکات میں جہاں پہلے روزگار کا حصول تھا وہیں پچھلے کچھ عرصے میں پاکستان میں ہونے والے دہشت گردی کے واقعات، معاشرے کے امن و سکون کی تباہی اور بدحالی جیسے محرکات بھی دیار غیر میں جا بسنے کا سبب بنے۔ خالد جاوید کا افسانہ "پیٹ کی طرف مڑے ہوئے گھٹنے" اپنے طویل بیانیے میں قدروں کے بدلتے ہوئے مایوس کن منظر نامے پر تخلیق کیا گیا ہے۔ خالدہ حسین کے افسانوں کا مطالعہ ان کے کرداروں کی نفسیات اور وجود کی تلاش کا پیش خیمہ ہیں۔ ان کے افسانوں میں آج کی پڑھی لکھی عورت کے مقابلے میں آج سے نصف صدی پہلے کی مظلوم عورت کے مسائل ملتے ہیں۔ ان کے افسانوی مجموعے "مصروف عورت" کے افسانے اس صورت حال کے مکمل عکاس ہیں۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ انہوں نے بڑی مہارت سے اپنے عہد کے مسائل کو بھی موضوع بنایا ہے جس سے ان کے عہد اور معاشرے کے زیر و بم اجاگر ہوتے ہیں۔ ان حالات کو انہوں

نے پیش کرنے میں کوئی کسر نہ چھوڑی۔ مشینی ماحول کی برق رفتاری سے پیدا ہونے والے مسائل نے فرد کو کیسے اپنی گرفت میں لے رکھا ہے اس کی عکاسی ان کے افسانوں درخت، ایکشن ری پلے، آخری سمت، پہچان، ایک رپورتاژ وغیرہ میں کی گئی ہے۔ جس سے معاشرے کے بدلتے ہوئے حالات کی وجہ سے فرد کی بڑھتی ہوئی بے یقینی، عدم اعتماد اور بیگانگی کی فضا وجود میں آتی ہے۔ حسن منظر کے افسانوں میں سائنسی ترقی سے متاثر ہونے والے عہد کی تبدیلیوں کا بیان جابجا ملتا ہے۔ ان کے موضوعات معاشرے کے ترجمان اور تغیر پذیر معاشرے کے عکاس ہیں۔ ان کا افسانہ زمین کا نوحہ فرد کی بدلتی خواہشات کا مکمل عکاس ہے افسانے کے آغاز میں اخباروں میں بدلتے اشتہاروں کے ذریعے اقدار کا تغیر عیاں ہوتا ہے۔ لوگوں کی پرانی سوچ کو نئی فکر پر حاوی ہوتے ہوئے دیکھا جاسکتا ہے۔ افسانے سے اقتباس دیکھیے:

> "اب کالم نگاروں کی جگہ اخباروں میں سائنس دانوں نے لے لی تھی اور کالم نگاروں کا کام ان کی تحریر کی نوک پلک سنوارنا اور اسے عام فہم بنانا رہ گیا تھا۔ ہر طرف جینیٹکس کا زور تھا۔ جین اور کروموسومز کے الفاظ اب گاؤں والوں کے لیے بھی نئے نہیں رہے تھے اور اکثر ایکس وائی (X-Y) اور ایکس ایکس (X-X) کے بارے میں پوچھ بیٹھتے تھے کہ یہ کیا ہوتے ہیں۔"(۴۹)

حسن منظر صرف اپنے ماحول کی عکاسی ہی نہیں کرتے بلکہ موجودہ حالات کے تناظر میں امکانی نتائج کی نشاندہی بھی کرتے ہیں۔ علامتی کہانیوں کے برعکس بیسویں صدی کے آخری عشرے میں عصری آگاہی کے لیے استعاروں اور علامتوں کے بجائے حقیقت کا اظہار سادہ اور سہل زبان میں کیا گیا ہے۔ جو ہمیں حسن منظر کے افسانوں میں بھی دیکھنے کو ملتا ہے۔ بیسویں صدی کے افسانوں کا مطالعہ عہد بہ عہد تغیر پذیر معاشرے کو عمدگی سے پیش کرتا ہے جو دیہات اور دیہاتی ماحول سے شہری اور مشینی زندگی کی طرف رواں دواں ہے۔ فرد کی مشینی اور میکانکی زندگی کو وقت کے تقاضوں کے ساتھ ہم آہنگ کرنے اور مسرت بخشنے کا ذریعہ ڈاکٹر فرمان فتح پوری کے مطابق صرف اور صرف افسانہ ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

> "آج کے اردو افسانے نے لمحہ بہ لمحہ بدلتی زندگی کے ہر روپ بہروپ کو اپنے اندر جذب کر لیا ہے اور کچھ اس طرح جذب کر لیا ہے جیسے مشینی زندگی کا لایا ہوا تہذیبی انقلاب اسی کے فروغ کے لیے رونما ہوا ہے۔"(۵۰)

گو کہ یہ درست ہے اردو افسانہ بدلتے ہوئے حالات کے ہر پیکر کو مہارت کے ساتھ خود میں سموتا چلے جارہا ہے ۔ جس میں پاکستانی معاشرے کے سیاسی و سماجی حالات، معاشرتی قدریں اور معاشرتی تبدیلیاں صاف نظر آتی ہیں۔ بحیثیت مجموعی جہاں پاکستانی اردو افسانہ آزادی کے بعد کے مسائل، ہجرت، فسادات اور پھر فرد کی بے بسی کی داستان لیے ہوئے ہے وہیں پاکستان میں گوناگوں پیدا ہونے والے سیاسی، سماجی مسائل، انتشار، ظلم و بربریت، صنعتی ترقی اور فرد کے احساس تنہائی کو بیان کرتا ہے۔ ان حالات و واقعات، جذبات و احساسات کے بیان سے پاکستانی معاشرے کی واضح صورت حال جس میں دیہی معاشرے، جاگیر دارانہ نظام اور سرمایہ دارانہ نظام کی عکاسی، اقدار و روایات کا بیان، سقوط ڈھاکہ، تغیر پذیر صورت حال وغیرہ عہد بہ عہد افسانے کے مطالعے سے عیاں ہوتی ہے۔

حوالہ جات

۱۔ محمد عبد اللہ خان خویشگی، فرہنگِ عامرہ، مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد، ۱۹۸۹ء، ص ۴۶۸

۲۔ فیروز الدین، مولوی، فیروز اُللُغات اردو جامع، فیروز سنز پرائیویٹ لمیٹڈ، راولپنڈی، ۲۰۱۰ء، ص ۹۵۰

۳۔ اردو لغت (تاریخی اصول پر) جلد اول، ترقی اردو بورڈ، کراچی، ۱۹۷۷ء، ص ۲۳۴

۴۔ نور الحسن نیر، مولوی، نور اللغات (جلد دوئم)، نیشنل بک فاؤنڈیشن، اسلام آباد، ۲۰۰۶ء، ص ۸۳۹

۵۔ وارث سرہندی، علمی اردو لغت، علمی کتاب خانہ، لاہور، ۱۹۷۹ء، ص ۱۱۷

۶۔ جمیل جالبی، قومی انگریزی اردو لغت، مقتدرہ قومی زبان، پاکستان، ص ۲۲۲۰

۷۔ کلیم الدین احمد، پروفیسر، فرہنگ ادبی اصطلاحات، ترقی اردو بیورو، نئی دہلی، ۱۹۸۶ء، ص ۱۹۸

۸۔ انور جمال، پروفیسر، ادبی اصطلاحات، نیشنل بک فاؤنڈیشن، اسلام آباد، ۲۰۱۲ء، ص ۲۶

۹۔ ابو الاعجاز حفیظ صدیقی (مرتب)، کشاف تنقیدی اصطلاحات، ادارہ فروغ قومی زبان، اسلام آباد، ۲۰۱۸ء، ص ۳۰

۱۰۔ فیض احمد فیض، میزان، اردو اکیڈمی سندھ، کراچی، ۱۹۸۷ء، ص ۱۲

۱۱۔ Gordon Marshall, A Dictionary of Sociology, Oxford University Press, 1998, P.690

۱۲۔ Turner, The Penguin Dictionary of Nicholas Abercrombie, Stephen Hill, Bryan S. Sociology (Fifth edition), Penguin Books Ltd, England, P. 409

۱۳۔ Shankar Rao, C.N, Sociology Principles of sociology with an introduction to social thought (seventh edition), P. 469

۱۴۔ Samita Manna, Professor, Suparna Chakarborti, Values and ethics in business and profession, PHI Learning Private limited, New Delhi, 2010, P. 2

۱۵۔ https://www.researchgate.net/publication/273851080_Social_Values_and_Value_Education,Date15march2022

۱۶۔ عمرانہ خاتون، اردو ادب اور انسانی اقدار کی بازیافت (مضامین)، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی، ۲۰۱۶ء، ص ۷

۱۷۔ Richard T. Schaefer, Sociology (9th edition) The Mc Graw. Hill companies, New York,1983, P. 67

۱۸۔ Archana Singh, The Process of Social Value Creation, Springer prt.ltd, India, 2016, P. 53

۱۹۔ عبدالرحمن بن خلدون، رئیس المورخین، علامہ، مقدمہ ابن خلدون، مترجم، علامہ راغب رحمانی دہلوی، نفیس اکیڈمی، کراچی، ۲۰۰۱، ص۷۹

۲۰۔ قاسم یعقوب، زبان اور سماج، کتابی دنیا، لاہور، ۲۰۲۴ء ص ۶۷

۲۱۔ Bryan S. Turner, The Cambridge Dictionary of Sociology, Cambridge University Press, 2006, P.592

۲۲۔ ابوالاعجاز حفیظ صدیقی (مرتب)، کشاف تنقیدی اصطلاحات، ادارہ فروغ قومی زبان، اسلام آباد، ۲۰۱۸، ص ۲۴۴

۲۳۔ Kingsley Davis, Human Society, Surjeet Publications, India, 2007, P. 621-622

۲۴۔ Theodore Caplow, Elementary sociology, university of Virginia P.626

۲۵۔ Vincent N. Parrillo, Encyclopedia of Social Problems, Sage publication, London, P.863

۲۶۔ Shankar Rao, C.N, Sociology Principles of sociology with an introduction to social thought (seventh edition), P.489

۲۷۔ محمد فاروق، ڈاکٹر، پاکستانی سوسائٹی، وقاص پرنٹنگ پریس، فیصل آباد، ص ۸۶

۲۸۔ عارف ثاقب، ڈاکٹر، بیسویں صدی کا ادبی طرز احساس، اظہار سنز پرنٹرز، لاہور، ۱۹۹۹ء، ۶۲

۲۹۔ Craig Calhoun, Light, Keller, Understanding Sociology , Glencoe McGraw-Hill, New York , P.7

۳۰۔ John J. Macionis, Sociology, 14th Ed., Pearson, New York, P.12

۳۱۔ Margaret L.Anderson, Howard F.Taylor, Kim A. Logi, Sociology the essentials, Cengage Learning, America,2015, P.21

۳۲۔ ایضاً، ص ۲۱

۳۳۔ Diana Kendall, Sociology In Our Times, eighth edition, Wadsworth Cengage Learning, Canada,2011, P.27-28

۳۴۔ Seven Lukes, Emile Durkheim His life and work,A Historical and Critical Study, Herper & Row, Publishers, London, 1972, P. 4

۳۵۔ Nicholas Abercrombie, Stephen Hill, Bryan S. Turner, The Penguin Dictionary of Sociology (Fifth edition), Penguin Books Ltd, England, P.120

George Ritzer, Sociological theory, Eighth Edition, The McGraw Hill Companies, P.77۔۳۶
M.Iqbal Chaudhry, Social Theory Research & Problems, Aziz book depot, Lahore, ۔۳۷
1984, P.29
۳۸۔ وقار عظیم، سید، افسانہ نگاری، سرسوتی پبلشنگ ہاؤس، الٰہ آباد، ن، ص ۳۰
۳۹۔ مرزا حامد بیگ، اردو افسانے کی روایت ۱۹۰۳-۲۰۰۹، دوست پبلی کیشنز، اسلام آباد، ۲۰۱۰ء، ص ۳۸
۴۰۔ محمد علی صدیقی، پاکستانی معاشرہ اور اردو افسانہ، مشمولہ، پاکستانی معاشرہ اور ادب، مرتبین،، ڈاکٹر سید حسین محمد جعفری، احمد سلیم، پاکستان اسٹڈی سینٹر، کراچی، ۱۹۸۷ء، ص ۹۸
۴۱۔ سعادت حسن منٹو، ٹوبہ ٹیک سنگھ مشمولہ، پھندنے، ساقی بک ڈپو، دہلی، ۱۹۹۱ء، ص ۱۸۔۱۹
۴۲۔ خالد فیاض، احمد ندیم قاسمی کے آخری عہد کے افسانے، (مضمون) مطبوعہ: ادبیات، احمد ندیم قاسمی نمبر، شمارہ ۱۰۸، اکادمی ادبیات، پاکستان، ۲۰۱۶ء، ص ۲۶۲
۴۳۔ انور سدید، ڈاکٹر، غلام عباس: معاشرتی حقیقت کا نمائندہ، (مضمون) مشمولہ: غلام عباس: فکر و فن، مرتب ایم۔ خالد فیاض، نقش گر پبلی کیشنز، راولپنڈی، ۲۰۱۰ء، ص ۱۱۵
۴۴۔ انتظار حسین، آخری آدمی، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی، ص ۲۸
۴۵۔ حامد رضا صدیقی، انتظار حسین کی افسانہ نگاری کا تنقیدی مطالعہ، (غیر مطبوعہ) مقالہ برائے پی ایچ ڈی اردو، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ، ۲۰۱۷ء، ص ۴۱۲
۴۶۔ اعجاز راہی، مشمولہ ابتدائیہ، گواہی، ناظر پرنٹنگ پریس، کراچی، ۱۹۷۸ء، ص ۵
۴۷۔ آصف فرخی، (افسانہ) کہر، مشمولہ مزاحمتی ادب، مرتب ڈاکٹر رشید امجد، اکادمی ادبیات، اسلام آباد، ۲۰۰۹ء، ص ۳۱
۴۸۔ قدرت اللہ شہاب، ماں جی، مشمولہ، افسانے جو مشہور ہوئے، انتخاب: ارشد ملک، رمیل ہاؤس آف پبلی کیشنز، ۲۰۰۴ء، ص ۱۹
۴۹۔ حسن منظر، رہا ہی، آگہی پبلیکشنز، حیدرآباد، ۱۹۸۱ء، ص ۴
۵۰۔ فرمان فتح پوری، ڈاکٹر، اردو فکشن کی مختصر تاریخ، الوقار پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۲۰ء، ص ۱۷۴

باب دوم:

اکیسویں صدی کے افسانے میں تغیر پذیر معاشرتی اقدار اور معاشرتی ادارے

انسانی سماج مختلف اداروں کی مدد سے ایک پوری اکائی کی صورت میں موجود ہے۔ معاشرتی ادارے معاشرے کے اصولوں، اقدار کی ترسیل اور تعمیر و ترقی میں معاون ہوتے ہیں۔ معاشرے کی تفہیم کے لیے معاشرتی اداروں کا مطالعہ ضروری ہے ڈرخائم نے سماجیات کو اداروں کے سائنسی مطالعے کا نام دیا ہے۔ ان اداروں کے باہمی ربط سے معاشرہ خوش حال اور پائیدار ہوتا ہے کیوں کہ معاشرے کا ڈھانچہ معاشرتی اداروں کے تانے بانے سے وجود میں آتا ہے۔ معاشرتی ادارے معاشرے کی تشکیل اور نظام کو برقرار رکھنے میں اہم کردار ادا کرتے ہیں، ہر ادارہ معاشرتی نظام کو بحال رکھنے اور معاشرے کی فلاح و بہبود کے لیے وسائل مہیا کرتا ہے۔ ادارے کسی بھی معاشرے میں اقتصادی یا سیاسی افعال کو برقرار رکھنے کے لیے قائم کیے جاتے ہیں۔ ریاست کی ترقی کے لیے معاشرتی ادارے ہی ہیں جو بنیادی اصول ضابطے اور طریقہ کار طے کرتے ہیں۔ انہی اداروں کی بدولت معاشرتی اصول و اقدار کو آنے والی نسلوں تک منتقل کیا جاسکتا ہے۔ ادارے ایک فعال معاشرے کے بنیادی ستون ہیں جو معاشرے میں ریڑھ کی ہڈی کی حیثیت رکھتے ہیں۔ ان اداروں کے بغیر معاشرہ افراتفری، غیر مستحکم اور ریاست کی ضروریات کو پورا کرنے سے قاصر ہوتا ہے۔ پاکستانی معاشرے کی تشکیل میں اہم کردار ادا کرنے والے معاشرتی اداروں میں خاندان، تعلیم، مذہب، سیاست، میڈیا اور دیگر شامل ہیں جو مجموعی طور پر پاکستانی معاشرے کے اصولوں، اقدار اور طرز عمل کی تشکیل کرتے ہیں اور معاشرتی اور اقتصادی ترقی کو فروغ دینے میں اہم کردار ادا کرتے ہیں۔ انفرادی طور پر ان اداروں میں تبدیلیاں مجموعی طور پر معاشرے کو متاثر کرتی ہیں اور اقدار میں تبدیلی کا سبب بنتی ہیں۔ معاشرتی اقدار میں تغیر اور ان اقدار کو فروغ دینے میں معاشرتی ادارے اہم کردار ادا کرتے ہیں نیز ان کے درمیان مسلسل تعامل معاشروں کو متحرک رکھتا ہے۔ جیسے جیسے معاشرہ جدید رجحانات اور اثرات کو قبول کرتا ہے معاشرتی اقدار بدلتی ہیں۔ اقدار اور عقائد کی ترسیل کے لیے معاشرے کے یہ بنیادی ستون جیسے خاندان، تعلیم، مذہب، حکومت، میڈیا اور معاشیات وغیرہ تغیر کو قبول کرتے ہیں اور ان کے لیے راستہ ہموار کرتے ہیں۔ جب یہ ادارے یہ راستہ ہموار کرنے میں ناکام ہو جاتے ہیں تو معاشرہ ترقی کرنے کی بجائے تنزلی کا شکار ہو جاتا ہے۔ ان بنیادی اداروں میں سے کسی ایک ادارے کی بھی نااہلی پورے معاشرے کو متاثر کرتی ہے۔ معاشرتی

ادارے اپنے طرز عمل، پالیسیوں اور نظریات کو بدلتے ہوئے منظر نامے سے ہم آہنگ کرنے کے لیے دوبارہ ترتیب دیتے ہیں تاکہ معاشرہ ان تقاضوں کے ہم پلہ ہو سکے۔ چاہے تعلیمی میدان میں مختلف مہارتوں کو شامل کرنا ہو یا نصاب کو جدید تقاضوں کے مطابق ڈھالنا ہو، حکومتی سطح پر نئی پالیسیوں کی تشکیل ہو یا مذہبی اداروں میں جدید علم کو مذہبی تعلیمات سے ہم آہنگ کرنا۔ یہ ادارے بدلتے ہوئے معاشرے کی اقدار کو تشکیل دینے میں فعال کردار ادا کرتے ہیں۔ معاشرے کا مجموعی طرز عمل معاشرے کے انہی بنیادی اداروں سے متعین ہوتا ہے۔

پاکستان میں معاشرتی حالات مسلسل تبدیلی کی طرف گامزن ہیں۔ یہ تبدیلی مختلف شعبوں میں دیکھی جاسکتی ہے۔ بدلتے ہوئے عالمی منظر نامے کی روشنی میں اداروں نے کس حد تک تبدیلیاں قبول کیں، ان تبدیلیوں کو قبول کرتے ہوئے خود کو کس حد تک جدید تقاضوں کے مطابق ڈھالنے میں کامیابی حاصل کی، وہ کون سے پہلو ہیں جہاں تبدیلی کی گنجائش موجود ہے اور ان معاشرتی اداروں میں کہاں بگاڑ نظر آتا ہے؟ ذیل میں اقدار کی تغیر پذیری میں ان اداروں کے کردار اور ان میں پیدا ہونے والے تغیرات کی روشنی میں معاشرتی اداروں کا مطالعہ اکیسویں صدی کے منتخب کردہ افسانوں میں کی گئی حالات کی عکاسی کو مد نظر رکھتے ہوئے پیش کیا گیا ہے۔ اردو فکشن کی خوبصورتی معاشرتی اور ثقافتی تبدیلیوں کے جوہر کو نمایاں کرنے کی صلاحیت میں پنہاں ہے، کہانی کے کرداروں کی زندگی بڑے پیمانے پر معاشرتی تبدیلیوں کی آئینہ دار ہے۔

الف۔ معاصر افسانے میں تغیر پذیر معاشرتی اقدار اور خاندانی نظام

معاشرتی اداروں میں سب سے زیادہ اہمیت خاندان کو حاصل ہے کیوں کہ انسانی معاشرے کے ارتقا میں یہ بنیاد فراہم کرتا ہے۔ یہ معاشرے کی وہ بنیادی اکائی ہے جس کے ذریعے معاشرہ تہذیب و تمدن کا گہوارہ بنتا ہے۔ یہ پاکستانی معاشرے کی ساخت کا بنیادی، قابل قدر اور اہم ادارہ ہے جو فرد کے رویوں، عادات اور اقدار کو شکل دینے میں اہم کردار ادا کرتا ہے۔ خَاندَان کو فارسی میں خانوادہ، عربی میں الاسرۃ، جب کہ انگریزی میں Family کہا جاتا ہے۔ قومی انگریزی اردو لغت کے اعتبار سے خاندان: اہل خانہ، بیوی بچے، ماں باپ اور اولاد پر مشتمل کنبہ ہے جو خون یا بیاہ کے ذریعے تعلق دار گروہ ایک ہی سربراہ کے ماتحت ایک ہی گھر میں رہنے والے لوگ تشکیل دیتے ہیں۔[1] یعنی خاندان سے مراد ان افراد کا گروہ ہے جو خونی رشتوں، شادی یا پھر گود لیے جانے والے رشتوں سے جڑے ہوتے ہیں اور ایک ساتھ رہتے ہوئے وسائل، ذمے داریوں اور جذباتی بندھن میں بندھے ہوتے ہیں۔ ایک سادہ خاندان میں میاں بیوی اور بچے شامل ہیں۔ دیگر کئی مشرقی

ممالک کی طرح پاکستان میں بھی خاندان کی تعریف میں کم و بیش تین نسلیں شامل ہوتی ہیں جس میں دادا، دادی، ماں، باپ، بیٹا، بیٹی اسی طرح دیگر رشتوں میں تایا، چچا، ساس، سسر، بہو، داماد، نانا، نانی وغیرہ خاندان کے افراد میں شامل ہوتے ہیں۔ ایک معاشرتی ادارے کے طور پر خاندان کے افعال مختلف معاشروں اور ثقافتوں میں مختلف ہوتے ہیں جو وقت کے ساتھ ساتھ معاشرے کی ساخت، اپنے عقائد اور نظریات کے مطابق تبدیلیاں قبول کرتے ہوئے پروان چڑھتے ہیں۔ خاندان کے بنیادی افعال میں رشتوں کا تحفظ، بچوں کی بہترین پرورش، رشتوں کا ایک دوسرے کے لیے جذباتی اور اقتصادی تعاون شامل ہے۔

مشترکہ خاندانی نظام پاکستانی معاشرے کا اہم وصف تھا۔ مادیت پرستی نے مشترکہ خاندانی نظام کی روایت کو کھوکھلا کر دیا۔ پہلے انسان کی ضروریات محدود تھیں روپیہ پیسہ ضرورت کی حد تک تھا یا کم تھا تو لوگوں کی ضروریات ایک دوسرے سے وابستہ تھیں جوں جوں انسان ترقی کر کے خود مختار ہوا تو اس کا رشتوں پر انحصار ختم ہوتا گیا۔ اس طرح انسان کے اندر ابھرنے والے اس جدید طرز احساس نے انسانی زندگی کو جڑوں سے ہلا کر رکھ دیا۔ اس صورت حال کے تناظر محمد حمید شاہد افسانہ "باقی عمر اضافی ہے" اور "جیون، ایک گورکھ دھندا" کے حوالے سے اظہارِ خیال کرتے ہیں کہ:

> "وہ انسان پرانا ہو چکا جو اپنی نوع کے دوسرے افراد سے کچھ رشتوں سے بندھا ہوا تھا کہ اب اسے چمکتی لشکتی زندگی ان رشتوں سے کہیں زیادہ عزیز ہو گئی ہے۔ جی بڑے بڑے مال اسی خدمت پر معمور ہیں کہ وہ آپ کو برانڈڈ زندگی فراہم کر سکیں۔"(۲)

گو کہ بھائی بھائی کا دشمن ہمیں روز ازل سے سننے اور دیکھنے کو ملتا تھا لیکن اس کے باوجود بھی پاکستان میں اسلامی نظام زندگی اور اخوت کے درس نے رشتوں کی ڈور کو باندھے رکھا تھا جیسے جیسے وقت گزرتا جا رہا ہے اور معاشرہ تبدیلیوں سے گزر رہا ہے رشتوں میں کھوکھلا پن پیدا ہوتا جا رہا ہے۔ معاشرے میں اعلیٰ و افضل بننے کی چاہ رشتوں میں کھوکھلا پن پیدا کرتی جا رہی ہے، فرد کے نزدیک رشتے داروں اور عزیزوں سے زیادہ مادی چیزوں نے اہمیت اختیار کر لی ہے۔

تغیر پذیر صورت حال نے پاکستان کے روایتی خاندانی نظام کو یکسر تبدیل کر دیا ہے یوں خاندان کی ساخت میں بھی تبدیلی رونما ہوئی۔ مشترکہ خاندانی نظام کی جگہ سادہ اور جداگانہ طرز کا خاندانی نظام وجود میں آنے لگا ہے جس نے روایتی مشترکہ خاندانی نظام کے تصور اور عملیت کو بدل دیا ہے۔ اس کی وجوہات کے پس پردہ کئی عوامل ہیں جن سے اس تبدیلی کو منسوب کیا جاتا ہے۔ پاکستان بنیادی طور پر زرعی سماج رکھنے والا ملک

تھا جہاں افراد اپنی ضروریات کی تکمیل کے لیے زراعت پر انحصار کرتے تھے۔ مگر دیگر ترقی یافتہ معاشروں کی طرح پاکستان میں بھی صنعت کو فروغ حاصل ہوا تو قدیم پیشوں کی اہمیت میں کمی آئی اور زرعی معیشت صنعتی معیشت میں تبدیل ہو گئی۔ گاؤں سے شہروں کی طرف جب ملازمت پیشہ افراد نے نقل مکانی کی اور روزگار کے حصول کے لیے مستقل شہروں میں سکونت اختیار کی تو آغاز میں تو ملازمت پیشہ فرد اکیلے ہی شہر آیا مگر وقت کی کروٹ نے بیوی بچوں کو ساتھ رکھنے پر مجبور کر دیا۔ یوں شہروں میں سکونت اختیار کرنے والے خاندانوں کے لیے دیہات سے شہروں میں منتقل ہونا قدرے مشکل امر اس لیے ثابت ہوا کہ ایک تو وہ گاؤں کے کھلے ماحول، میل جول کے عادی تھے دوسری وجہ گاؤں میں زمینیں، مال مویشی وغیرہ اور مٹی کی محبت سے جدا ہونا افرادِ خانہ کے لیے آسان نہ تھا دوسری طرف شہروں میں رہائش کے محدود انتظامات اور دیہاتوں کی نسبت بہت زیادہ اخراجات نے فرد کی زندگی کو متاثر کیا۔ یوں تبدیلی کے اس دور میں روایتی طرز زندگی میں تبدیلی آئی اور باشعور طبقے نے گاؤں میں شادی کے بعد بیوی کو بھی شہر میں ساتھ لانے میں بھلائی سمجھی۔ سید زبیر شاہ کے افسانے " قربانی جو رائیگاں گئی" سے اقتباس ملاحظہ ہو جو خاندانی نظام میں ہونے والی اس تبدیلی کا عکاس ہے۔

> "وہ اس حوالے سے خوش قسمت تھی کہ جبران شاہ کی صورت میں ایک پڑھا لکھا وجیہ شوہر مل گیا تھا، جس نے شادی کے بعد اس کا ہر طرح سے خیال رکھا، یہاں تک کہ اسے گاؤں میں رکھنے کی بجائے اپنے ساتھ شہر لے آیا۔"(۳)

اس افسانے کے پلاٹ کا تعلق روایتی پس ماندہ علاقے سے تعلق رکھنے والی خاندانی دشمنی سے تشکیل پاتا ہے۔ جہاں دو خاندانوں کی دشمنی نسلوں سے چلی آ رہی تھی ایسے ماحول میں جبران شاہ جو شہر میں رہتا تھا اور ایک مشہور بزنس مین اور اجمل شاہ کی بہن کا شوہر تھا۔ اس کا اپنی بیوی کو گاؤں سے شہر لے آنا جب کہ اس کی بیوی حریفوں کی بیٹی تھی ایسے ماحول میں بیوی کو شہر لے کر منتقل ہو جانا جبران شاہ کی طرف سے ایک مثبت اقدام کے طور پر رونما ہوتا ہے اور خاندانی نظام میں آنے والے تغیر کے طور پر نمایاں ہے۔ ایک طرف جبران شاہ جو سمجھ چکا ہے کہ اس دشمنی کا حاصل تباہی اور بربادی ہے وہیں دوسری طرف اجمل شاہ جیسے کردار روایتی دشمنی کے بھینٹ اپنی بہن کو چڑھانے سے بھی دریغ نہیں کرتے۔ حسن منظر کا افسانہ " بھوبل کا چھکا" بھی گاؤں سے شہر آنے والے جوڑے اور مشترکہ نظام کے منفی پہلوؤں کو اجاگر کرتا ہے کہ کیسے قمر دین تعلیم یافتہ اور باشعور فرد کی حیثیت سے اپنے بیوی بچوں کے ساتھ گاؤں سے شہر منتقل ہو جاتا ہے اور یہاں وہ خوش

حال زندگی بسر کرتا ہے جب کہ اس سے پہلے گاؤں میں نہ صرف وہ اپنی بیوی پر ظلم ڈھاتا تھا بلکہ اس کا باپ امام دین جو اپنی پہلی بیوی کا بھی قتل کر چکا تھا اس کی بیوی کو مارتا پیٹتا رہتا ہے۔ افسانے کا پلاٹ جس ماحول میں تشکیل دیا گیا ہے وہاں قمر دین کے شہر منتقل ہونے کا فیصلہ ایک حیران کن اور بڑا فیصلہ ثابت ہوتا ہے صرف اتنا ہی نہیں اس ماحول سے وابستہ والدین کا ردعمل بھی قمر دین کی بیوی بیدو کو بد دعائیں دینے کے روپ میں سامنے آتا ہے۔ "جس طرح اس نے میرے بیٹے کو مجھ سے چھڑایا ہے، ایک دن یہ بھی اپنی آل کے لیے تڑپے گی۔"(۴)

یہ پورا افسانہ اس حقیقت سے پردہ اٹھاتا ہے کہ مشترکہ خاندانی نظام میں کرداروں کو کس طرح کے مسائل سے گزرنا پڑتا تھا۔ ساتھ ہی افسانے کے اختتام میں حسن منظر قاری کو اس ٹھوس حقیقت تک بھی لے جاتے ہیں کہ رشتوں کی توڑ پھوڑ کے بعد والدین کی زندگی کس طرح بے سروسامانی کے عالم میں گزرنے لگتی ہے۔

معاشرتی ضروریات کے پیش نظر وقت کے ساتھ ساتھ خاندانی سطح پر تبدیلی فرد کے نفع، نقصان اور ضروریات سے منسلک ہوتی گئی اور اس سے حاصل ہونے والے نتائج اور فوائد کے حصول کے لیے جداگانہ نظام کو فوقیت حاصل ہوتی چلی گئی۔ جدید معاشرے اکثر انفرادیت، شخصی آزادی اور خود مختاری کو ترجیح دیتے ہیں۔ لوگ فیصلہ سازی، طرز زندگی کے انتخاب اور ذاتی تعلقات میں آزادی چاہتے ہیں جب کہ مشترکہ خاندانی نظام میں فرد کے ذاتی فیصلوں کی بجائے مشترکہ فیصلہ سازی کو اہمیت حاصل ہوتی ہے جو جدید عہد میں انفرادی خود مختاری کو محدود کرنے کے طور پر سمجھتا ہے۔ افسانہ نگاروں نے اس صورت حال کی عکاسی افسانوں کے ذریعے مختلف حربوں سے اجاگر کی ہے اور معاشرے کے ان حقائق کو قلم بند کیا ہے۔ مثلاً رشید امجد کے افسانے "تصویریں اور دیواریں" میں ریٹائرڈ افسر کی بیوی معاشرے کی اس صورت حال پر گفتگو کرتے ہوئے اپنے شوہر سے مکالمہ کرتی ہے:

"آج کل کی ہر لڑکی سسرال سے جان چھڑانا چاہتی ہے۔"(۵)

تصویریں اور دیواریں عنوان سے ہی افسانہ اس حقیقت کا غماز ہے کہ والدین جو بچوں کو پال پوس کر بڑا کرتے ہیں اور بچے جو والدین کے بڑھاپے کا واحد سہارا ہوتے ہیں لیکن والدین کے پاس صرف تصویریں، یادیں یا پھر گفتگو کے لیے دیواریں رہ جاتی ہیں۔ افسانے کے مرکزی کرداروں میں ریٹائر ہونے والا بوڑھا باپ اور دو بیٹوں کی بوڑھی ماں ہے۔ ان کے دونوں بیٹوں کی بیویاں بھی ملازمت کرتی تھیں اور بیٹوں کے ساتھ ہی شام کو گھر آتی تھیں ان کے بچوں کو سکول سے لے کر آنا اور چھوڑ کر آنا بوڑھے باپ کی ذمے داری تھی لیکن بیٹوں کی

بیویاں اپنے ساس سسر سے ہر صورت چٹکارا چاہتی تھیں جس پر والدین کا نوحہ جائز بن جاتا ہے۔ زندگی عجیب رنگ اختیار کرتی جارہی ہے کہ بیٹیوں کو پال پوس کر دوسروں کے حوالے کر دیا جائے اور بیٹوں کو جن کو والدین کے بڑھاپے کا سہارا سمجھا جاتا تھا ان کی شادی کے بعد بیویوں کے حوالے کر دیا جائے۔ ان کے دونوں بچے بیرون ملک نوکری تلاش کر کے بیوی بچوں کے ساتھ وہیں چلے جاتے ہیں اور والدین کے لیے ان کی تصویریں دیکھنا یا دیواروں سے باتیں کرنا رہ جاتا ہے۔ رشید امجد کے بیشتر افسانوں میں والدین کے اس کرب اور خاندانی سطح پر ہونے والی اس بڑی تبدیلی کو موضوع بنایا گیا ہے۔ ان کے افسانے "پرندہ اداس ہے" بھی اسی صورت حال کا عکاس ہے۔

"اچھے دن انھیں اداس دنوں میں بدلتے دو تین سال ہی لگے۔ بیٹیوں کو ان کے شوہر بیرون ملک لے گئے۔ بیٹے شادیاں کر کے ایک ایک خود باہر چلے گئے۔"(۶)

جب مردوں کے ساتھ خواتین نے بھی ملازمت کرنا شروع کی خواتین میں خود انحصاری کا جذبہ پیدا ہوا تو مصروفیت کے بڑھنے سے خواتین میں وقت کی کمی اور قوت برداشت ختم ہونے لگی اور سب سے بڑھ کر مالی استحکام نے نظام میں تبدیلیاں پیدا کیں۔ والدین سے جدائی کا جہاں ایک پہلو بیٹوں کی بیویوں میں عدم برداشت کا ہے وہیں دوسری طرف بیٹے خود بھی اعلیٰ تعلیم کے حصول اور مستقبل کی فکر میں خود کو بیرون ممالک میں محفوظ خیال کرتے ہیں۔ "گماں کے رشتے" افسانے میں نوجوان اپنے مستقبل کی فکر میں سرگرداں ولایت میں مقیم اپنی بہن سے کہتا ہے کہ اس کے لیے کوئی ایسا رشتہ تلاش کرے جس کے ذریعے اسے بھی باہر کی نیشنلٹی مل جائے۔ اس کے والدین نہیں چاہتے تھے کہ ان کا اکلوتا بیٹا بھی انہیں تن تنہا کرے لیکن بیٹے کی خواہش تھی کہ:

"مجھے آگے پڑھنا ہے، میرا کیریئر ہے یہاں کیا رکھا ہے؟"

"رشتہ مل گیا، لڑکی والے آئے، بیٹے کو بیاہ کر ساتھ لے گئے۔"(۷)

آج کا نوجوان اپنے کیریئر کے لیے سب کچھ داؤ پر لگانے کے لیے تیار ہے۔ اعلیٰ تعلیم اور کیریئر کے حصول کے لیے مختلف شہروں اور ممالک کا سفر اختیار کرنا بھی مشترکہ خاندانی ڈھانچے کی روایت میں تغیر پیدا کر رہا ہے۔ "آواز اور عکس کے درمیان" افسانے میں رشید امجد نے فرمابردار اولاد کو قاری کے روبرو پیش کیا ہے۔ جس میں بہو بھی والدین کا خیال رکھتی ہے مگر یہ سب کچھ فون پر ہے اب بچوں کا والدین سے آواز اور عکس کا رشتہ رہ گیا ہے۔ بچے باقاعدگی سے والدین کو فون کرتے ہیں جس کو انہوں نے تین گھنٹے آگے والا اور

ایک گھنٹہ پیچھے والے کے نام سے منسوب کیا ہوا ہے۔[۷] ایسی صورت حال پر والدین ملازمین کے رحم و کرم پر بچوں کے فون کے انتظار میں زندگی بسر کر دیتے ہیں اور محض فون پر رابطہ ہو جانے کی صورت میں بھی مطمئن ہیں اور سکون کی زندگی بسر کرنے کو ترجیح دیتے ہیں۔ اس صورت حال کو رشید امجد کے علاوہ دیگر افسانہ نگاروں نے بھی محسوس کیا اور مشترکہ خاندانی نظام کی تغیر پذیر اس معاشرتی قدر اور صورت حال کو افسانوں میں سمویا۔ پس منظر میں سلیم آغا قزلباش کا افسانہ "انتظار" جداگانہ نظام کو المیاتی تاثر کے ساتھ ابھارتا ہے اور قاری کے لیے کئی ایک سوال چھوڑ جاتا ہے۔ افسانے کا مرکزی کردار "گل بانو" ہے۔ جس کے اپنے شوہر کے ساتھ معاملات کشیدہ ہونے کے بعد طلاق ہو جاتی ہے اس کا ایک بیٹا بھی ہے جس کا نام نعمان ہے۔ وہ معاشرے کی اس ناچاری کو جانتی تھی کے والدین کے بعد کوئی سگا بہن بھائی بھی اپنا نہیں رہتا۔ اسی لیے وہ خود کو مستحکم کرنے کے لیے مزید تعلیم حاصل کرتی ہے اور اپنی فکر کیے بغیر اپنے بچے کے مستقبل کو سنوارنے میں لگ جاتی ہے۔ اس دوران اس کے بھائی کی بھی شادی ہو جاتی ہے۔ افسانے میں اس کے بھائی کی شادی اور والدین سے علاحدگی کو جس پر سوز حالات میں بیان کیا گیا ہے وہ بھی جدید طرز خاندان کا عکاس ہے۔

> "اس کے بھائی کی بھی شادی ہو گئی اور چند سال بعد وہ ذاتی گھر تعمیر کرا کے اپنی بیوی اور دو بچوں کے ساتھ وہاں منتقل ہو گیا۔"[۹]

بیوی بچوں کے ساتھ جداگانہ رہائش اختیار کرنا اب معاشرے میں ایک عام سی بات کا درجہ رکھتی ہے۔ لیکن گل بانو کا بیٹا جس کے لیے اس کی ماں، اس کے نانا، نانی نے اتنی قربانیاں دیں وہ بیٹا بھی جوان ہوتے ہی اپنے پیروں پر کھڑے ہونے کے قابل ہو جاتا ہے تو ماں کی قربانیاں اچھے دنوں کے انتظار میں زائل ہو جاتی ہیں۔ گل بانو نے دن رات محنت کر کے نعمان کو معاشرے میں سر اٹھا کر جینے کے قابل بنایا اور اس کے لیے اچھے سے اچھے رشتے کی تلاش میں رہنے لگی لیکن جب بیٹا اپنی پسند گل بانو کو بتاتا ہے تو دکھی ہونے کے بعد خود کو خود ہی دلاسہ دیتی ہے کہ اسے بھی اپنے بیٹے کے لیے کوئی اتنی قابل لڑکی نہیں ملی تھی۔ یوں وہ اپنے بیٹے کی پسند شبانہ کو قبول کر لیتی ہے لیکن گل بانو کا غم اس وقت زندگی کے ایسے موڑ پر لے آتا ہے جو آج کے ماڈرن زمانے کی پیداوار ہے۔ پاکستانی معاشرے اور بہت سی ثقافتوں کی ایک عام روایت تھی کہ دلہن شادی کی تقریب کے بعد اپنے شوہر کے گھر یعنی اپنے سسرال جاتی تھی جو ایک نئی زندگی کے آغاز کی علامت تھا۔ لیکن جیسے جیسے روایتی خیالات میں تبدیلیاں رونما ہو رہی ہیں جوڑے اپنی ترجیحات اور اقدار کے مطابق ان روایتی طریقوں کو چیلنج کرتے ہوئے نئی شکل دے رہے ہیں۔ اس صورت حال کا تجزیہ نعمان اور شبانہ کی شادی کے موقع پر پیدا ہونے والے حالات سے اجاگر ہوتا ہے:

"جب رخصتی کا وقت آیا تو شبانہ نے نعمان سے کہا: جس ہوٹل میں ہمارا قیام ہے وہیں چلتے ہیں!۔۔۔کیا شادی کے بعد لڑکیاں اپنے سسرال جایا کرتی ہیں یا ہوٹل میں؟۔۔۔تھوڑی دیر کے لیے دلہن کو لے کر گھر چلے آنا پھر بے شک ہوٹل چلے جانا!۔۔۔ادھر شبانہ نے نعمان کی ایک نہ سنی اور وہ تقریب کے اختتام پر نعمان کو ساتھ لے کر ہوٹل چلی گئی۔"(۱۰)

شبانہ روایتی توقعات کو چیلنج کرتے ہوئے نعمان کے گھر جانے کی بجائے اس ہوٹل میں جانے کو ترجیح دیتی ہے جہاں وہ ٹھہری ہوئی تھی۔ یہ عمل پرائیویسی، آزادی اور ازدواجی سفر شروع کرنے کے لیے جدید انداز اور خواہشات کی علامت ہے۔شبانہ کا فیصلہ جوڑے کی خود مختاری کی اہمیت اور اپنی شادی شدہ زندگی شروع کرنے کے لیے ذاتی جگہ کی ضرورت کے بڑھتے ہوئے اعتراف کی عکاسی کرتا ہے۔ نیز اس خیال کو بھی اجاگر کرتا ہے کہ شادی دو افراد کے درمیان شراکت داری ہے اور انہیں یہ انتخاب کرنے کی آزادی ہونی چاہیے کہ وہ اس سفر کا آغاز کیسے کریں۔ یہ اقتباس عصری شادیوں کے بدلتے ہوئے رجحان پر روشنی ڈالتا ہے، جہاں جوڑے روایتی اصولوں کی پیروی کرنے کی بجائے اپنا انتخاب ان چیزوں کی بنیاد پر کرتے ہیں جو ان کے لیے آرام دہ اور سہولت کا باعث ہو۔ شبانہ کا تعلق پاکستانی ماحول سے نہ تھا لیکن یہی رجحان روایتی اقدار کو متاثر کرتے ہوئے تغیر پذیر ہے۔ سید زبیر شاہ نے بھی ایسی صورت حال کو اجاگر کیا ہے۔ افسانہ "پہلی قسط" میں جب زبیدہ کا شوہر آئے روز اسے اپنے والدین سے پیسے اور جائیداد مانگنے پر مجبور کرتا ہے تو اس کا جواب اس صورت حال کو پیش کرتا ہے جہاں زبیدہ کا بھائی بھی بیوی بچوں کے ساتھ الگ رہائش اختیار کر لیتا ہے۔ وہ نجیب سے کہتی ہے:

"آپ جانتے ہیں، بھائی بھی بھابی اور بچوں کو لے کر الگ ہو گئے ہیں، ایسے میں، امی ابو سے خود کو کیسے چھین سکتی ہوں"(۱۱)

خاندان میں پیدا ہونے والے تناؤ اور والدین کے لیے خاندانی سطح پر ہونے والی علیحدگی جس مشکل صورت حال کو جنم دیتی ہے افسانہ نگاروں نے اس کا اعادہ بھی کیا ہے۔

"بوسیدہ دیواروں پر کھدے بیَن" افسانے میں ڈاکٹر شفیق انجم نے معاشرے کی پسی ہوئی بوڑھی عورت جس کا نام مقدس ہے اس کی نوحہ گری کی ہے۔ اس کے تین بیٹوں اور چھے بیٹیوں میں سے بیٹیوں کی شادی اس کے اپنے شوہر جیسے لٹھ مار شوہروں سے ہو جاتی ہے جب کہ بیٹوں میں پہلا بیٹا تعلیم حاصل کر کے پردیس میں شادی ہونے کے بعد خود بھی وہیں چلا جاتا ہے، دوسرے بیٹے کی شادی جو ان کی حیثیت کے مطابق

دھوم دھام سے ہوتی ہے مگر آنے والی بیٹے کو لے کر علیحدہ ہو جاتی ہے جو ہمارے خاندانی نظام کے توڑ پھوڑ کی عمدگی سے عکاسی کرتا ہے۔ افسانے سے اقتباس ملاحظہ ہو:

"جو کچھ تھا وہ آنے والی کے قدموں پر پتی پتی نچھاور کر دیا۔۔۔ مہارانی نے آتے ہی مہاراج سمیت سب کی چٹیا میں لونگ دھرے اور علیحدہ سے گھر بسا، یہ جا وہ جا۔ کچی دیواریں اس ہتک پر اپنا آپ نوچتی رہ گئیں۔"(۱۲)

مجموعی طور پر یہ اقتباس ایسی صورت حال کی عکاسی کر رہا ہے جو معاشرے میں قابل قبول نہیں ہے کیوں کہ اس سے خاندان ٹوٹ جاتے ہیں۔ جس منظر نامے کو اس کہانی کے ذریعے اجاگر کیا گیا ہے وہ خاندانی زوال کی عکاس ہے جہاں والدین جو بہو کے لیے سب کچھ نچھاور کر دیتے ہیں ایسی بہو بھی اپنے شوہر کو لے کر الگ گھر بسا لیتی ہے۔ پاکستانی معاشرے میں مشترکہ خاندانی نظام کا جائزہ لیں تو طبقہ امرا اور متوسط طبقے میں یہ نظام اب خال خال ہی ملتا ہے جب کہ اقتباس سے اجاگر ہوتا ہے کہ نچلے طبقے میں جہاں مشترکہ خاندانی نظام کی کچھ رمق باقی تھی وہ بھی تبدیل ہو رہی ہے۔ خاندان کے افراد کا طرز عمل جمہوری ہوتا جا رہا ہے یہی وجہ ہے کہ دیہاتوں میں بھی خاندان کی اہمیت اب کم ہوتی جا رہی ہے۔

شادی سے متعلق اقدار میں تبدیلیاں کثیر جہتی رہی ہیں جو ابھرتے ہوئے معاشرتی رویوں، قانونی اصطلاحات اور ثقافتی تبدیلیوں کا پیش خیمہ ہیں۔ ان تبدیلیوں کا بھی فکشن میں احاطہ کیا گیا ہے۔ مثلاً بہت سے دیگر معاشروں کے ساتھ ساتھ پاکستانی معاشرے میں شادی کے لیے کم سے کم عمر میں اضافہ ہوا ہے جب کہ پہلے کم عمری اور بچپن کی شادیاں عام تھیں، آج عالمی سطح پر اس بات کو یقینی بنانے پر زور دیا جا رہا ہے کہ افراد بالغ عمر میں شادی کریں۔ معاصر افسانہ اس صورت حال کو تاریخ اور ثقافتی سیاق و سباق کے تناظر میں پیش کرنے میں کامیاب نظر آتا ہے۔ حمید شاہد کے افسانے سے اقتباس ملاحظہ ہو:

"بیٹا محمد انیس، اپنی ماں کی باتوں سے یہ نہ سمجھنا کہ میں شادی کے وقت بہت عمر رسیدہ تھا اور تمہاری ماں کم عمر بچی، ہم دونوں ہی کم سن تھے، اگر یہ بارہ تیرہ سال کی ہوں گی تو میں پندرہ سولہ سال کا تھا، تب یہی عمر ہوتی تھی شادی کی۔"(۱۳)

انیس کے والدین کی اپنی نوعمری کی شادی کے سالوں پر روشنی ڈالنا اس بات کا عکاس ہے کہ پہلے کم عمری میں شادی کرنا عام اور قابل قبول تھا۔ اس افسانے کی کہانی میں انیس کی ماں اپنے شادی کے دنوں کو یاد کرتی ہوئی کہتی ہے جب اس کی شادی ہوئی تھی تب اس کی گڑیا اور پٹولوں سے کھیلنے کی عمر تھی جہاں اس کا باپ

واضح کرتا ہے کہ یہ مت سمجھنا کہ میری عمر کچھ زیادہ تھی بلکہ جب ان کی شادی ہوئی تھی وہ کم سن تھے۔اس کے مقابلے میں عصر حاضر میں وقت کے ساتھ ساتھ سوچ میں تبدیلی آئی اور حالات نے ایسا رخ اختیار کیا کہ اب نہ صرف بالغ عمر میں رشتے طے کیے جاتے ہیں بلکہ بچوں کی رضامندی بھی ملحوظ خاطر ہوتی ہے۔اب طے شدہ شادیوں سے زیادہ بچوں کی پسند کی شادی کا رجحان عام ہے۔اب نوجوان نسل کے پاس تغیر پذیر اقدار کی روشنی میں باہمی افہام و تفہیم، مطابقت اور مشترکہ خیالات کی بنیاد پر اپنے جیون ساتھیوں کا انتخاب کرنے کا حق موجود ہے۔اس صورت حال کی عکاسی اکیسویں صدی کے بے شمار افسانوں میں دیکھنے کو ملتی ہے۔ذیل میں چند افسانوں سے مثالیں اس صورت حال کی عمدگی سے نمائندگی کرتی ہے۔مثلاً افسانہ "باپ" کا مرکزی کردار وقار خان جو ایک نامور لکھاری ہے مگر اس کی بیوی اس بات سے تنگ آکر کہ وہ اسے وقت نہیں دیتا اسے اور اپنے دو بچوں شادو اور گامے کو چھوڑ کر چلی جاتی ہے اس کے بعد دونوں بچوں کی پرورش ماں اور باپ بن کر وقار خان نے کی تھی۔ان کی شادی کی عمر میں جس دن بچوں کو دیکھنے مہمانوں نے آنا ہوتا ہے اس دن وہ پہلے بچوں سے ان کی مرضی جان لینا ضروری سمجھتا ہے۔

"تو آپ لوگ بتا دیں اگر ذہن میں کوئی اور بات ہے تو ہم تو سب دوست ہیں بھائی، دوستی میں تو ایسا ہوتا ہے، اچھا بتاؤ، کیا خیال ہے، نہ آئیں مہمان؟"(۱۴)

وقار خان کا یہ رویہ جدید عہد کی جدید اقدار کے تناظر میں روشن خیالی کو ابھارتا ہے جہاں وہ نہ صرف بچوں کو مہمانوں کے آنے سے قبل ان کے آنے کے مقصد سے آگاہ کرتا ہے بلکہ ان سے ان کی مرضی بھی دوستانہ ماحول میں دریافت کرتا ہے اور ان کے فیصلے کو اہمیت دیتا ہے۔دونوں بچوں میں سے گامے نے چوں کہ کہا تھا کہ وہ تو محبت میں پسند کی شادی کرے گا تو وقار خان نے اسے کھلی اجازت دی اور جب گامے کو حمیرا نامی لڑکی پسند آتی ہے تو وہ فوراً اپنے والد کو آگاہ کرتا ہے۔زمانہ کس تیزی سے بدل رہا ہے اس کا اندازہ خود وقار احمد کو بھی ہے۔وہ اپنے بیٹے سے کہتا ہے کہ:

"عجب زمانہ ہے وقت الٹی چال چل گیا ہے۔پہلے والدین کہتے تھے کہ آپ لوگ تیار رہیں آج مہمان آرہے ہیں اب اولاد کہتی ہے کہ تم تیار رہو بہو ملنے آرہی ہے"(۱۵)

یہ اقتباس بدلتے ہوئے معاشرتی حالات کا موازنہ روایتی توقعات سے کرتے ہوئے جدید تاثرات کا نمائندہ ہے۔روایتی طور پر دلہن کو دیکھنے دولہے کے والدین جاتے تھے جہاں دو خاندانوں کی باہمی رضامندی سے رشتہ طے پاتا تھا۔اقتباس میں اس کے برعکس صورت حال کی جدید تشریح کی گئی ہے جو ترقی پسند اور مساویانہ نقطہ

نظر کی نشاندہی کرتی ہے جہاں ممکنہ دلہن اپنے مستقبل کا فیصلہ کرنے اور اپنے ممکنہ سسرال سے ملنے اور اس کے نتیجے میں فیصلہ کرنے کے حوالے سے فعال کردار ادا کرتی ہے۔ یہ صنفی مساوات کے تئیں بدلتی ہوئی اقدار، ازدواجی زندگی کے لیے عورت کی پسند اور اہمیت کو تسلیم کرنے کی طرف اشارہ ہے۔ افسانے کا سیاق اس طرز کے رشتے کی مضبوطی، جوڑے کے مابین اعتماد اور ان کے مضبوط بندھن کا عکاس ہے۔ مساوی حقوق کی طرف یہ رجحان معاشرے میں عام ہوا ہے۔ اس کے ذریعے اس عصری حقیقت کو تسلیم کیا گیا ہے کہ خاندانی اکائی میں جوڑے کی باہمی رضامندی ضروری ہے۔

منشایاد کا افسانہ "الہام" اس صورت حال کی تخلیق دیہی منظرنامے میں کرتے ہیں۔ یہ افسانہ گاؤں کے ماحول میں پنپنے والی محبت اور بدلتے ہوئے رسم و رواج کو اجاگر کرتا ہے۔ افسانے کی کہانی کچھ یوں ہے کہ چودھری رمضان اور راجاں کی اکلوتی بیٹی ہے جس کے لیے وہ اچھے رشتے کی تلاش میں ہیں۔ غلام رسول ان کا منہ بولا بیٹا ہے جو لاوارث تھا لیکن چودھری رمضان اور راجاں نے مل کر اس کی پرورش کی اور اب وہ شہر میں موبائل کمپنی میں کام کرتا ہے۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ ان کی بیٹی اور منہ بولا بیٹا ایک دوسرے کو پسند کرنے لگتے ہیں لیکن ان کے والدین ان کے رشتے کے لیے تیار نہیں ہیں کہ وہ غلام رسول کو اپنی اکلوتی بیٹی اور جائیداد ایسے ہی کیسے اٹھا کر دے دیں۔ یوں جب بھی ان کی بیٹی کے لیے کوئی رشتہ آتا ہے غلام رسول کو خبر مل جاتی ہے اور وہ گاؤں پہنچ جاتا ہے اس کے والدین کو لگتا ہے غلام رسول کو الہام ہو جاتا ہے۔ چودھری صاحب کی بیٹی کو دیکھنے آئے مہمان چودھری صاحب کو حالات کی سنگینی اور تبدیلی کے حوالے سے آگاہ کرتے ہیں اور کہتے ہیں اب انہیں بھی زمانے کے ساتھ بچوں کی پسند ناپسند کا خیال رکھنا چاہیے۔ خاندانی سطح پر معاشرے میں آنے والی ایک بڑی تبدیلی یہ ہے کہ اب بچوں کی شادی بیاہ کے معاملات میں ان کی پسند ناپسند کو اہمیت دی جاتی ہے صرف اتنا ہی نہیں بلکہ رشتے والے بھی اب شادی سے پہلے لڑکے لڑکی کی ملاقات کے خواں ہوتے ہیں جس کا اظہار یہ یہ افسانہ بھی ہے۔ افسانے سے اقتباس ملاحظہ ہو:

> "یہ روشنی کا زمانہ ہے" کرنل صاحب نے کہا" نئی نئی چیزیں ایجاد ہو گئی ہیں۔ جن سے فاصلے سمٹ گئے اور رسم و رواج بدل گئے ہیں۔ اب شادی سے پہلے لڑکے لڑکی کا ایک دوسرے کو دیکھنا اور پسند کرنا ضروری سمجھا جاتا ہے۔"۔۔۔ اب شادی بیاہ کے معاملے میں زبردستی ممکن نہیں۔۔۔ چند برسوں میں بڑی تبدیلی آگئی ہے۔"(۱۶)

چودھری کی بیٹی کو دیکھنے آئے مہمان جب دونوں بچوں کی ملاقات آپس میں کروانے کو کہتے ہیں تو چودھری انہیں بتاتا ہے کہ گاؤں میں ابھی زمانہ نہیں بدلا یہاں لوگ سنیں گے تو باتیں بنائیں گے مہمان اس پر حیران ہوتا ہے کہ یہ کیسے رسم ورواج ہیں جہاں جس لڑکی اور لڑکے نے ساری زندگی ساتھ گزارنی ہے وہ ایک دوسرے کو دیکھ یا مل بھی نہیں سکتے اور چودھری صاحب سے کہتا ہے زمانہ تو گاؤں میں بھی بدل گیا ہے بجلی، میز، کرسیاں، فریج وغیرہ یوں مہمان چودھری صاحب کو یہ باور کروانے میں کامیاب ہو جاتے ہیں کہ اب وہ پرانا دور نہیں رہا جب بچوں کی شادی کروادی جاتی تھی اور انہیں شادی کا مطلب بھی نہیں پتا ہوتا تھا۔ آخر میں مہمان چودھری صاحب کا دھیان بچوں کی پسند کی شادی کروانے کی طرف مائل کرتے ہوئے وہاں سے رخصت ہوتا ہے۔ اس سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ ازدواجی زندگی میں منسلک ہونے سے متعلق اقدار نہ صرف شہروں میں تبدیل ہوئیں بلکہ دیہاتوں میں بھی دیگر تبدیلیوں کی طرح اس رجحان میں بھی تبدیلی پیدا ہو رہی ہے۔ جدید اقدار شادی بیاہ کے معاملے میں ذاتی خواہشات اور کیریئر دونوں کو متوازن انداز میں پروان چڑھانے کی اہمیت پر زور دیتی ہیں۔

دیہاتوں میں پہلے خارجی شادی کا رواج نہ تھا اور بچوں کو برادری کے بھینٹ رشتہ ازدواج میں منسلک کر دیا جاتا تھا لیکن اب اس رجحان میں بھی کمی واقع ہوئی ہے اب شادی سے قبل والدین بچوں کی شادی کے لیے ان سے مطابقت کا رشتہ تلاش کرتے ہیں۔ مثلاً اگر کسی کا بیٹا ڈاکٹر یا انجینئر بن جاتا ہے، یا پھر کسی کی بیٹی اعلیٰ تعلیم حاصل کر لیتی ہے تو ایسی صورت میں برادری میں موزوں رشتہ نہ ہونے کی صورت میں برادری سے باہر شادی کو ترجیح دی جاتی ہے۔ اس حوالے سے "ایسے کو تیسا" افسانے کی تفہیم معاون ثابت ہو گی جس میں رابعہ کا کردار شریف النفس، سگھڑ، حسین و جمیل اور فرماں بردار بیٹی کا ہے جس کو اپنے والدین کی عزت و آبرو کا بہت خیال ہے اور اس کے والدین بھی امتدادِ زمانہ کے ساتھ اس بات کا خاص خیال رکھتے ہیں کہ اپنی بیٹی کو برادری کے بھینٹ چڑھانے کی بجائے اس کے ہم پلہ رشتہ دیکھیں۔ افسانے سے اقتباس ملاحظہ ہو:

> "بھائی صاحب، میں نے کہا۔۔۔ نا، سلیم رابو کا جوڑ نہیں، وہ بی اے پاس ہے اور سلیم فقط میٹرک، زمانہ بہت ترقی کر چکا ہے، آپ بھی حالات کو سمجھنے کی کوشش کریں۔ بچوں کو صرف برادری کے نام پر قربان تو نہیں کرنا چاہیے نا۔۔۔ ہمیں بی اے پاس لڑکیاں ان کے ہم پلہ لڑکوں سے ہی منسوب کرنی چاہیے۔۔۔"(۱۷)

یہ اقتباس بچوں کی فلاح و بہبود اور حقوق کے تحفظ کی اہمیت کو اجاگر کرتا ہے کہ کوئی بھی معاشرتی، ثقافتی یا فرقہ وارانہ مقصد بچوں کے بنیادی حقوق سے بالاتر نہیں ہو سکتا نیز یہ اس طرح کے ہر عمل کی مذمت کرتا ہے جس میں بچوں پر ایسے فیصلے صادر کر دیے جائیں جس میں ان کی ذہنی اور جسمانی ہم آہنگی نہ ہو۔ دریں روایات اور اقدار کو چیلنج کرتا ہوا یہ افسانہ جدید تقاضوں کے مطابق زندگی بسر کرنے کی اہمیت پر زور دیتا ہے۔ افسانے میں رابعہ کے والد کے اس فیصلے پر برادری والے مخالفت کا اظہار کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ اب تو خون ہی سفید ہو گیا ہے ایک زمانہ تھا بھائی بھائی پر جان وارتا تھا اور آج رشتہ کرنا پسند نہیں کرتا۔ کیا زمانہ آ گیا ہے لوگ بیٹی کا رشتہ کرتے ہوئے بھی خائف ہیں۔ (۱۸) لیکن ان سب باتوں کے باوجود رابعہ کا باپ ثابت قدم رہتا ہے اور اس کے لیے اس کے ہم پلہ زید کا رشتہ دیکھتا ہے زید نے ایم ایس سی کی ہوئی تھی اچھی ملازمت اور شکل وصورت کا شخص تھا لیکن نکاح سے پہلے لڑکی دیکھنے کی ضد جو کہ آج کل ایک عام بات ہے لیکن جس موقع پر یہ ضد کی گئی اس پر رابعہ باہمت لڑکی کی طرح ایک بڑا فیصلہ کرتی ہوئی نظر آتی ہے۔ جب زید رابعہ کو دیکھنے کے بعد شادی کے لیے ہاں بول دیتا ہے تو اس کا جواب مجمعے کو حیران کر دیتا ہے جس سے ثابت ہوتا ہے کہ اب لڑکیاں کمزور نہیں اپنے حق اور سچ کے لیے بول سکتی ہیں۔

> "ٹھیک ہے، سب لوگوں نے سن اور دیکھ لیا کہ میں زید کو بہت پسند آئی ہوں لیکن مصیبت یہ ہے کہ زید میاں آپ مجھے پسند نہیں آئے، آپ مجھے بالکل اچھے نہیں لگے، آپ اپنی بارات لے کر واپس جاسکتے ہیں، آپ تو نہایت گندے انسان ہیں۔۔۔"(۱۹)

بدلتی ہوئی معاشرتی اقدار کے تناظر میں یہ اقتباس ظاہر کرتا ہے کہ معاشرے میں پائے جانے والے رابعہ جیسے نسوانی کردار جو اپنے والدین کی پسند کو ترجیح دیتے ہیں اس کا ہرگز یہ مطلب نہیں کہ وہ مظلوم ہیں یا ان پر کسی قسم کی پابندی ہے بلکہ وہ اپنا دفاع کرنا جانتے ہیں اگر ان کا ہم سفر والدین اور خاندان کی عزت کرنے والا نہ ہو تو کسی کی پرواکیے بغیر اپنے حقوق کا استعمال کرنا اور اپنی عزت نفس کے لیے آواز اٹھانا خواتین باخوبی جانتی ہیں۔ روشن خیالی نے لڑکیوں کی تعلیم کی اہمیت اور لڑکوں کے برابر تعلیم کی اہمیت پر توجہ مرکوز کی ہے۔ خواتین کی ملازمت کے سلسلے میں جو تنگ نظری تھی وہ بھی کم ہو گئی ہے۔ والدین شادی سے زیادہ بچوں کی تعلیم پر توجہ دیتے ہیں تاکہ مستقبل میں انہیں کسی قسم کے مسائل کا سامنا نہ کرنا پڑے۔ "ایک اور جنگل" افسانے میں زری کی ماں جس نے شوہر کی وفات کے بعد خود ملازمت کر کے بچوں کو پالا تھا وہ بچیوں کی تعلیم کی اہمیت سے خوب واقف ہے اور اپنے بیٹے کو بیٹی کی تعلیم سے متعلق کہتی ہے کہ:

"زری ابھی پڑھ رہی ہے، وہ بی اے کر کے کوئی نوکری کرے تو شادی کریں گے نہ جانے کل کیا حالات ہوں آج کل تو بچی کی نوکری زیادہ ضروری ہے میری بات ہی لے لو اگر ہسپتال میں یہ نوکری نہ ملتی تو تمہارے ابو کے بعد تمہارا کون تھا۔ شاید ہم لوگ بھوکے مر جاتے مشکل وقت میں کوئی رشتہ رشتہ نہیں رہتا۔"(۲۰)

بیان کردہ صورت حال معاشرتی اقدار کے ارتقا میں بچیوں کی تعلیم اور روزگار سے متعلق ایک اہم تبدیلی کی عکاسی کرتی ہے، ماضی کے روایتی معاشرتی اصولوں کے مطابق عورت کا بنیادی کردار شادی کرنا اور گھریلو ذمہ داریوں کو سنبھالنا تھا۔ جب کہ موجودہ تناظر میں زری کی مثال روایتی معمول سے علاحدگی کو ظاہر کرتی ہے۔ جس میں اس کی ماں نہ صرف اپنی بیٹی کی تعلیم کو ترجیح دیتی ہے بلکہ تعلیم حاصل کرنے کے بعد اس کو خود مختار بنانے اور اس کی ملازمت کو بھی ضروری خیال کرتی ہے۔ رشتوں کے لیے خواتین کا ملازمت پیشہ ہونا بھی عورت کی پیشہ وارانہ اور تعلیمی سرگرمیوں میں بڑھتی ہوئی اہمیت کو اجاگر کرتا ہے جو عورت کی ذاتی زندگی کو مستحکم کرنے کی بنیاد ہے۔ زری کے مستقبل کے بارے میں اس کی ماں کی غیر یقینی صورت حال معاشرے کی ارتقاپذیر غیر متوقع نوعیت کو اجاگر کرتی ہے۔ معاشی اور معاشرتی سطح پر عورت کی معاشی آزادی کے ذریعے ممکنہ مشکلات کا مقابلہ کرتے ہوئے عورت کے مالی استحکام کو ترجیح دی گئی ہے جس سے عورت معاشرے میں اپنی صلاحیتوں کو بروئے کار لاتے ہوئے نہ صرف معاشرے کی ترقی میں اپنا کردار ادا کر سکتی ہے بلکہ اس سے اس کی انفرادی خواہشات کی تکمیل اور خود انحصاری کے جذبات اجاگر ہوتے ہیں۔ حسن منظر نے عصر حاضر میں مرد کی طرح عورت کے بھی گھر سے باہر نکلنے کی ضرورت کو افسانہ "شبِ حراس" میں بیان کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

"دنیا ایسے دور میں نکل آئی تھی جب بچیوں اور عورتوں کا اکیلے گھر سے نکلنا اس تھوڑے ہی دنوں کے پرندے کی طرح ضروری ہو گیا تھا جسے ایک وقت آنے پر ماں باپ دھکیل کر گھونسلے سے باہر نکال دیتے ہیں- چاہے اسے پوری طرح اڑنا آیا نہ آیا ہو۔"(۲۱)

معاشرتی اقدار میں تغیر مرد کی حاکمیت کے حوالے سے رونما ہونے والی تبدیلیوں کی صورت میں بھی عیاں ہوا ہے۔ پاکستانی معاشرے میں مرد خاندان کے سربراہ کی حیثیت رکھتا تھا۔ پدرانہ اصولوں اور طریقوں جن سے خواتین پس ماندگی کا شکار ہوئیں جیسے عوامل کو صنفی برابری کے حوالے سے اٹھائے جانے والی آوازوں

نے چیلنج کیا اور جب معاشرے میں مرد کے ساتھ ساتھ عورت کا کردار بھی مستحکم اور خود مختار ہوا تو مرد کی حاکمانہ ٹھاٹ میں بھی کمی آئی۔ مردوں میں قیادت کا کردار اور دقیانوسی تصورات کو چیلنج کرنے والے خیالات کو فکشن نگاروں نے اپنے تخلیقی جوہر سے نکھار کر معاشرے کی تصویر کشی کی ہے اکیسویں صدی کے افسانے کا مطالعہ مختلف مواقع پر مرد کی فیصلہ سازی کے کردار اور اس میں آنے والے نمایاں فرق کو اجاگر کرنے میں کامیاب رہا ہے۔ رشید امجد کے افسانہ "سبز ۂ زہر اب" سے اقتباس ملاحظہ ہو:

> "بیٹیوں اور بیٹوں کی اعلیٰ تعلیم اور ان کے کھلے اخراجات نے انہیں بھی احسان مند بنا دیا۔ سب اس کی تعظیم کرتے تھے، لیکن اب۔۔۔اب کچھ عرصے سے صورت حال بدل گئی تھی۔ سب نوکریاں کر رہے تھے اور کوئی اس کی عنایات کا طالب نہیں رہا تھا۔۔۔اس کے حاکمانہ ٹھاٹ کا زمانہ گزر چکا تھا۔"(۲۲)

صنفی مساوات، معاشی آزادی اور روایتی طور پر مرد کے کم ہوتے اثر ورسوخ کو عمدگی سے اس اقتباس میں پیش کیا گیا ہے۔ جس کو افسانے میں رشید امجد نے گھر کے سربراہ اور واحد کفیل کردار کی فکری حیثیت اور معدوم ہوتے ہوئے کردار کی شخصیت کے حوالے سے اجاگر کیا۔ اس کے بیٹوں اور بیٹیوں کی اعلیٰ تعلیم روایتی طرز میں تبدیلی کی وجہ بن کر ابھری ہے۔ بچوں میں معاشی خوش حالی اور مالی طور پر خود مختاری نے الٹا والدین کو بچوں کا احسان مند بنا دیا بچے جب خود کفیل ہوئے اور انہیں والد کی طرف سے مالی مدد یا بیرونی احسانات کی ضرورت نہ رہی تو ان کا دوسروں پر انحصار ختم ہو گیا۔ اس صورت حال نے مجموعی طور پر مرد کی حاکمیت کو کمزور کیا یوں اس کی تعظیم و تکریم میں کمی واقع ہوئی۔ یہ صورت حال ایسے معاشرے کی تصویر کشی کرتی ہے جہاں معاشرے کے افراد جنس کی قید سے قطع نظر اپنے طور پر کھڑے ہونے کی صلاحیت رکھتے ہیں اور کسی مخصوص اتھارٹی یا اثر ورسوخ کے بغیر آزادانہ طور پر ذاتی ترقی کی راہیں ہموار کرتے ہوئے معاشرے کی ترقی میں اپنا حصہ ڈالتے ہیں۔

مشترکہ خاندانی نظام کے ختم ہونے سے بچوں پر دادا، دادی اور دیگر خاندان کے افراد کی طرف سے لگائی جانے والی بے جا پابندیاں ختم ہو گئیں یوں بے جا روک ٹوک ختم ہونے پر بچوں میں خود اعتمادی کے جذبات پیدا ہوئے اور ان کی ذہنی صلاحیتوں کو پنپنے کا موقع ملا۔ اس حوالے سے ہنس کی چال افسانے میں آج کے نوجوان اور آج سے کچھ برس پہلے کے نوجوان کی شخصیت کا تقابل کیا گیا ہے۔ افسانے کا مرکزی کردار عصر حاضر کے نوجوان بیٹے کا باپ ہے جو اپنے زمانے کو یاد کرتا ہے جب والدین کا رعب اور دبدبہ ہوتا تھا اور بچے

خوف زدہ رہتے تھے لیکن اب یہ حالات تبدیل ہو چکے ہیں۔ بچے کا باپ اپنے بچپن کو اور والدین کو یاد کرتا ہوا جب اپنے والد کا سوٹ زیب تن کیے ہوئے شیشے کے سامنے کھڑا ہوتا ہے تو اس کے بچے کا اس کی طرف دیکھ کر ہنسنا اور بنا کسی روک ٹوک کے اظہار بچوں کی خود اعتمادی کو اجاگر کرتا ہے۔

> "جب حیرت زدہ نگاہیں قہقہے کو دھکیلتی ہوئی سیڑھیوں کی طرف گئیں تو اسے وہاں ایک فیشن ایبل جوان لڑکا نظر آیا جو اسے دیکھ کر ہنسی سے لوٹ پوٹ ہو رہا تھا۔ تھوڑی دیر بعد ایک عورت کی مصنوعی ڈانٹ کی آواز آئی۔ "بیٹا کیا ہو گیا تمہیں، کوئی اس طرح ہنستا ہے؟" "ماما — ذرا دیکھو تو— پاپا کیسے کھڑے ہیں بالکل جیسے میوزیم میں کوئی اسٹیچو کھڑا ہو۔"(۲۳)

اقتباس میں بچے کی اپنے والد پر ہنسی اور اس کی ماں کی مصنوعی ڈانٹ بچے کی فکری اور ذہنی آزادی کی عکاس ہے۔ اس افسانے پر تنقید کرتے ہوئے طارق ہاشمی نے اس پہلو کی نشاندہی کی ہے کہ کس طرح بزرگوں کا سایۂ عاطف انسان کی شخصیت کو مسخ کر دیتے ہیں۔ اس میں بزرگوں کا احترام اور ان کے بنائے گئے اصولوں کی پاسداری تو ہوتی ہے لیکن فرد زندگی کے تخلیقی اسلوب سے محروم ہو کر گھٹن اور خوف کی زندگی بسر کرتا ہے۔(۲۴) معیار زندگی اور طرز زندگی کے حوالے سے افراد خانہ کی اقدار اور توقعات بدل گئی ہیں۔ رہنے سہنے، اٹھنے بیٹھنے، ملنے جلنے، کھانے پینے غرض کہ گفتگو ہر طرح سے ہمارے عادات و اطوار میں تبدیلی آگئی ہے۔ معاشرتی توقعات کے حوالے سے ارتقاپذیر معاشرتی اقدار اور اس طرز زندگی کو پاکستانی اردو فکشن میں مختلف کرداروں، مکالموں اور کہانی کے ذریعے اس طرح سے اجاگر کیا گیا ہے کہ وہ قوتیں جو نظام میں ترقی یا تبدیلی کو تحریک دیتی ہیں نمایاں ہو جاتی ہیں۔

مثلاً معروف افسانہ نگار آصف فرخی کے افسانے "Mac Arabia™ Meal" میں میاں بیوی دونوں کمانے والے ہیں اور افسانے کا آغاز اس طرح سے ہوتا ہے کہ بچوں کا باپ ہارون تھکا ہارا گھر آتا ہے لیکن بچے باہر کھانا کھانے جانے کے لیے تیار ہیں۔ پہلے گھر پر کھانا پکایا جاتا تھا لیکن اب تفریح طبع کے لیے ہوٹل پر بچوں کو لے کر جانا عام ہوتا جا رہا ہے، بچے بھی ہوٹل پر جا کر کھانے کی ضد کرتے ہیں اور والدین بچوں کی ایسی خواہشات پوری کرنے کے لیے مجبور نظر آتے ہیں تاکہ ان کے بچے اپنے عہد کے بچوں سے خود کو کسی طور بھی کم تر محسوس نہ کریں۔

"خود ہی سوچو، ہارون ہم دونوں ہی اتنی محنت کرتے ہیں۔ لیکن کیا فائدہ اگر ویک اینڈ پر
بچوں کو برگر، پیزا بھی نہ کھلا سکیں؟"(۲۵)

ہارون کی بیوی کا اس سے اس بات کے لیے قائل کرنا کہ ہماری محنت کا کیا فائدہ اگر ہم بچوں کو ہفتے کے ایک دن برگر پیزا وغیرہ بھی نہ کھلا سکیں۔ یہ دراصل جدید طرز زندگی، تفریح کے مواقع اور خاندانی سطح پر بدلتی ہوئی معاشرتی اقدار کے درمیان ظاہر ہونے والے تناؤ اور ان خدشات کو ظاہر کرتا ہے جن کا سامنا افراد کو اپنے وسائل اور ابھرتی ہوئی خواہشات کے ساتھ ہم آہنگ کرنے کے لیے کرنا پڑتا ہے۔ روایتی طور پر سخت محنت سے کمانا بنیادی سہولیات زندگی کی تکمیل کے لیے ضروری تھا لیکن عصری تناظر میں میاں بیوی کی سخت محنت اور جدوجہد اولاد کے لیے ہر طرح کی خوشیاں فراہم کرنے، خواہشات پوری کرنے، زندگی سے لطف اندوز ہونے اور جدید سہولیات کے مطابق زندگی کو ڈھالنے وغیرہ جیسے جذبات کی اہمیت کو اجاگر کرتا ہے۔ بچے ہر طرح کے جدید کھانوں کے بارے جانتے ہیں ناظر اور سمعیہ کے مابین ہونے والا مکالمہ اس بات کا عکاس ہے۔ مثال دیکھیے:

"یہ برگر نہیں پیٹا بریڈ ہے۔۔۔ ناظر سمیعہ کو بتاتے ہوئے ہمیں بھی بتا رہا تھا۔"(۲۶)

خاندان کے بہت سے اہم وظائف جو بچے کی سماجی تربیت میں اہم تھے اب دوسرے اداروں کے سپرد ہو گئے ہیں۔ اب بچے سوشل میڈیا اور دیگر پلیٹ فارمز پر مختلف چیزیں دیکھتے اور سیکھتے ہیں جب کہ آج سے کچھ سالوں پہلے تک والدین بچوں کو ادب و آداب سیکھاتے تھے۔ بچوں کے کھانے کے دوران ہارون کو یاد آتا ہے کہ کس طرح اس کی والدہ اسے ٹوکا کرتی تھیں کہ کھانا پلیٹ سے باہر نہ گرے۔ جب کہ اس کے اپنے دونوں بچے آپس میں فلموں کی باتیں کرنے میں مصروف تھے۔

"تم گراتے کس قدر ہو۔۔۔ بچپن میں امی مجھے ٹوکا کرتی تھیں۔ میں نے پلٹ کر ناظر
اور سمیعہ کی طرف دیکھا۔۔۔ وہ دونوں باتوں میں الجھے ہوئے تھے۔ "پتا ہے کرشمہ
کپور کے ڈیڈی بھی بہت فینسی اسٹار تھے!"(۲۷)

پہلے فلمیں دیکھنا برا سمجھا جاتا تھا اور بچوں کو فلم دیکھنے سے دور رکھا جاتا تھا مگر اب والدین اور بچے فلموں پر اپنے خیالات کا آزادانہ اظہار کر رہے ہیں اور بچوں کو چیزوں کے بارے میں والدین سے بھی زیادہ پتا ہے۔ غرض ہر طرح سے عادات و اطوار میں تبدیلی آتی جا رہی ہے۔ اس افسانے میں دو نسلوں کے رویوں کا تضاد عیاں ہوتا

ہے۔ آصف فرخی نے سمعیہ اور ناظر کو نئی نسل کے ایسے نمائندہ کرداروں کے روپ میں تراش ہے جو مقبول عام رجحانات کا گہرا علم رکھتے ہیں۔

پاکستان میں خاندانی ڈھانچہ عام طور پر بڑا ہوتا تھا جس میں گھر یا خاندان کا سرپرست عموماً خاندان کا سب سے بڑا مرد رکن ہوتا ہے۔ جو خاندان کے متعلق اہم فیصلے کرنے کا ذمے دار ہوتا ہے۔ حالیہ برسوں میں اس نظام میں تبدیلی وقوع پذیر ہوئی ہے۔ بچے الگ آزادانہ طور پر رہنے لگے ہیں۔ فرد خاندان کے ذریعے ہی معاشرے کی اقدار، رسم و رواج سیکھتے تھے، نیز خاندان بچوں کی تعلیم، کیریئر اور شادی کے حوالے سے اہم فیصلوں میں رہنمائی اور مدد کرتا تھا۔ پہلے بچوں کی شادی بیاہ کا فیصلہ خاندان کے بزرگ یا والدین لیتے تھے لیکن اب ایسے فیصلوں میں بچوں کی نہ صرف پسند کا خیال رکھا جانے لگا ہے بلکہ لڑکا اور لڑکی دونوں اپنا انتخاب والدین کو بتاتے ہوئے نظر آنے لگے ہیں یوں پاکستانی معاشرے کی یہ قدر بھی تبدیل ہونے لگی ہے۔ اسی طرح معاشرتی اصولوں اور اقدار کے لحاظ سے خاندان سے توقع کی جاتی ہے کہ وہ روایتی صنفی کردار کو برقرار رکھیں جس میں مرد بنیادی کمانے والا اور خواتین گھریلو فرائض سرانجام دیں لیکن پاکستانی معاشرے میں یہ بھی تبدیلی آرہی ہے اور اب مردوں کے ساتھ ساتھ خواتین بھی ملازمت کرتی ہیں اور بنیادی معمولات زندگی کی ضروریات واخراجات پورے کرنے کے لیے مرد اور عورت دونوں کا ملازمت کرنا ضروری ہوتا جارہا ہے۔ مشترکہ خاندانوں کی روایت میں تبدیلی جدید معاشرے میں رونما ہونے والی نمایاں تبدیلی ہے۔ بحیثیت مجموعی خاندان پاکستان کا ایک بنیادی معاشرتی ادارہ ہے جو افراد اور معاشرے کی مجموعی زندگی کی تشکیل میں اہم کردار ادا کررہا ہے۔ صحت مند معاشرے کی مضبوطی خاندان کے مرہون منت ہے۔

ب۔ معاصر افسانے میں سیاست اور اقتدار کی صورت حال

کسی بھی معاشرے یا ملک کی ترقی اور استحکام میں سیاست نمایاں کردار ادا کرتی ہے۔ یہ پورے ملک کے معاملات کا احاطہ کرتی ہے۔ معاشرے میں قانون کا نفاذ اور نظم و ضبط قائم کرنے والے ادارے نیز حکومت اور ملک کے عروج و زوال کی ذمے دار سیاست ہوتی ہے۔ حکومت کا مکمل نظام، عدلیہ کا نظام، ملک کا معاشی نظام، ملازمتوں اور مختلف عہدوں پر افراد کی تقرری، معاشرے میں امن و امان کا نظام، فلاح و بہبود کا نظام وغیرہ جیسے معاملات سیاسی اداروں کے وظائف کی ذیل میں شمار ہوتے ہیں۔ اس سارے نظام کا مقصد عوام کے لیے سہولیات زندگی فراہم کرنا ہوتا ہے جو ملک کے آئین اور وضع کردہ حدود و قیود کے مطابق اپنے کام کرتی ہیں۔ یہ سیاسی جماعتوں اور رہنماؤں پر منحصر ہے کہ وہ معاشرے کی ترقی کے لیے کن معاشرتی

قدروں کے فروغ کے لیے کوشاں ہیں۔ مثلاً اسلامی اصولوں پر مبنی پالیسیوں کو فروغ دے سکتے ہیں۔ مذہبی تعلیم پر زور اور اسلامی اصولوں کا سخت نفاذ وغیرہ۔ مختصر یہ کہ معاشرتی اقدار کو تشکیل دینے میں سیاسی ادارے اہم کردار ادا کرتے ہیں۔

پاکستان کے ملکی حالات میں سیاست کا اہم کردار ہے۔ پاکستان میں جمہوری نظام کو قدر کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے یہ پارلیمانی نظام سینیٹ، قومی اور صوبائی اسمبلیوں پر مشتمل ہوتا ہے۔ اس نظام کے تحت ملک میں وقفے وقفے سے انتخابات ہوتے ہیں جس میں عوام کے منتخب نمائندے حکومت کرتے ہیں اور عوام کو معاشی اور معاشرتی تحفظ فراہم کرنے کے ذمے دار ہوتے ہیں۔ یہ نظام ملک میں سیاسی عمل کو آزادیِ اظہار فراہم کرتا ہے جب کہ سیاسی نظام میں کمزوریوں کے باعث پاکستان میں طاقت کے زور سے حاصل کی گئی فوجی حکومتیں بھی رائج رہی ہیں۔ مارشل لاء سے سیاسی نظام خاصہ متاثر ہوا۔ اس قسم کے سیاسی حالات کی وجہ سے پاکستانی معاشرہ تیزی سے تبدیلی کی طرف گامزن ہے۔ ڈاکٹر مبارک علی نے "پاکستان اور تبدیلی کے محرکات" عنوان کے تحت تبدیلی کی چند بنیادی وجوہات کا جائزہ پیش کیا ہے جن کی بدولت پاکستانی معاشرے میں تیزی سے تبدیلی رونما ہوئی۔ اس مضمون میں پاکستان میں تبدیلی کا سب سے بڑا محرک سیاست کو قرار دیتے ہوئے اسے پنڈولم سے تشبیہ دی ہے جو کبھی آمریت اور کبھی جاگیردارانہ جمہوریت کے طور پر مسلسل متحرک ہے۔[۲۸] پاکستان کی سیاسی تاریخ میں فوج کی مداخلت کے حوالے سے بھی ایک تاریخ ملتی ہے جس کی وجہ سے جمہوری طرز حکمرانی میں رکاوٹیں حائل ہوتی رہی ہیں تاہم جمہوری اداروں اور عمل کو مضبوط بنانے کے لیے کوششیں جاری ہیں۔ اس صورت حال کو افسانہ نگاروں نے مختلف کرداروں کی کیفیات اور ان کے عمومی تجربات کو کہانی کے ذریعے وسیع مشاہدے اور عمیق مکالموں کے ذریعے بیان کیا ہے۔

محمد حمید شاہد کا افسانہ "ایک مسلسل زرگزشت" میں سیاسی صورتحال جس میں مارشل لا جو جمہوری لبادے میں عیاں ہوتا ہے اس دور میں اٹھائے جانے والے اہم اقدامات، سیاسی اداروں کے کھوکھلے پن اور سیاسی لیڈروں کی اجارہ داری کو موضوع بناتے ہوئے نجیب محسن جو ایک ایمان دار، قابل اور محنتی افسر ہے اس کی زرگزشت بیان کی گئی ہے کہ کیسے یہ سیاسی ہتھکنڈوں کے ہاتھوں رسوا و خوار ہوتا ہے۔ دراصل حکومتی عہدے دار جو نئے سیٹ اپ کے تحت وزارت عظمٰی میں آیا تھا اس کا سارا زور بینکوں پر تھا کہ وہ کرپٹ افراد کے خلاف ثبوت فراہم کرے۔ نجیب محسن کسی کو انصاف دلانے اور سیاسی اثر رسوخ رکھنے والے منیر احمد کھچی کے خلاف ملنے والے شواہد کی روشنی میں ایک مضبوط کیس بناتا ہے تاکہ مارشل لا کے کڑے احتساب میں کھچی

جیسے کرپٹ سیاست دانوں پر ہاتھ ڈالا جاسکے۔ نجیب کے مطابق کھجی جیسے کرپٹ سیاست دان کے خلاف "دھوکا دہی، نادہندگی اور ایک لحاظ سے سرکاری واجبات کے غبن کا ایسا کیس بن گیا تھا کہ یہ بدمعاش جیل میں ڈال دیا جاتا تو وہیں گلتا سڑتا رہتا۔"(۲۹) لیکن صورت حال سوچ کے برعکس پیش آتی ہے جہاں نجیب جیسے ایمان دار افسر کی مثال بطور قابل تقلید ہونی چاہیے تھی وہ الٹا سیاست کی بھینٹ چڑھ جاتا ہے۔ اس زرگزشت میں سماجی اور سیاسی صورت حال پورے جوبن سے عیاں ہوتی ہے۔ بڑھتی ہوئی کرپشن اور اس کے خاتمے کے لیے تحقیقات کرنے والوں کو جن دشواریوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے اس زرگزشت کے ذریعے اجاگر کیا گیا ہے۔ جہاں شعور و آگہی کے چلتے تغیر پذیر نظام نے کرپشن کے خلاف گھیرا تنگ کیا وہیں سیاسی اور آمرانہ ہتھکنڈوں سے نجیب جیسے آفسر زندگی سے ہاتھ دھو بیٹھتے ہیں یا پھر ان کے گھر والوں کو یرغمال بنایا جاتا ہے۔

پاکستانی سیاست کے موجودہ منظرنامے میں جمہوری نظریات اور سیاسی حقائق کے درمیان تفاوت پایا جاتا ہے۔ پاکستانی سماج میں سیاست جمہوریت کی آئینہ دار ہونے کی صورت میں سامنے نہیں آئی بلکہ ہمارے ہاں ووٹ دینے اور ووٹ حاصل کرنے کا تعلق اپنے مفاد اور خود غرضی کی حد تک ہوتا ہے۔ عوام بڑے مقاصد کے حصول کے لیے اپنا لیڈر منتخب کرنے کی صلاحیت نہیں رکھتی اور اسی طرح لیڈر بھی قوم کو ساتھ لے کر ملک چلانے کی صلاحیت نہیں رکھتا، یوں ووٹنگ کا عمل لین دین کا معاملہ بن گیا ہے۔ جس کی جڑیں خود غرضی میں پنہاں ہیں۔ ووٹر اپنی انتخابی سرمایہ کاری پر فوری منافع کی توقع کرتے ہیں جب کہ الیکشن کے دنوں میں عوامی نمائندے جن میں ممبران صوبائی اسمبلی (ایم پی اے) ہوں یا ممبران قومی اسمبلی (ایم این اے)، حکمرانی کے لیے عمومی طور پر علاقے کے چوہدریوں اور سرداروں جیسے مقامی طاقت کے دلالوں کا انتخاب کرتے ہیں اور انہیں اپنے مقاصد کے لیے استعمال کرتے ہیں۔ ان سے ملتے ہیں اٹھ کر سلام کرتے ہیں ان کے چھوٹے موٹے کام کرتے ہیں۔ بڑے کاموں کی یقین دہانی کرواتے ہیں لیکن جب عوام انہیں ووٹ دے کر سرکاری سطح پر عہدہ دلا چکے ہوتے ہیں تب یہ ان سے نظریں پھیر لیتے ہیں اور انتخابی مہموں کے دوران کیے گئے وعدے جو اکثر پر امید ہوتے ہیں وہ انتخابات کے بعد کی حکمرانی کی حقیقت کے بالکل برعکس ہوتے ہیں۔ بیان بازی اور عمل کے درمیان فرق رائے دہندگان کے درمیان مایوسی کو فروغ دیتا ہے۔ طاہرہ اقبال نے افسانہ "انتخاب" کے ذریعے ایک وسیع تر سیاسی رجحان کی نشاندہی کی ہے جو پاکستان میں ہونے والے انتخابات کے حوالے سے عوامی جذبات اور سیاسی رویوں کا عکاس ہے۔ جہاں سیاسی شخصیات اقتدار کی کشمکش، اور وزارتی عہدوں کے حصول کے لیے عوام کا استعمال کرتی ہیں۔ یہ ذہنیت سیاسی تانے بانے میں ایک گہرے مسئلے کی

عکاس ہے، جہاں عوام کا اپنے نمائندگان کے لیے جذباتی لگاؤ اور ان کے لیے جان کی بازی تک لگا دینا اور ووٹ کے حصول کے لیے نمائندگان کے رویے کو اجاگر کرتا ہے۔ افسانے میں انتخابات کی صورت حال بیان کرتے ہوئے چوہدری اور راجوں کے درمیان ہونے والی جنگ کی کیفیت کو اجاگر کیا گیا ہے۔ جس کا حاصل رسوخ کچھ بھی نہیں جیت جانے کے بعد پلٹ کر ان کا حال کوئی نہیں پوچھتا۔ انتخابات میں چودھری صاحب کا ملازم رمضان مخالفین کی گولی سے مر جاتا ہے اسی اثنا میں چودھری صاحب رمضان کے انصاف اور کفن دفن کے انتظامات کے لیے رانا صاحب کا انتظار کرتے ہیں کیوں کے جیت جانے کے بعد وہ پارٹی کی میٹنگ میں مصروف تھے۔ دوسری طرف گاؤں والوں کی ایک بڑی تعداد بھی رانا صاحب جو الیکشن جیت چکے تھے ان کے پاس اپنے مسئلے مسائل بیان کرنے کے لیے جمع ہوتے ہیں مگر ان سب کی امیدوں پر جیسے پانی پھر جاتا ہے اسے افسانے میں طاقت کے ڈھانچے میں پنپنے والے اخلاقی کٹاؤ پر ایک پُرجوش تبصرہ کے روپ میں حکمران طبقے اور عام آبادی کو درپیش حقائق کے حوالے سے ان الفاظ میں تحریر کیا گیا ہے:

> "بزرگوارو! رانا صاحب کو اور بھی سو کام ہیں۔ آخر انہوں نے وزارت بھی لینی ہے ایک لاش کے لیے تو وہ اپنے اتنے ضروری کام نہیں چھوڑ سکتے۔۔۔" اور پھر اکڑی ہوئی گردن کے ساتھ بل کھاتے برآمدوں میں ملازموں کی بھیڑ میں گم ہو گیا،۔۔۔ مغرب کی اذان سے ذرا پہلے ملازم تیز رفتاری سے باہر نکلا اور اعلان کے انداز میں بولا۔ "بھائیو بزرگو! رانا صاحب کو فوری طور پر اسلام آباد جانا پڑ گیا ہے۔ پارٹی کی ہائی کمان نے طلب کیا ہے۔ اب آپ لوگ تشریف لے جا سکتے ہیں۔"(۳۰)

اقتباس سے سیاسی اشرافیہ میں پائے جانے والے مروجہ رویے کی وضاحت ہوتی ہے جو انسانی اقدار اور ہمدردی پر ذاتی فائدے اور طاقت کو ترجیح دیتا ہے۔ ملازم کا وزیر کے حوالے سے گاؤں کے لوگوں کو دیا گیا پیغام سیاسی ذمے داریوں کے تئیں بے حسی اور نظر اندازی کو واضح طور پر پیش کرتا ہے۔ رانا صاحب کی مثال ہمارے پورے معاشرے کے سیاسی لیڈران کے رویوں کی عکاس ہے جو عوام کی ضروریات کو مدنظر رکھنے کے برعکس انسانی بنیادوں پر مفادات، عزائم اور اقتدار کے حصول کو ترجیح دیتا ہے۔ یہ افسانہ بیوروکریٹک فرائض اور سیاسی خواہشات کے حوالے سے ملک کے سیاسی منظر نامے میں پائی جانے والی بے حسی اور اخلاقی دیوالیہ پن پر کی جانے والی وسیع تر تنقید کی نشاندہی کرتا ہے اور پاکستان میں حکمران طبقے کی مروجہ ترجیحات پر سخت تبصرہ کرتا ہے۔ اس طرح کی ذہنیت حکمرانی کے ایک ایسے چکر کو برقرار رکھتی ہے جو اپنے فرائض کے برعکس عوام

کی حقیقی ضروریات اور خدشات سے الگ نظر آتا ہے۔ یہ رویہ ایسے سیاسی ماحول کو برقرار رکھتا ہے جو اجتماعی فلاح و بہبود اور سماجی بہبود کو ترجیح دینے کے لیے جدوجہد کرنے کے بجائے خود غرضی کے مقاصد اور سیاسی چالبازیوں پر توجہ مرکوز کرتا ہے۔ بیشتر افسانہ نگاروں نے اس صورت حال کو افسانوں میں پیش کیا ہے۔ مبین مرزا کے افسانے "خوف کے آسمان تلے" کا مرکزی کردار پروفیسر کیانی اور اس کا خاندان بھی کس طرح ان سیاسی ہتھکنڈوں کے ہاتھوں تشدد اور دہشت کا نشانہ بنتے ہیں اس کی عمدہ عکاسی کی گئی ہے۔ جہاں انہیں زبردستی ووٹ ڈالنے پر آمادہ کیا جاتا ہے۔

> "ایک ایک ووٹ قیمتی ہوتا ہے سر! اس ادھیڑ عمر آدمی نے مسکرا کر کہا۔ آپ بس فوراً چلے جایئے۔" پانچویں بار تو یاد دہانی نہ کروانے آئیں نہ ہم۔" اس نے ذرا ٹیڑھی نظروں سے پروفیسر صاحب کو دیکھا جیسے کہنا چاہتا ہو کہ اگر پانچویں بار بتانا پڑا تو کسی اور انداز میں بتایا جائے گا۔"(۳۱)

اس سارے منظر نامے میں پروفیسر اور ان کے اہل خانہ خوف کے مارے ووٹ دینے تو چلے جاتے ہیں مگر سوچتے ہیں کہ اس کسی اور غیر اہم امید وار کو ووٹ دے دیں گے لیکن اس دوران بھی ان پر خوف کا سایہ منڈلاتا رہتا ہے کہ کہیں انہیں مہر لگاتے ہوئے کوئی دیکھ نہ لے جس سے ان کے خاندان کو مشکل حالات کا سامنا کرنا پڑے۔ پروفیسر صاحب پر سیاسی جبر کی یہ کیفیت کہانی کے اختتام تک جاری رہتی ہے۔ ووٹ دے کر الیکشن دفتر جیتنے والے کو میٹھائی کھلا دینے کے بعد انہیں کچھ تسلی ہوتی ہے۔ یہ پورا بیانیہ ہی خوف اور جبر کے ہاتھوں مجبور سادہ اور ایمان دار افراد کی زندگی کا نقشہ ہے۔

ہمارے معاشرے کا ایک عام رویہ بن چکا ہے کہ سیاست کے لیے عوام آپس میں لڑ رہے ہیں ایک دوسرے کا نقصان کر رہے ہیں ملک میں توڑ پھوڑ مچاتے ہیں گولیاں برساتے ہیں مگر سیاست دان بس ووٹ لینے عوام کے پاس پہنچ جاتے ہیں۔ سیاسی جماعتیں اپنے مقاصد کے حصول کے لیے کس طرح معصوم افراد کو لقمہ اجل بنانے پر تلی ہوئی ہیں اور پارٹی کو اقتدار کے زینے چڑھانے کے لیے کیا کیا جتن کیے جاتے ہیں۔ اس کی تصویر کشی محمد حامد سراج کے افسانے "موت کھلیان" میں بھی ملتی ہے۔ "موت کھلیان" میں سیاسی دہشت گردی اور جرائم پیشہ افراد کے جذبات کہانی کا خارجی ڈھانچہ تشکیل دیتے ہیں۔ شاردا استاد کا کردار ایک ایسے مشہور ڈکیت کے طور پر نمایاں ہوتا ہے جو اپنے کام میں ایمان دار ہے اور جرائم کی دنیا میں اس کے کچھ اصول ہیں جن پر یہ عمل پیرا رہتا ہے جب کہ سیاست دان الیکشن جیت کر کرپشن، جھوٹ، دھوکا دہی سے کام لیتے

ہیں۔ ان کے لیے الیکشن جیت کر عوام کو لوٹنا اور ملک سے بھاگ جانا ایک باعزت پیشہ بن گیا ہے۔ یہ لوگ اپنے مفاد کے لیے کسی کا بھی استعمال کرتے ہیں اس کا اظہار شاردا استاد اس طرح سے کرتا ہے:

"سیاست دانوں کے لیے جو کھیل ہم کھیلتے ہیں، کھیل ختم ہونے پر اکثر وہ ہمیں پولیس مقابلے میں گولی مروا دیتے ہیں۔ تف ہے ایسی زندگی پر۔۔۔"(۳۲)

افسانے کا یہ سیاق سیاست دانوں کی طرف سے ترتیب دی گئی موروثی ہیرا پھیری کو عیاں کرتا ہے کہ کیسے سیاست دان عوام کو سیاسی کھیلوں یا چالوں میں اپنے اپنے ایجنڈوں کی تکمیل کے لیے شامل کرتے ہیں اور جب ان کی سیاسی افادیت ختم ہو جاتی ہے تو یہ کردار مہلک نتائج کا سامنا کرتے ہیں مثلاً پولیس کی طرف سے کیے گئے انکاؤنٹر میں ان کو مروایا جاتا ہے۔ پیش کردہ اقتباس حکمران طبقے کی طرف سے کی جانے والی سیاسی چالوں اور سازشوں کی نشاندہی کرتا ہے جہاں کمزور افراد کو سیاسی کھیلوں میں اوزار کے طور پر استعمال کیا جاتا ہے۔ پاکستان کے سیاسی حالات سیاسی پارٹیوں میں پائے جانے والے اختلافات کی وجہ سے آئے دن بدتری کی طرف گامزن ہیں۔ ان سیاسی جماعتوں کا اپنا نظریاتی اور مفادی ایجنڈا ہوتا ہے جب کہ پاکستانی عوام بہتر مستقبل، معاشی اور معاشرتی حالات کی منتظر سیاسی چکرویو میں مختلف جماعتوں کی حمایت میں ایک دوسرے سے اختلاف رکھتے ہیں اور یہی اختلافات عوام میں تشدد اور فساد کی وجہ بن جاتے ہیں۔ سید زبیر شاہ کا افسانہ "برفاب زمانے" میں پاکستانی عوام کی حالت زار کو فصاحت کے ساتھ بیان کیا گیا ہے جو ہر شے سے ماورا ان کی زندگی پر چھائے ہوئے جمود کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ جہاں آنے والی حکومتیں عوام کی زندگیوں کو بہتر بنانے کے حوالے سے کیے گئے اپنے وعدوں کو پورا کرنے میں اکثر ناکام رہی ہیں۔ حکمرانوں کی جانب سے کیے گئے وعدوں کے نتیجے میں عام آدمی کے معیار زندگی میں کوئی واضح تبدیلی نہیں آئی۔ غربت ایک خوفناک چیلنج بنی ہوئی ہے، اس صورت حال نے عوام میں مایوسی اور ناامیدی کے جذبات کو جنم دیا ہے۔ یوں افسانہ حکمران اشرافیہ کی اہلیت اور عزائم کے بارے میں عوام میں پائے جانے والے گہرے شکوک و شبہات کی عکاسی کرتا ہے۔

"ملک میں کسی چیز کا بحران نہیں، سوائے انسانیت اور آدمیت کے۔۔ یہ سب امریکا کی پالیسیوں پر چل رہے ہیں۔ غریبوں کے ذریعے ہنگامے کروا کر اس ملک کو ختم کرنا چاہتے ہیں۔ ہمارے حکمران اس ملک کا سودا کر چکے ہیں۔"(۳۳)

اقتباس ملک کے سیاسی فریم ورک میں انسانی اقدار کی بے توقیری، خاص طور پر عوام کا سیاسی رہنماؤں پر عدم اعتماد اور پائیدار ترقی کے لیے بنائی جانے والی ملکی پالیسیوں پر بیرونی اثرات جو خود مختار فیصلہ سازی کی راہ میں رکاوٹ بنے ہوئے ہیں۔ ملک کو مبینہ طور پر بیچنے اور حکمران اشرافیہ کا ذاتی فائدے کے لیے یا بیرونی طاقتوں کے کہنے پر ملکی مفادات سے سمجھوتہ کر لینا عوام کی طرف سے رہنماؤں پر عدم اعتماد کے گہرے جذبات کی عکاسی کرتا ہے۔ افسانے کی کہانی مزدور طبقے سے تعلق رکھنے والے دو بھائیوں اظہر اور اصغر کے کردار کے ذریعے آگے بڑھتی ہے۔ افسانہ نگار نے اس کہانی کو مابعد جدید دور کی عکاسی کے لیے ادبی دنیا سے منٹو کے افسانے "نیا قانون" کو آگے بڑھایا ہے منٹو کا کردار استاد منگو دراصل اظہر اور اصغر کے دادا کے طور پر لیا گیا ہے۔ استاد منگو ایک نئے دن، نئے قانون کی امید اس دور میں لیے ہوئے تھا جب اس کے عہد میں انگریزوں کا تسلط تھا مگر آج اس کے پوتے بھی انہی حالات سے گزر رہے ہیں۔ اسی کی طرح ان پڑھ ہیں ان کے گھر غربت اور افلاس کے ڈیرے ہیں مگر سیاسی حالات پر ان کی گہری نگاہ ہے اور اچھے دنوں کے انتظار میں زندگی بسر کر رہے ہیں۔ دونوں بھائی دو مختلف سیاسی پارٹیوں سے امیدیں وابستہ کیے ہوئے ان کے حق میں گفتگو کرتے ہوئے اکثر آپس میں جھگڑا کرنے لگ جاتے، مگر ان میں اظہر تحمل مزاج ہے جب کہ اصغر بدزبان اور مخالف پارٹی کے لیے گالم گلوچ سے کام لیتا ہے جیسے جیسے کہانی آگے بڑھتی ہے دونوں بھائی اپنی پارٹیوں سے مایوس نظر آتے ہیں اظہر کا تحمل بھی ٹوٹ جاتا ہے اور وہ کسی سیاسی رہنما کو جوتا مار دیتا ہے اس واقعے کے ایک دن بعد سے اظہر لاپتہ ہو جاتا ہے اور اصغر کے رویے میں تبدیلی اور خاموشی آ جاتی ہے۔ منٹو کے افسانے کو کہانی کی نئی ڈگر میں ڈھالنا ظاہر کرتا ہے کہ نوآبادیاتی دور میں رائج بعض مسائل آج بھی کس طرح برقرار ہیں۔ استاد منگو کی برطانوی دور میں نئے قانون کی امید تبدیلی، ترقی اور سماجی ترقی کی امنگوں کی آئینہ دار ہے۔ تاہم کہانی کی جدید مطابقت اظہر اور اصغر کے کردار کے ذریعے سماجی و اقتصادی بدحالی کو نمایاں کرتی ہے۔ وقت گزرنے اور سیاسی منظر نامے کے بدلنے کے باوجود غربت، تعلیم کی کمی اور حق رائے دہی سے محرومی کے بنیادی چیلنجز آج بھی برقرار ہیں۔ افسانہ ان جذبات کی بازگشت ہے جو زمانے اور سیاسی سیاق و سباق میں تبدیلیوں کے باوجود عصری سیاسی اور سماجی و اقتصادی ماحول میں حقِ رائے دہی سے محروم افراد کو درپیش مسلسل چیلنجز کی ایک واضح تصویر پیش کرتے ہیں۔

مسعود مفتی کے افسانوں میں پاکستان کے ماضی اور موجودہ حالات کا تقابل پیش کیا گیا ہے۔ ان کا افسانہ "کل اور آج" پاکستان کے سیاسی حالات کا نمائندہ ہے۔ افسانہ تاریخی اعتبار سے ۱۹۷۱ء اور ۲۰۰۶ء میں درپیش

سیاسی اور معاشرتی حالات کی تصویر کشی کرتا ہے۔ ماضی کے دنوں کی بازگشت، سقوط ڈھاکہ کے وقت افسران کی گمشدگی، احتساب، سیاسی بدامنی اور انسانی حقوق کی خلاف ورزیاں جو بظاہر حل نہ ہو سکیں انہیں جدید دور کے ملکی حالات کے تناظر میں اجاگر کیا گیا ہے۔ بظاہر کہانی ائیر پورٹ پر ایک لڑکی کی اجنبی بزرگ سے ہونے والی ملاقات کا حال سناتی ہے جس میں لڑکی کو بوڑھے شخص سے ملاقات کے بعد ۳۶ برس پہلے اپنے باپ کی گمشدگی اور اس کی والدہ کو اعلیٰ عہدے پر ملنے والی ملازمت یاد آجاتی ہے۔ لڑکی اس اجنبی بوڑھے شخص کا شکریہ ادا کرتی ہے کہ اسی کی وجہ سے آج وہ اچھی زندگی گزار رہی ہے کیوں کہ اس دور میں اسی اجنبی شخص نے ان کی والدہ کو ملازمت دی تھی۔ لڑکی جب اپنے والد کی گمشدگی کے بارے میں جاننے کی کوشش کرتی ہے تو وہ بوڑھا شخص جو اس دور میں بھرتی ہونے والا نیا افسر تھا وہ بتانے پر مجبور ہو جاتا ہے کہ اس نے اپنے طور پر تحقیقات کیں اور اس دور میں جن لوگوں نے لڑکی کے باپ کو غائب کیا تھا آج انہی لوگوں نے اس افسر کے بیٹے کو غائب کر دیا ہے۔ اس میں حال اور مستقبل کا موازنہ اس تصور کی نشاندہی کرتا ہے کہ حکمرانی سے متعلق ماضی کے مسائل عصری دور میں تبدیل شدہ شکلوں میں نہ صرف برقرار ہیں بلکہ بدتر ہو گئے ہیں۔ عصری دہشت گردی عالمی تناظر میں پاکستانی پاسپورٹ کی ساکھ میں کمی کا سبب بنا یوں دنیا بھر میں پاکستانی مسافروں کے بارے میں شکوک و شبہات اور بداعتمادی کا تاثر پیدا ہوا۔ افسانے میں اس صورت حال کا اثبات یوں کیا گیا ہے:

> "آج کل پاکستانی پاسپورٹ بہت بے توقیر ہو چکا ہے کیونکہ دہشت گردی کے خلاف جنگی اتحاد میں ہماری حکومت خود اتنے پاکستانیوں کو امریکہ کے حوالے کر چکی ہے کہ دنیا والے اب ہر پاکستانی مسافر کو شک کی نظر سے دیکھتے ہیں۔"(۳۴)

انسداد دہشت گردی کے باعث تشکیل پانے والے حالات کی وجہ سے حکمرانوں نے کڑے فیصلے کیے اور ایسے افراد جن کا شدت پسندانہ سرگرمیوں سے تعلق کا شبہ ہوتا انہیں امریکہ کے حوالے کرنا وغیرہ جیسے فیصلوں نے نادانستہ طور پر پاکستان کے شہریوں کی مجموعی ساکھ کو داغدار کیا۔ سیاسی ایوانوں میں کیے گئے فیصلوں کی تاثیر کسی بھی قوم کی روش کو تشکیل دیتی ہے۔ عالمی طاقتوں کی باریک چالیں، مقامی اور بین الاقوامی رہنماؤں کی سازشیں، بیرونی دباؤ، سفارتی حکمت عملی اور سیاسی شخصیات کے عزائم مسعود مفتی کے افسانے "آسیب" میں بھی اجاگر کیے گئے ہیں۔

"حاکموں کی خود غرضانہ پالیسیوں سے غربت اور بے روزگاری عام ہونے لگی۔۔۔ فرقہ واریت مسجدوں کے اندر باہر خون کی ہولی کھیلنے لگی۔۔۔ ہر آج گزشتہ کل سے بدتر۔۔۔ عوام خوفزدہ۔۔۔ حاکم بے پرواہ۔۔۔"(۳۵)

اقتباس سیاسی اداروں کی صورت حال کا تجزیہ پیش کرتا ہے کہ سیاسی دائرے میں کیے گئے فیصلے سماجی و اقتصادی حالات پر کس طرح براہ راست اثر ڈالتے ہیں۔ فرقہ واریت کا عروج، مساجد کے اندر اور باہر خون ریزی کا باعث بننا سماجی اقدار میں تبدیلی اور تفرقہ انگیز پالیسیوں کی وجہ سے فرقہ وارانہ ہم آہنگی کے زوال کی نشاندہی کرتا ہے۔ اس افسانے میں بھی ملک کے بدتر حالات کا نقشہ ماضی اور حال کے موازنے کے ساتھ پیش کیا گیا ہے۔ روز بروز بگڑتے حالات کی تصویر کشی، عوام میں خوف کا احساس، امن وامان اور بھائی چارے کی جگہ بے پروائی حکمران طبقے کی بے حسی کو ظاہر کرتا ہے۔ ان کے افسانے "سرگوشی" میں پاکستان کے ابتدائی دور میں ہونے والی حیرت انگیز ترقی، مہاجرین کی آبادکاری، بین الاقوامی کھلاڑی، قابل رشک ریلوے، پی آئی اے اور واپڈا جیسے اداروں کی مثال دی گئی ہے کہ کیسے ان تمام میدانوں میں ترقی ہوئی لیکن ساتھ ہی موجودہ حالات کی بے سروسامانی کی وجوہات کو بھی اجاگر کیا گیا ہے۔ مسعود مفتی نے آج کے پاکستان کا نقشہ ان الفاظ کے ذریعے کھینچا ہے:

"آج ۲۰۰۹ء میں ہمارے وطن میں بیرونی طاقتوں کے پاس پاکستان کی زمین، مکانات، اثاثے اور اداروں کی سستی فروخت کے چرچے ہیں۔ بنگال کے قحط جیسی مصنوعی قلت سے لوگوں کی خودکشی اور اولاد فروشی کی خبریں ہیں۔ امور مملکت میں بیرونی دخل اندازی کا تاثر ہے۔ حاکمیت (Sovereignty) کا دامن تار تار ہے اور مبہم سرکاری وضاحتوں اور بیانات کی بے توقیری ہے۔"(۳۶)

پاکستانی سیاست میں تشویشناک منظرنامے کی تصویر کشی سے شدید سماجی اقتصادی بحران کی نشاندہی ہوتی ہے۔ مجموعی طور پر، یہ حوالہ پاکستان میں عدم استحکام، معاشی تناؤ، سمجھوتہ شدہ خودمختاری، سماجی اور سیاسی بدحالی کے وسیع احساس کی ایک سنگین تصویر پیش کرتا ہے۔ جمہوری نظام میں کڑے احتساب نے اس صورت حال کو سنگین بننے سے روکنے کے لیے اہم اقدامات کیے ہیں۔ پاکستان میں سیاسی عدم استحکام پایا جاتا ہے اور جمہوری حکمرانی کے ادوار فوجی بغاوتوں کے ساتھ جڑے ہوئے ہیں۔ جمہوری حکومت اپنے بنیادی اصولوں کی وجہ سے فوجی حکومتوں سے برتر سمجھی جاتی ہیں کیوں کہ جمہوریت عوام کی آزادانہ اجتماعی آواز اور ضروریات کو

ترجیح دیتے ہوئے ان کے تحفظ کو یقینی بنانے میں معاون ہوتی ہے نیز اپنے افعال کے حوالے سے عوام کو جوابدہ ہوتی ہے جب کہ آمرانہ طرز حکمرانی آزادی کو محدود کر دیتی ہے، جو ممکنہ طور پر انسانی حقوق کی تنزلی اور عدم استحکام کا باعث بنتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ عوام میں اس نظام کے خلاف نفرت کے جذبات دیکھنے کو ملتے ہیں۔ عوام کے ایسے جذبات کی عکاسی ڈاکٹر شفیق انجم کے افسانے "زندگی سیہ پوش" کے ذیل میں پیش کردہ اقتباس سے اجاگر ہوتی ہے:

> "یہ سب ان کا کیا دھرا ہے۔ اور ان کا بھی جو وردیاں پہنے اکڑا اکڑ چلتے ہیں۔۔۔ اندھے، بہرے، گونگے۔۔۔ انہیں ہم نے اپنا نوکر رکھا تھا اور بندوقیں دے کر گھر کے دروازے پر بٹھایا تھا لیکن یہ ایسے خبیث ہیں کہ محافظت کی آڑ میں پورے گھر پر قابض ہو بیٹھے ہیں۔ اور اصل قصور تو انہی کا ہے۔ تف ہے ان پر۔ میں تھوکتا ہوں۔۔۔ جبر کے ہر نقش پر"(۳۷)

پاکستان میں سیاست اور فوجی اسٹیبلشمنٹ سے مایوسی اور عدم اطمینان کے جذبات کی عکاسی "زندگی سیہ پوش" میں اجاگر کی گئی ہے۔ اقتباس میں گھر سے مراد ملک ہے جس کی حفاظت فوج کے ذمے ہے لیکن حکمرانی کے مختلف شعبوں میں فوج کا اثر و رسوخ اس تاثر کی طرف اشارہ کرتا ہے کہ جنہیں قوم کی سلامتی سونپی گئی وہ تحفظ کی آڑ میں پورے ایوان پر قابض ہونے لگے۔ فوج یا قائم کردہ طاقتیں قوم کی حفاظت کے حیلے سے سویلین گورننس یا عوامی آزادی کی خلاف ورزی کرنے لگیں۔ افسانہ نگار نے آمریت کی ہر صورت کے خلاف مزاحمت کرتے ہوئے اسے مسترد کیا ہے، جو پاکستان کے سیاسی منظر نامے سے جابر قوتوں کے خاتمے کے خلاف ایک آواز اور ایسی حکومتوں سے مایوسی کے جذبات کی بازگشت ہے۔ افسانہ نگار نے کہانی میں اس صورت حال کو بھی قلم بند کیا ہے کہ ایسے فوج یا ناانصافی کے خلاف آواز بلند کرنے والوں کو کن ممکنہ مسائل سے گزرنا پڑتا ہے۔ افسانے میں جہاں ملکی حالات کا ذمے دار سیاسی اداروں کو قرار دیا گیا ہے وہیں یہ بھی باور کروایا گیا ہے کہ اس بگاڑ کا ذمے دار کوئی ایک نہیں لہٰذا بوڑھا شخص اس جوان خون کو مخاطب کر کے کہتا ہے کہ: "ناحق کسی روز یہ واویلا کرنے پر تو دھر لیا جائے گا اور پھر کچھ خبر نہ ہو گی کہ تو کہاں ہے۔ سو چپ رہا کر چپ رہنے ہی میں عافیت ہے۔"(۳۸) یہ ایک ایسے منظر نامے کی تصویر کشی کرتا ہے جو عوام پر جبری پابندیاں عائد کرنے کا ذمے دار ہے۔ جس سے عوام میں خوف و ہراس پایا جاتا ہے اور وہ ناانصافیوں کے خلاف آواز اٹھانے کی بجائے خاموشی اختیار کرنے پر مجبور نظر آتے ہیں۔

جمہوری سیاست کے حوالے سے بھی عوامی جذبات سماجی و اقتصادی پس منظر میں مختلف ہیں۔ بہت سے پاکستانی جمہوریت کے اصولوں کی قدر کرتے ہیں۔ لیکن بہت سے لوگ حکمرانوں کی کارگردگی سے مایوس نظر آتے ہیں کیوں کہ یہ اہم مسائل، معاشی چیلنجز، بدعنوانی وغیرہ کے حل میں ناکام رہے ہیں۔ سیاسی نظام میں احتساب کی کمی کی وجہ سے عوام میں سیاست دانوں کے خلاف ایک حد تک نفرت پائی جاتی ہے اور ملک کے مختلف حصوں میں بدامنی اور خلفشار کے واقعات رونما ہوتے رہتے ہیں۔ ان سیاسی حالات کو شفیق انجم نے افسانہ "شور میں گم ماتم" میں اس طرح سمویا ہے کہ یہ نہ صرف سیاسی تناظر میں معاشرتی رویے اجاگر کرتا ہے بلکہ افراتفری، الزامات، انکشافات اور بدامنی کے بھنور میں پھنسے معاشرے کی واضح تصویر کشی کرتا ہے۔

> "فلاں چور ہے، فلاں راشی، فلاں نے اتنے کھائے، اتنے بانٹے، اتنے غائب کیے۔ بندے بندے کا ذکر چلتا ہے، فلاں کی بیٹی فلاں کی بہن، گھر گھر کا دروازہ کھولا، پردے اٹھا اٹھا شرمگاہیں تلاش کی جاتی ہے۔۔۔ کچھ بدلاؤ کی کہانی ہے۔۔۔ کہیں کچھ لوگ جمع ہیں۔ نعرے لگ رہے ہیں، جوش ہے، واویلا ہے۔۔۔ کوئی سڑک، کوئی چوک، کوئی شہر بند ہے۔۔۔ کچھ جل رہا ہے کچھ جلایا جا رہا ہے۔"(۳۹)

یہ ایک ایسے بیانیے کی عکاسی کرتا ہے جہاں معاشرے کو ہنگامہ خیزی میں گھرا ہوا، اشتعال اور بدامنی کی حالت میں دکھایا گیا ہے۔ پاکستان میں مختلف میڈیا پلیٹ فارمز نے بھی جمہوری سیاست کے بارے میں رائے عامہ کی تشکیل میں اہم کردار ادا کیا ہے۔ وہ مسائل کو اجاگر کرکے، بدعنوانی کو بے نقاب کرنے، مخصوص سیاسی جماعتوں یا رہنماؤں کے بارے میں تاثرات قائم کرنے اور عوامی جذبات کو متاثر کرنے میں اہم کردار ادا کر رہے ہیں۔ میڈیا جھوٹ کو سچ، سچ کو جھوٹ بنا کر اپنے مخصوص لیڈران کی پیروی کر رہے ہیں۔ دور جدید میں میڈیا ایک ایسا ذریعہ بن چکا ہے جو کسی کو بھی عوام کی نظر میں پروان چڑھا سکتا ہے اور کسی کو بھی گرا سکتا ہے۔ حمیرا اشفاق کا افسانہ "ادھورا مقدمہ" ایک ایسے مقدمے کی روداد ہے جس میں تمام اداروں کے افعال پر کڑی تنقید کی گئی ہے۔ افسانہ قتل میں ملوث طاقتور افراد کے خلاف مقدمہ لڑنے والی خاتون وکیل پر مرکوز ہے جو دس لوگوں کے قتل کا مقدمہ لڑتے لڑتے زندگی سے ہاتھ دھو بیٹھتی ہے اس کی موت کے پس منظر میں وہ تمام کردار متحرک نظر آتے ہیں جن کے خلاف اس کا مقدمہ تھا۔ بظاہر اس مقدمے کی وجہ سے اس کو اتنی اہمیت مل چکی تھی کہ ہسپتال کے بستر پر دور دور سے بڑے بڑے لوگ اسے ملنے آ رہے تھے۔ کیس کی سماعت کے دوران سینئر وکلا کی آپس میں اس حوالے سے گفتگو کہ اس لڑکی کو سمجھاؤ جن کے خلاف مقدمہ لڑ رہی ہے

وہ طاقت ور لوگ ہیں اور جس کے سامنے یہ واویلا کر رہی ہے اس کے پاس لکھے لکھائے فیصلے آتے ہیں اس نے صرف پڑھ کر سنانا ہوتے ہیں[۴۰] یہ گفتگو اداروں کی نااہلی کا منہ بولتا ثبوت ہیں۔ یہ بیانیہ بااثر شخصیات اور اداروں کے خلاف حق کے لیے کھڑے ہونے والے فرد کو درپیش خطرات، عوام اور خواص کے لیے بنائے جانے والے قوانین کے عمل درآمد کے حوالے سے معاشرتی تضاد اور اداروں کی ناکامی کو اجاگر کرتا ہے۔ مجموعی طور پر اس کہانی کا تجزیہ معاشرے میں طاقت، ادارہ جاتی خامیوں اور نظام کی افراتفری میں انصاف کے حصول کی جدوجہد پر روشنی ڈالتا ہے اور اس طرح کی قانونی لڑائیوں کے وسیع تر معاشرتی مضمرات پر تبصرہ کرتا ہے۔

پاکستان کی سیاسی صورت حال معاشرتی اقدار کے تغیر میں متحرک رہی، سیاسی اداروں میں ہونے والی تبدیلیوں نے سماجی اقدار، اصولوں اور طرز عمل پر نمایاں اثرات مرتب کیے۔ خواہ پالیسی سازی ہو، طرز حکمرانی ہو، یا بین الاقوامی تعلقات، ان تبدیلیوں نے پاکستانی معاشرے کے سماجی رویوں، طرز عمل اور اقدار کو تشکیل دینے اور تبدیل کرنے میں نمایاں کردار ادا کیا ہے۔ پاکستان کی سیاسی تاریخ فوجی حکمرانی اور جمہوری حکمرانی کے ادوار سے متاثر رہی ہے۔ عصر حاضر میں شفافیت، احتساب اور منصفانہ انتخابی عمل کے لیے عوامی مطالبات میں اضافے کے ساتھ جمہوری نظام پر زور دیا جارہا ہے۔ سیاست میں نوجوانوں کی شمولیت میں نمایاں اضافہ ہوا ہے۔ نوجوان نسل سیاسی طور پر زیادہ باشعور ہو رہی ہے، تبدیلی کا مطالبہ کر رہی ہے اور سیاسی مباحثوں اور تحریکوں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لے رہی ہے۔ سیاست میں خواتین کی شرکت کے حوالے سے بھی معاشرتی رویوں میں بتدریج تبدیلی آرہی ہے۔ صنفی مساوات کو فروغ دینے اور سیاسی اداروں میں خواتین کی نمائندگی کے حوالے سے پیش رفت ہوئی۔ ٹیکنالوجی اور سوشل میڈیا کے پھیلاؤ نے متنوع آوازوں اور نقطہ نظر کے لیے پلیٹ فارم فراہم کیا ہے جس کی وجہ سے پہلے سے زیادہ باخبر اور مربوط معاشرہ تشکیل پانے لگا۔ ملک جامع، شفاف اور جوابدہ سیاسی نظام کی راہ پر گامزن ہے۔ سیاسی اداروں کو ان بدلتی ہوئی معاشرتی اقدار کے مطابق ڈھالنا ہو گا تاکہ مضبوط اور ذمہ دار سیاسی نظام وجود میں آسکے نیز سیاسی مسائل کو حل کرنے کے لیے سیاسی کلچر کا از سر نو جائزہ لینے کی ضرورت ہے جس سے نمائندے اپنے مفاد سے زیادہ معاشرے اور عوام کی بھلائی کا عزم رکھتے ہوں۔ ایسی تبدیلیوں کے ذریعے ہی پاکستان ایک ایسے سیاسی منظر نامے کے قیام کی امید کر سکتا ہے جو حقیقی معنوں میں جمہوریت کے اصولوں کا آئینہ دار ہو۔

ج۔ معاصر افسانے میں مذہب اور جدیدیت

مذہب مہذب معاشروں میں تعمیر و اصلاح کے لیے اعلیٰ اخلاقی اور معاشرتی اقدار کا اطلاق کرتا ہے۔ جو افراد کو زندگی کے معنی، مقصد، اپنے ارد گرد کے ماحول اور دنیا کو سمجھنے میں معاون ہوتا ہے۔ معاشرتی ادارے کے طور پر مذہب کئی کام انجام دیتا ہے خاص طور پر معاشرتی اصولوں اور اقدار کو تشکیل دینے میں مذہب رہنما اصول فراہم کرتا ہے۔ ڈرخائم نے معاشرتی نقطہ نظر سے مذہب کی تعریف کرتے ہوئے کہا کہ:

> "A religion is a unified system of beliefs and practices relative to sacred things, beliefs and practices which unite into one single moral community."(۴۱)

"مذہب عقائد و رسومات کا ایسا مربوط نظام ہے جو مقدس اشیا سے نسبت رکھتا ہے وہ عقائد اور اعمال جن کی بنیاد پر واحد اخلاقی برادری متحد رہتی ہے۔"

مذہب انسانی معاشرے اور انفرادی شناخت کے تانے بانے کے ساتھ جڑی ہوئی ایک گہری قوت کے طور پر کام کرتا ہے، اجتماعی شعور کو تشکیل دیتا ہے اور ذاتی عقائد کو متاثر کرتا ہے۔ متعدد ممالک میں پوری قوم ایک ہی مذہب سے تعلق رکھتی ہے جبکہ کئی ممالک میں مختلف مذاہب سے تعلق رکھنے والے لوگ ایک ساتھ رہتے ہیں جہاں کے لوگوں کا خیال ہے کہ تمہیں تمہارا مذہب عزیز ہمیں ہمارا مذہب بس کسی بھی عمل یا سرگرمی سے کسی دوسرے کی ذات کو تکلیف نہ پہنچے۔ مذہب کا یہ جوہر انفرادی عقیدے کی حدود سے بالا تر ہے۔ یہ اخلاقی حدود کو متعین کرنے، اخلاقی اقدار کو فروغ دینے، سماجی ہم آہنگی کو فروغ دینے، اچھے اور برے میں فرق کرنے اور ایک مہذب اور مربوط معاشرے کو فروغ دینے میں معاون ہے۔ مذہب انسان میں برداشت، نیکی اور بدی کی پہچان کے ساتھ ایک معاشرے کو مہذب طریقے سے استوار کرنے میں اہم کردار ادا کرتا ہے۔ یوں مذہب انسانی وجود کے انفرادی اور معاشرتی دونوں پہلوؤں کی تشکیل میں معاون ہے۔

پاکستان کے معاشرتی ڈھانچے میں مذہب کا بہت اہم کردار ہے۔ پاکستان کا وجود اور اس کی بنیاد میں جن نظریات نے اہم کردار ادا کیا اس میں مذہب اسلام سرفہرست ہے تاکہ مسلمان اسلام کے مطابق اپنی مذہبی رسومات اور اخلاقی اقدار کا پرچار آزادی سے کر سکیں۔ پاکستانیوں کی اکثریت مسلمان ہے، اور اسلام ملک کے ثقافتی، معاشرتی اور قانونی تانے بانے کی تشکیل میں مرکزی کردار ادا کرتا ہے۔ پاکستان میں مختلف اقلیتوں کے مذہب جن میں ہندومت، عیسائیت، بدھ مت، وغیرہ بھی شامل ہیں لیکن مسلم اکثریتی ملک ہونے

کی وجہ سے یہاں اسلام غالب مذہب ہے۔یوں پاکستانی معاشرے کی مذہبی اقدار اسلامی تعلیمات اور عقائد سے اخذ شدہ ہیں لیکن ایک عرصے تک ہندو سماج کے ساتھ رہتے ہوئے اور مغربی معاشروں سے متاثر ہو کر مسلمانوں میں کچھ ایسی اقدار بھی رواج پا گئی ہیں جن کو مذہب اسلام نہیں سراہتا لیکن پاکستانی کی معاشرتی زندگی میں یہ اثرات گہرائی سے سرایت کر گئے ہیں۔

پاکستان میں مذہب "اسلام" ایک ایسے معاشرتی ادارے کے طور پر اپنا وجود رکھتا ہے جو معاشرے کے اصولوں، اقدار اور عقائد کی تشکیل میں اہم کردار ادا کرتا ہے اور اسی کے مقررہ کردہ اصولوں کے پیش نظر زندگی بسر کرنے کو ترجیح دی جاتی ہے۔ مذہب نے ازل سے مختلف شعبہ ہائے زندگی کو اپنی گرفت میں جکڑے رکھا ہے۔ معاشرتی مسائل کی تشریح اور جوابات کے لیے مذہب اہم کردار ادا کرتا ہے نیز معاشرتی تبدیلی کو قبول کرنے کے حوالے سے افراد کے رد عمل کو تشکیل کرنے میں معاون ہوتا ہے۔ابن خلدون معاشرے کے عروج وزوال پر روشنی ڈالتے ہوئے معاشرتی اور ثقافتی ترقی کو مذہب سے منسوب کرتے ہیں۔ان کے خیالات قرآنی تعلیمات کی روشنی میں مذہب کی اہمیت پر مرکوز ہیں۔ ان کے خیال میں مذہب معاشرے، ثقافت اور شخصیات کی تنظیم و تعمیر میں سب سے بڑا عنصر ہے۔[۴۲] ڈاکٹر جمیل جالبی پاکستان میں مذہب کی اہمیت پر روشنی ڈالتے ہوئے کہتے ہیں کہ پاکستانی عوام کا مذہب کے ساتھ جذباتی رشتہ ہے اور وہ اسے زندگی کی اہم ترین قدر جانتے ہیں جو ہمارے معاشرے میں ایک مؤثر قوت کی حیثیت رکھتا ہے۔ مؤثر اس سطح پر قرار دیتے ہیں کہ مذہب کی وجہ سے ایک انسان دوسرے سے زیادہ قربت اور مماثلت محسوس کرتا ہے۔[۴۳] مذہب کے ذریعے افراد زندگی کے مختلف مسائل کی تشریح اور ان سے نمٹنے کا کام لیتے ہیں۔ یہ مومنوں کو وجود کی پیچیدگیوں کو سمجھنے، جذباتی اور روحانی مدد کے لیے ایک فریم پیش کرتا ہے۔ چونکہ حالات و ضروریات کے مطابق نئے نئے مسائل سامنے آتے رہتے ہیں۔ جدید عہد میں بھی کچھ افراد مذہب کے حوالے سے معمولی معمولی باتوں کے لیے بھی علما سے رجوع کرتے ہیں۔ افسانہ "ہنوز خواب" میں سے اقتباس دیکھیے:

> " چینل پر سوال جواب کی محفل تھی، ایک صاحب نے سوال کیا۔۔۔"میں مغرب میں رہتا ہوں ہم جب سٹور سے سامان لینے جاتے ہیں تو سیلز مین سے بقیہ رقم لیتے ہیں۔ یہ سیلز مین غیر مذہب کا ہے شراب پیتا ہے انہی ہاتھوں سے شراب اٹھاتا ہے کیا اس کے ہاتھوں سے بقیہ لینا جائز ہے۔"[۴۴]

صنعتی اور ٹیکنالوجی کی ترقی نے مذہب اسلام کو بھی وسیع النظری عطا کی جس کی بدولت اسلامی اقدار و روایات میں بھی تغیر رونما ہونے لگا۔ معاشرہ میں دو طرح کے افراد پائے جاتے ہیں کچھ جو روایات کے ساتھ جڑے ہیں اور کچھ افراد بدلتے ماحول کے فوری اثرات قبول کرتے ہوئے جدت کو قبول کرتے ہیں۔ علما کرام ان مواقع پر اہم کردار ادا کرتے ہیں اور ہر نئے مسئلے اور جدید صورت حال کے تناظر میں شریعت اسلامیہ کے مطابق مسائل پر غور و فکر کرتے ہوئے لوگوں کی رہنمائی کرتے ہیں۔ اس کے لیے ضروری ہوتا ہے کہ علما کرام اپنے روایتی تصورات اور اپنے مخصوص نظریات کی آبیاری کے برعکس جدید حالات کے تناظر میں معاملات کو دیکھیں اور اس کے لیے ضروری ہوتا ہے کہ وہ اپنے آپ کو جدید عہد کے ساتھ اپ ڈیٹ رکھیں۔ جب علما کرام اپنے نظریات اور افعال کو تازہ ترین صورت حال کے ساتھ منہمک کرتے ہوئے چلتے ہیں تو معاشرہ ترقی کرتا ہے لیکن جب وہ اپنے مخصوص انداز میں پرانی مثالوں اور پرانے نظریات کو بیان کرتے ہیں تو معاشرہ پر زوال طاری ہونا شروع ہو جاتا ہے۔ منشایاد کے مطابق معاشرے کی یہ صورت حال ٹھہرے ہوئے پانی کی مانند ہوتی ہے۔ افسانہ "ٹھہرا ہوا پانی" کا سیاق تین دوستوں الف، بے اور جیم کے گرد گھومتا ہے۔ تینوں دوستوں میں سے جیم دینی مدرسے سے کورس کر کے مسجد کا پیش امام مقرر ہو جاتا ہے۔ جیم کے پاس خطابت اور وعظ کا عمدہ فن موجود تھا جو اپنے لب و لہجے کی پر تاثیر قوت، جدید اور پر اثر لفظوں سے سب کو اپنا گرویدہ بنالیتا ہے صحیح معنوں میں جید عالم بن چکا تھا لیکن کئی سال گزر جانے کے بعد جیم کو اس کے دوست جب پرانی ڈگر پر ہی پاتے ہیں تو وہ مایوس ہو جاتے ہیں۔ افسانے کا اقتباس ملاحظہ ہو:

> "۔۔۔چالیس برس کا زمانہ، جس میں زندگی، معاشرت، سیاست، ٹیکنالوجی، تاریخ، فلسفہ، حدیث و فقہ اور دیگر علومِ اسلامی اب پی ڈی ایف کے ذریعے انٹرنیٹ پر بھی پڑھے جاسکتے تھے انسانی معلومات اور علم میں اس قدر ترقی اور تبدیلی ہوگئی تھی کہ دنیا بالکل بدلی ہوئی معلوم ہوتی تھی۔ لیکن مولانا جیم کی گفتگو، دلائل اور لفظیات میں رتی بھر تبدیلی نہیں آئی تھی۔ کوئی نئی مثال نہ اپنے زمانے کا کوئی حوالہ۔۔۔ دینی معاملات اور خدا رسولؐ کے احکامات ہمیشہ وہی رہتے ہیں۔ ان میں کوئی تبدیلی نہیں ہوتی۔"(۴۵)

جیم کے خیالات کو مصنف اقبال کے کلام کے مطابق یوں بیان کیا گیا ہے کہ

رہ گئی رسمِ اذاں، روحِ بلالی نہ رہی　　فلسفہ رہ گیا، تلقینِ غزالی نہ رہی

یعنی جب تک علما خود کو جدید تقاضوں کے ساتھ ہم آہنگ نہیں کرتے بات میں وہ اثر نہیں رہتا ایک ہی امام جس کے بارے میں اس کے دوستوں کا خیال تھا کہ اب تک اس کی باتیں مزید پر اثر ہو چکی ہوں گی وہ کس طرح ایک ہی جگہ رکا رہتا ہے۔ وقت کے ساتھ معاشرتی مسائل، اصول اور معاشرے کو درپیش چیلنجز بدلتے رہتے ہیں۔ موجودہ مسائل کو حل کرنے کے لیے علما معاشرے کی ترقی میں اپنا حصہ ڈال سکتے ہیں۔ موجودہ دور کے تناظر میں روایتی نظریات اور مثالوں کا تنقیدی تجزیہ اور تشریح ان حالات کو سازگار بنانے میں معاون ہوتا ہے۔ اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ پرانے خیالات کو یکسر مسترد کر دیا جائے بلکہ ان کی اس انداز میں دوبارہ تشریح کی جائے جو معاشرے کی موجودہ تفہیم اور ضروریات کے مطابق ہو۔ مؤثر مواصلات روایتی اور عصری نقطہ نظر کے درمیان فرق کو ختم کرنے اور تبدیلی کو قبول کرنے میں مدد کرتے ہیں۔ نئے حالات کے مطابق ثقافتی اور اخلاقی اقدار کا تحفظ معاشرے کے استحکام اور ہم آہنگی میں معاون ہوتا ہے۔

مذہبی سوچ و بچار کے حوالے سے "اُکڑوں بیٹھا وقت" افسانے کا پلاٹ جدید عہد کا عکاس ہے جس میں مرد اور مرد کے غیر فطری تعلق کو موضوع بنایا گیا ہے۔ فلسفیانہ سوالات اٹھاتے ہوئے نوجوان نسل کے ذہنوں میں پیدا ہونے والے سوالوں کو بھی موضوع بنایا گیا ہے کہ وہ مذہب کو کس تناظر میں دیکھتے ہیں۔ افسانے کی کہانی دو ہم جماعت دوستوں میں سے ایک دوست کی جانب سے اپنے دوست سے مرغوبیت کی بنا پر اظہار محبت سے شروع ہوتی ہے۔ جس کے رد عمل کے طور پر دوسرا دوست شروع میں تو اس بات کو غیر فطری خیال کرتے ہوئے اپنے ہم جماعت دوست کو چائے کے میز پر اکیلے چھوڑ کر چلا جاتا ہے مگر دوسرے ہی دن فلسفے کے لیکچر پر وہ دونوں پھر ساتھ ساتھ ہوتے ہیں۔ یوں اکثر وہ دونوں ایک ساتھ جماعت سے چلے جاتے ہیں اور اپنے اس تعلق کی بقا کے بارے سوچ و بچار کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔

> "عورت کا عورت سے تعلق، مرد کا مرد سے تعلق اور مرد کا عورت سے تعلق۔۔۔ سب وجود کی بھوک ہے۔ ناموں کے گھماؤ سے ذرا نکل کر دیکھو تو سہی۔ تم یہاں مذہب کا نام میرے سامنے مت لینا۔ مذہب کی حیثیت میرے نزدیک اس لونڈیا سے زیادہ کچھ نہیں جس پر جو ہاتھ رکھ دے وہ اسی کی ہو جاتی ہے۔ فطرت، تشفی کا عمل ہے۔"(۴۶)

معاشرتی اصولوں کو صنفی یا مذہبی شناخت سے بالاتر ہو کر تعلق اور وجود کی بنیادی انسانی ضرورت پر زور دیا گیا ہے۔ مذہب کا تذکرہ کرنے سے گریز کرنے کا مطالبہ ایک غیر جانبدار یا سیکولر سیاق و سباق میں انسانی رشتوں پر بات کرنے کی خواہش کا اظہار کرتا ہے جو مذہبی اختلافات کے بجائے مشترکہ انسانی تجربے پر توجہ مرکوز کرتا

ہے۔ جب مذہبی رہنما مل بیٹھ کر مسئلے کا حل نکالنے میں ناکام ہو جاتے ہیں یا نوجوان نسل کو تسلی بخش جواب دینے میں اپنا کردار ادا نہیں کر پاتے تو ان کے ذہنوں میں مختلف طرح کے سوال پیدا ہو جاتے ہیں جو ان کو مذہب سے متنفر کرنے لگتے ہیں۔

اکیسویں صدی کے افسانوں کی روشنی میں پاکستان کے مذہبی اداروں کی صورت حال کا جائزہ لیں تو وثوق سے کہا جا سکتا ہے کہ مذہبی جارحیت بڑھتی جا رہی ہے۔ ناصر عباس نیر نے افسانہ "کہانی کا کوہِ ندا" کی کہانی میں عمدہ مکالماتی انداز اپناتے ہوئے مذہبی انتہا پسندی کو اجاگر کیا ہے اور اس نظریے کی تردید کی ہے کہ سائنس کی جارحیت نے فرد کو مذہب سے دور کر دیا ہے۔ اس حوالے سے منطقی انداز میں انہوں نے انسانی نفسیات کو اجاگر کیا ہے کہ کیسے لوگ سائنس کے مفروضات کے حافظ بن جاتے ہیں لیکن اصل سائنسی فکر ان کو چھو کر نہیں گزرتی حقائق کی روشنی میں معاشرے کا مطالعہ کرنے کے بجائے مذہب کے معاملے میں جذباتی ہو جاتے ہیں۔ اس کی مثال سائنس کے شعبے سے تعلق رکھنے والے اساتذہ اور طالب علموں کے عام رویے کی روشنی میں دیتے ہیں یہ لوگ کتنے بڑے سائنس دان کیوں نا کہلاتے ہوں لیکن ان کے مذہبی تصورات ایک نیم خواندہ شخص کے تصورات سے مختلف نہ ہوں گئے۔ اس کہانی میں ایسے افراد پر گہرا طنز دیکھنے کو ملتا ہے۔

> "کسی طالبہ کو کھلے سر دیکھیں گے تو اسے حجاب پر لمبا چوڑا لیکچر دیں گے، اور اسے گناہ گار ہونے کا یقین دلا کر رہیں گے، کسی دوسرے مذہب کے آدمی کی اپنی مذہب پر معمولی سی تنقید سنیں گے تو بھڑک اٹھیں گے اور بغیر تحقیق کے اس جلوس میں شامل ہو جائیں جو اس غریب کا گھر جلا رہا ہوتا ہے، خواہ بعد میں پتا چلے کہ اس بے چارے کے گھر کے پلاٹ پر قبضے کا منصوبہ تھا۔"(۴۷)

معاشرے میں ایسے بہت سے واقعات رونما ہوتے رہتے ہیں جن کا بیان کہانی کا کوہِ ندا میں کیا گیا ہے۔ ان واقعات میں مذہبی جارحیت کے مختلف روپ اجاگر ہوتے ہیں جن میں سے ایک تلخ حقیقت غیرت کے نام پر کیا جانے والا قتل ہے۔ افسانہ "کفّارہ" میں بھی اسی تلخ حقیقت کو اجاگر کیا گیا ہے۔ اس افسانے میں نوری کا بھائی خود مختلف جرائم میں ملوث ہونے کے باوجود دوستوں کے بہکاوے میں آ کر اپنی بہن نوری کا غیرت کے نام پر قتل کر دیتا ہے اور اس کا الزام خداداد پر آ جاتا ہے۔ اسی طرح انور شاہ جو ایک دیوار کے مسئلے پر اپنے فریق شاہد کے الزام پر کہ اس کی بیوی کسی مسلی کو بھی نہیں چھوڑتی بیوی کا قتل کر دیتا ہے اور ایسے واقعات پر نہ

کوئی قتل ہونے والے کا غم کرتا ہے نہ کوئی فاتحہ درود کا اہتمام ہوتا ہے فقط دو چار لوگ جنازہ پڑھتے ہیں اور مقتول کو دفنا دیتے۔ ایسے بہت سے واقعات رونما ہوتے رہتے ہیں جس پر کوئی احتجاج کرنے والا نہیں:

"گاؤں میں سب نے ایک خاموش معاہدہ کر رکھا تھا کہ جس لڑکی یا عورت کی شہرت خراب ہو جائے، اسے ٹھکانے لگانے والا باپ ہو، شوہر ہو، یا بھائی بہادر اور غیرت مند سمجھا جاتا تھا۔"(۴۸)

اسی معاشرے میں اللہ بخشے اور خدا داد جیسے کردار مذہب کے نمائندہ کرداروں کے طور پر اجاگر ہوتے ہیں اور لوگ ان کے دینی علم سے متاثر ہوتے ہیں۔ ایسے نمائندہ کردار گناہ ثواب کے مباحث میں الجھے رہتے ہیں لیکن غیرت کے نام پر قتل کے لیے کوئی سخت قانون نہیں۔ بالکل ایسے ہی معاشرے میں دینی مباحث پر اختلافات پائے جاتے ہیں۔ خود عمل سے خالی لوگ صرف مباحث میں الجھے رہتے ہیں۔ افسانے کا اختتام اس چونکا دینے والی کڑی پر ہوتا ہے جب خداداد، اللہ بخشے سے کہتا ہے کہ مجھ سے زیادہ آپ مذہب کا علم رکھتے ہیں۔ کیا کسی کی موت کے بعد اس سے نکاح کیا جا سکتا ہے؟

اسد محمد خان نے بھی افسانہ "عون محمد وکیل، بے بے اور کاکا" کے ذریعے معاشرے میں مذہبی تشدد پسند عناصر کو اجاگر کیا ہے۔ کہانی کا پلاٹ اس طرح تشکیل دیا گیا ہے جس میں ایک بیوہ عورت بے بے کا کردار پاک باز عورت کے طور پر پیش کیا گیا ہے جس پر مسجد کا پیش امام بری نظر رکھتا ہے اور اس سے شادی کی خواہش ظاہر کرتا ہے لیکن بے بے کے انکار اور دونوں میں جھگڑا ہو جانے کی وجہ سے امام بے بے پر بدکاری کا الزام لگا دیتا ہے جس پر محلے والے بے بے کو برا بھلا کہتے ہوئے اس سے ملنا جلنا ختم کر دیتے ہیں۔ یہاں امام مذہب سے ملے ہوئے عہدے کا غلط استعمال کرتا ہے۔ کاکا یہ سب معاملات سمجھ رہا ہوتا ہے، امام کے اس الزام پر غصے میں آ کر اسے غلیل سے مارنے لگتا ہے کہ نشانہ غلط ہو جاتا ہے اور نشانہ لالٹین کو جا لگتا ہے اور گھر میں آگ لگ جاتی جس کی وجہ سے کچھ مقدس صفحات جل جاتے ہیں اور کاکا پر بے حرمتی کا الزام لگ جاتا ہے۔ کاکا جو صرف پندرہ سال کا ہے اس پر لگایا گیا بے حرمتی کا الزام ایک ایسا الزام جس کو مسترد کرنے اور کاکا کو انصاف دلانے کے لیے عون محمد وکیل مسلسل کوشش کر رہا ہے کہ سچ سامنے آ سکے لیکن یہ ہمارے معاشرے کا ایک ایسا کیس بن چکا ہے جس میں سچائی سامنے آنے سے قبل ہی مذہبی انتہا پسند عناصر کے رویے آشکار کیے گئے ہیں:

"میں ڈرتا ہوں کہ کہیں، کسی دن جیل کے باہر دوچار سو یا اس سے کچھ کم(یا زیادہ)خوب غصہ دلائے ہوئے مسلح (اور غیر مسلح) لوگ نہ آ کھڑے ہوں جنھیں سوہنے نبیؐ جی کی لائی ہوئی رحمتوں والی شریعت کی اور Circumstantial Evidence کی یا تو سمجھ ہو یا نہ ہو۔۔۔تو سوال یہ ہے کہ ایسے میں۔۔۔کاکے کی جان کی ضمانت کون دے سکتا ہے۔"(۴۹)

پاکستان میں مذہبی تشدد کے امکانات اور معاشرتی تناؤ کی لپیٹ میں آنے والے افراد کو درپیش مسائل کے بارے میں ایک عام تشویش ناک صورت حال کو اجاگر کیا گیا ہے۔ مذہبی حوالے سے لوگوں میں عدم برداشت بڑھ گئی ہے۔ مذہبی جذبات کی غیر متزلزل نوعیت کی افسانہ نگاروں نے نشاندہی کی ہے اور لوگوں میں اپنی تحریروں کے ذریعے یہ شعور پیدا کرنے کی کوشش کی ہے کہ ان معاملات میں جذباتی ہو جانے کے بجائے تحمل کا مظاہرہ کیا جائے تو معاملات قانونی طریقے سے حل کیے جاسکتے ہیں۔ حسن منظر کے افسانے "یاں تو کوئی سنتا نہیں فریاد کسو کی" ایک مدرسے میں دین کی تعلیم حاصل کرنے والے بچے کے ذہن میں اٹھتے ہوئے سوالوں کے گرد گھومتا ہے۔ بچے نے مولانا سے اسلام کا نظریہ سمجھتے ہوئے پڑھا تھا کہ جو ایک مسلمان کو ناحق مار ڈالے تو اس کی سزا جہنم میں ہمیشہ جلتے رہنے کی ہے۔ بچے نے اپنے والدین سے سن رکھا تھا آج کل جس طرح کے واقعات سننے میں آتے ہیں اور مجرم پکڑ میں آ بھی جائیں تو اتنے طاقت ور ہوتے ہیں کہ قانون کے دائرے سے بچ نکلتے ہیں۔ اس پر بچہ مولانا صاحب سے پوچھنا چاہتا تھا کہ ان کی کیا سزا ہے؟ جو پوری انسانیت کا ناحق قتل کرنے پر لگے ہوئے ہیں۔ لیکن اس حوالے سے بچہ ڈرتے ڈرتے یہ سوال مولانا سے کرتا ہے۔ افسانے کے اس موڑ پر ہمارے دوہرے رویوں اور دینی معاملات کے حوالے سے فرد کے ذہن میں اٹھنے والے سوالات جن کو کرتے ہوئے آج کا انسان گھبراتا ہے اس صورت حال کی عکاسی کرتا ہے۔ مولانا بچے سے کہتے ہیں:

"تم نے سوال بہت ڈرتے ڈرتے کیا تھا کیوں کہ تمہارے دل میں خوف تھا کہ اسے سنتے ہی، بغیر اس پر غور کیے میں تم پر کفر کا فتویٰ تو صادر نہیں کر دوں گا۔"(۵۰)

بدلتے تناظرات میں کٹر مولوی / مذہبی، رہنما جس طرح فرد کے ذہن میں اٹھنے والے سوالات پر فتویٰ صادر کرنے اور فرد کی سوچ پر قدغن لگا دینے کا رویہ اختیار کیے ہوئے ہیں اس سے لوگ سوال کرتے ہوئے بھی ڈرتے ہیں۔ افسانے کا بیانیہ انداز معاشرے میں مولانا سید نعیم الرحمن جیسے مولویوں کی معاشرے کے لیے

ضرورت اور ان کی اہمیت کو اجاگر کرتا ہے۔ افسانے کا سیاق درسگاہوں میں پڑھائے جانے والا اخلاقی سبق کس طرح عملی زندگی سے مختلف ہے اس حقیقت کو بھی پیش کرتا ہے اور فرد کی توجہ اس طرف مبذول کرواتا ہے کہ مذہب کو عملی زندگی میں اپنانا کتنا اہم ہے۔ "خونی لام ہوا قتلام بچوں کا" افسانے کے عنوان سے ہی کہانی کی حزنیہ کیفیت اجاگر ہو جاتی ہے۔ کہانی کے پس منظر میں دہشت گردی اور ۱۶ دسمبر ۲۰۱۴ء کو سانحہ پشاور، سکول میں ہونے والا بچوں کا قتل عام افسانے کا مرکزی موضوع ہے۔ افسانے کا مرکزی کردار سولہ سال کا بچہ توقیر ہے۔ اس کی ماں لائبہ اس کو جنم دیتے ہی اس دنیا سے رخصت ہو گئی اور اس کا باپ محمد انیس نو سال قبل ملازمت کے لیے بوسٹن گیا تھا۔ توقیر کو اس کے دادا دادی نے پیار محبت سے بڑا کیا تھا لیکن زندگی کی ستم ظریفی کے گردن توڑ بخار نے گردن میں ٹیڑھا پن پیدا کر دیا جس کی وجہ سے بولتے وقت تتلاہٹ پیدا ہوتی۔ ایک دن توقیر اپنے دادا کی حج پر جانے کی غرض سے خریدی گئی جیکٹ کی جیبوں میں کھلونے بھر کر چادر سر پر باندھے ہاتھ میں اپنے کھلونے والی پستول لے کر کھیل کھیل میں بازار نکل گیا اور لوگوں کو ڈرانے لگا کہ میں پھٹ جاؤں گا اسی کھیل میں پولیس والا واقعی خوف زدہ ہو کر اسے گولیوں سے بھون دیتا ہے۔ دہشت گردوں کا سکول کے بچوں کو بے رحمی سے قتل کرنا اور پولیس والے کا بچے کو دہشت گرد سمجھتے ہوئے قتل کر دینے والے واقعے میں کوئی فرق نہیں رہتا۔ اسی طرح افسانے کے وجود سے پھوٹنے والے مختلف واقعات کی روشنی میں اقدار کی تغیر پذیری، مذہبی جارحیت، متنازع مذہبی افکار کے تضادات اور ان سے پیدا ہونے والے پیچیدہ مسائل کو حمید شاہد نے اس افسانے کا موضوع بنایا ہے۔ توقیر کے دادا ماسٹر سلیم الرحمٰن کا کردار اور مولوی افضال کا کردار ہمارے مذہبی اختلافات جو جدید اور قدیم آپس میں متصادم ہیں ان پر گہری چوٹ ہیں۔ ہمارے معاشرے میں پائے جانے والے ایسے مسائل مذہبی اداروں کی ناکامی کا سبب بنتے ہیں۔ مثلاً ایٹم بم کے دھماکے کے دن کو جب یوم تکبیر کہا گیا تو سلیم الرحمٰن نے اس کی مخالفت کی۔ دوسری طرح ایک بیوہ عورت جس کا بیٹا ماں کی مشقت اور اپنی بے روزگاری کے باعث بینک میں ملازمت حاصل کرنے میں کامیاب ہو جاتا ہے تو وہ مولوی افضال کے سودی نظام کے فتوں کا مرتکب ٹھہرتا ہے اور ماسٹر سلیم جب استدلال کی راہ قائم کرتے ہیں تو مولوی افضال اس فتوی پر حرام کو حلال میں بدلنے کا حیلہ قرار دے دیتے ہیں۔ اقتباس ملاحظہ ہو:

> "ماسٹر صاحب کا فتویٰ درست تھا یا نادرست مگر اس نئے استدلال نے مولوی افضال کو الجھا کر رکھ دیا تھا۔ وہ کچھ لمحوں کے لیے سوچتا رہ گیا تو لوگوں میں سرگوشیاں ہونے

لگیں۔ فوری طور پر کچھ نہ سوجھا تو دلیل سے جواب دینے کے بجائے اسے ماسٹر صاحب کا ایک ایسا حیلہ قرار دیا جس میں وہ حرام کو حلال بنا رہے تھے۔"(۵۱)

ایسے بہت سے متنازع بیانات جو ہمارے معاشرے میں مذہبی شدت پسندی کی راہ اختیار کر جاتے ہیں ان نظریات کو محمد حمید شاہد نے اس افسانے میں اجاگر کیا ہے۔ مذہبی اقدار جیسے جہاد کا تصور نائن الیون کے واقعے کے بعد تبدیل ہو کر رہ گیا۔ اسلام کو شدت پسند مذہب سمجھا جانے لگا۔ جہاد کو صرف جنگ و جدل کا نام دیتے ہوئے اسے ہدف تنقید کا نشانہ بنایا جانے لگا۔

"وہ جہادی تنظیموں کی کارروائیوں کو خلاف اسلام کہتے آئے تھے۔ پہلے پہل انہیں روسی ایجنٹ کہا گیا اور جب روس پسپا ہو گیا اور دیکھتے ہی دیکھتے مجاہدین دہشت گرد ہو گئے تو وہ اسی مولوی کی نظر میں وہ امریکی ایجنٹ ہو گئے مگر ان کا موقف بدلنا تھا نہ بدلا۔ وہ کہتے تھے کہ نجی جہاد کا یہ عمل انارکی اور تباہی کے نتائج لائے گا اور سب نے دیکھا، ایسا ہی ہوا تھا۔"(۵۲)

پاکستانی معاشرے میں مولوی کی حیثیت ایک مذہبی عالم کی ہے، جو مذہبی تعلیم میں حصہ ڈالتے ہیں، اسلامی دینی مدارس کو چلانے میں اہم کردار ادا کرتے ہیں، اجتماعی نمازوں کی امامت کرتے ہیں، خطبہ دیتے ہیں، کچھ مولوی اسلامی فقہ میں تربیت یافتہ ہوتے ہیں اور مذہبی جج یا ثالث کے طور پر کام کرتے ہیں، اکثر اسلامی تعلیمات پر مبنی عوام کو روحانی طور پر اخلاقی مسائل پر رہنمائی فراہم کرتے ہیں، کچھ مختلف مذہبی برادریوں کے درمیان افہام و تفہیم اور رواداری کو فروغ دینے کے لیے دوسرے مذاہب کے رہنماؤں کے ساتھ بات چیت میں مشغول ہوتے ہیں، کچھ مولوی مذہبی جماعتوں کے قائدین کے طور پر یا مخصوص سیاسی تحریکوں کی حمایت کرنے والی بااثر شخصیات کے طور پر سیاست میں سرگرم عمل ہوتے ہیں جہاں اسلامی اصولوں کی اپنی تشریح کے مطابق پالیسیوں کی وکالت کر سکتے ہیں۔ ایک طرف دیگر افسانہ نگاروں نے معاشرے میں مولویوں کے کردار کو اجاگر کیا ہے وہیں ان کے مزاج کے حوالے سے اکبر علی ناطق نے افسانہ "مولوی کی کرامت" قلم بند کیا ہے جس میں یہ باور کروانے کی کوشش کی ہے کہ مولوی معاشرے کا وہ باعزت فرد ہوتا ہے جسے دین و دنیا کا رہبر ہونے کا درجہ حاصل ہے لیکن اس کے مزاج کی سختی اور زبان سے ادا کیے گئے الفاظ سے لوگ اس قدر خوف زدہ ہیں کہ کہیں وہ ان کے حق میں کچھ ایسا نہ کہہ دے جس سے ان کو بھاری نقصان اٹھانا پڑے۔ مذہب

کو عملی زندگی میں اپنانے کے لیے قرآن سنت سے متاثر ہونے کے بجائے لوگ مولوی کے خوف اور اس کی بد دعا سے خوف زدہ ہیں۔ مولوی کے اس رویے کے حوالے سے افسانے کے کچھ اقتباسات ملاحظہ ہوں:

"تحصیلدار کے لڑکے کو پڑھاتے ہوئے ایسے زور کا تھپڑ مارا، بچارے کا کان پھٹ گیا"(۵۳)

"خدا کرے تیری ٹانگ ٹوٹے۔ او! نامراد تیری آنکھیں پھوٹیں، تو ہمیں بے آبرو کرنے نکلا۔ خدا تجھے بستر پر دراز کرے۔"(۵۴)

مذہبی تنظیمیں اکثر خیراتی سرگرمیوں اور کمیونٹی ویلفیئر پروگراموں میں شامل ہوتی ہیں۔ وہ غریبوں اور ضرورت مندوں کی ضرورت کے وقت مدد فراہم کرنے کے لیے تقریبات کا اہتمام کرتی ہیں اور چندا اکٹھا کرتی ہیں۔ زکوۃ ادا کرنا مسلمانوں کی مذہبی قدر ہے اور ارکان اسلام میں سے ہے اس حوالے سے "مولوی کی کرامت" میں مولوی لوگوں کو قرآن سنت سے متاثر کرنے کے بجائے کیسے نصیحت کرتے ہیں کہ وہ کفر کا ارتکاب کر رہے ہیں اس کو بھی افسانہ نگار نے اجاگر کیا ہے۔

"قربانی کی کھالیں اور سالانہ چندے مولوی صاحب ان کے لیے اکٹھا کرتے تھے۔ ایک دو لوگوں نے ایک دفعہ چندہ نہ دے کر کفر کا ارتکاب بھی کیا مگر جلد ہی جہادی تنظیموں کے زورِ بازو اور مولانا کی نصیحت نے انہیں صراطِ مستقیم پر دوبارہ لا کھڑا کیا۔"(۵۵)

افسانہ "حاجی ابراہیم" میں اکبر علی ناطق نے ایک ایسے معاشرے کی تصویر کشی کی جہاں کے لوگ بظاہر نیک، پرہیز گار اور دین دار ہیں۔ کہانی کار اوی شہروں کی خاموشیوں میں پائی جانے والی گندگی کو اجاگر کرتا ہے۔ کہانی دودھ کی کمپنی میں کام کرنے والے راوی کے تین ساتھیوں اور کمپنی کے مالک حاجی ابراہیم کے گرد گھومتی ہے۔ لوگ ابراہیم کو الحاج ابراہیم کے نام سے پکارتے ہیں کیوں کہ اس نے پانچ مرتبہ حج کر رکھا تھا۔ دودھ کے کارخانے کے علاوہ اس کے دو پٹرول پمپ اور کھاد بنانے کی ایجنسی بھی تھی۔ راوی کے مطابق شہر کی دلآویزی اور رنگارنگی اپنی مثال آپ تھی لیکن کم و بیش سارا شہر نمازی تھا۔ لیکن افسانہ جیسے جیسے آگے بڑھتا ہے ویسے ویسے دین کے پیچھے چھپے مکھوٹے کا سدباب ہوتا جاتا ہے۔ تینوں ساتھیوں کو شہر کے جن مکانوں میں رہنا پڑا وہاں کے حالات کا بیان ہے۔ سب سے پہلے جس مکان میں رہے اس کا مالک مکان ایمان دار اور شراب کو حرام سمجھ کر نہ پیتا تھا مگر دلالی کا کام کرتا تھا۔ یوں اس مکان کو چھوڑ کر انہیں ایک ایسے مکان میں رہنے کا اتفاق ہوا جس کی مالک مکان خاتون تھی اور خود لاہور میں رہتی تھی مگر گھر کا ایک کمرا اپنے لیے مختص کر رکھا تھا اور اس کی چابی پڑوسن کو صاف صفائی کے لیے دے رکھی تھی مگر اس گھر میں بھی وہی معاملات پیش آئے کہ

پڑوسن روزانہ کی بنیاد پر نئے مردوں کو لے آتی اور جب لڑکوں نے یہ بات مالکن کو بتائی تو الزام تراشی کے جرم میں خود ہی گھر سے نکال دیے گئے۔ ایسے شہر میں انہیں بے شمار گھر تبدیل کرنا پڑے مگر بہت جلد انہیں کمپنی کے مالک حاجی ابراہیم کا گھر کرائے پر مل گیا یہاں مالک مکان کی دو بیٹیاں بھی رہتی تھیں۔ حاجی صاحب نے اس شہر کے بارے جن خیالات کا اظہار کیا تھا کہ شہر کا ماحول شریف آدمی کے رہنے کے لیے اتنا خراب ہے کہ جسے ٹٹولو وہی لفنگا، رنڈی بازی، چوری، مجرے غرض ہر قسم کی برائی میں مبتلا ہے۔ یہ افسانے کے انجام تک ایک سوالیہ نشان بن جاتا ہے۔ کیوں کہ ان پر انکشاف ہوتا ہے کہ انہی حاجی صاحب کے گھر شراب کا کارخانہ بھی لگا ہے جب کہ بظاہر وہ دین دار آدمی تھے۔ یہاں تک کہ شراب کی بو آنے پر انہیں ڈر تھا کہ کہیں حاجی صاحب انہیں بھی لفنگا سمجھتے ہوئے گھر سے نہ نکال دیں۔ حاجی صاحب کی پرہیز گاری اس اقتباس سے ملاحظہ ہو:

> "یہ جو آپ سارے شہر میں شربت کے اشتہار دیکھتے ہیں، اسی شراب کے ہیں، کیا حاجی ابراہیم خود بھی پیتا ہے، ڈاکٹر وارث نے پوچھا، نہیں وہ بہت پرہیز گار آدمی ہیں، انھوں نے کبھی قطرہ بھی نہیں چکھا، کہتے ہیں، یہاں پی تو جنت میں نہیں ملے گی۔"(۵۶)

مسعود مفتی کا افسانہ "پانچواں گروہ" نہ صرف پاکستان کے سیاسی اور سماجی اداروں کی صورت حال اجاگر کرتا ہے بلکہ پاکستان کے ایک عام شہری کی زندگی اس کی کمزوری اور خاموشی کی تصویر کشی کرتا ہے۔ افسانے کی کہانی روز قیامت کے بعد حشر کے دن سے تعبیر ہے جہاں اللہ کے حضور پاکستانیوں کا الگ ہی مقدمہ پیش ہوا ہے کیوں کہ پاکستان دین اسلام کے نام پر تشکیل پایا گیا ایک ملک ہے یوں اس کی بنیادی احساس "لا الہ الا اللہ" پر استوار ہے۔ فرشتوں کے سامنے پاکستانی بلترتیب یوں پیش ہوئے: سیاسی لیڈر، فوج، بیوروکریٹ، عالم دین، اخبار نویس اور آخر میں پاکستان کا عام شہری پیش ہوتا ہے۔ ان سب کے بیانات سننے کے بعد پتا چلتا ہے کہ ان کے لیے مذہب کا معنی اور مفہوم بدل دیا گیا تھا۔ عالم دین کی کارگردگی کفر کے فتوؤں تک محدود ہو کر رہ گئی تھی۔

> "اس قوم نے قرآن کے لغوی معنی تو برقرار رکھے۔ مگر عملی معنی بدل دیے۔ اسی لیے ان کی ساری اقدار الٹ گئی تھیں۔ نیکی اور بدی نے ایسے معنی بدلے کہ برائی فخر بن گئی اور اچھائی شرم بن گئی۔"(۵۷)

مذہب اور سیاست کے نام پر پھیلائی جانے والی دہشت گردی کو زبیر شاہ نے افسانہ "محبت خطِ تنسیخ کی زد میں" کے پس منظر میں بیان کیا ہے۔ انسانی فلاح کا مذہب اور سیاست دونوں سے گہرا تعلق ہے۔ لیکن افسانہ نگار کے مطابق مذہب اور سیاست نے فلاح و بہبود میں حصہ ڈالنے کے بجائے نقصان اور تباہی ہی برپا کی ہے جس کی وجہ سے آج کا انسان ان سے دوری برتنے لگا ہے:

> "مذہب اور سیاست کا عمل دخل اس کی زندگی میں ایک عرصے سے معطل ہو چکا تھا اور اس حوالے سے اس کی سوچ کا دائرہ اب بہت محدود تھا۔ اس کا خیال تھا کہ بے شک ان دونوں کا دوسرا نام انسانی فلاح و بہبود ہے مگر آج ان سے تباہی و بربادی کے سوا کوئی کام لیا ہی نہیں جاتا۔"(۵۸)

پاکستان سمیت دنیا کے مختلف حصوں میں مذہبی تعلیم کے مقابلے سیکولر تعلیم کا رجحان بڑھا ہے۔ والدین کی ایک بڑی تعداد روایتی مذہبی اداروں پر اپنے بچوں کے لیے سیکولر تعلیم کو ترجیح دے رہی ہے۔ جہاں سیکولر تعلیم کو دنیا میں بہتر معاشی مواقع اور کیریئر کے امکانات کے طور پر دیکھا جاتا ہے وہیں بنیاد پرستی کے حوالے سے خدشات اور مذہبی تعلیمات کے لیے اعتدال پسند طرز عمل کی خواہش نے کچھ خاندانوں کو سیکولر اور مذہبی تعلیم کے درمیان توازن کی تلاش پر مجبور کیا ہے۔ اگرچہ یہ رجحان بدلتی ہوئی معاشرتی اقدار کی عکاسی کرتا ہے، لیکن یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ اس حوالے سے انفرادی سوچ متنوع اور مختلف عوامل سے متاثر ہو رہی ہے۔ دینی اداروں کا حال اب ایسا ہو چکا ہے کہ لوگ اپنے بچوں کو اب ان اداروں میں بھیجنے سے گھبراتے ہیں۔ "سائیکلوسٹائل وصیت نامہ" اسی پس منظر میں تحریر کردہ افسانہ ہے۔

> "مولوی صاحب اگر اس کا رجحان دینی تعلیم کی طرف ہے تو اسے پڑھنے دیں۔ آئندہ چل کر وہ آپ کی جگہ سنبھال سکے گا" "اگر اتنی سی بات ہوتی تو مجھے کوئی اعتراض نہیں تھا" وہ بولے "مگر وہاں جو تعلیم دی جاتی ہے اس کے بعد بچے کسی جہادی تنظیم میں شامل ہو جاتے اور جنت کی خواہش کرنے لگتے ہیں۔"۔۔۔ایسے کئی لڑکوں کی میتیں آ چکی ہیں۔"۔۔۔میں چاہتا ہوں وہ اس ماحول سے دور چلا جائے۔"(۵۹)

افسانہ "دہشت گرد" میں وحید باپ کے ترش رویے، سوتیلی ماں کے مظالم سہنے اور گھر سے نکالے جانے کے بعد علامہ رفیق کے بیس میں غیر ملکی ایجینٹ ریونڈ رابرٹ کے ہاتھ لگ جاتا ہے جو اسے پیار محبت اور قرآن و سنت کا جھانسا دے کر اپنے ساتھ لے جاتا ہے۔

"بابا جی! آپ تو فرماتے تھے کہ ایک چھوٹا سا مدرسہ ہے۔ یہ تو بہت بڑا مدرسہ ہے۔"
بیٹا! یہ چھوٹا سا مدرسہ ہی ہے اللہ کی دنیا تو بہت وسیع ہے۔ یہ مدرسے جب لوگوں تک خدا کا پیغام نہیں پہنچا سکتے تو پھر چھوٹے ہی ہوئے نا۔ بڑے مدرسے تو کالج اور یونیورسٹیاں ہوتی ہیں۔"(۶۰)

مذہبی رہنما اور علما، مذہبی اقدار کی ترجمانی کرنے اور ان کو پھیلانے میں اہم کردار ادا کرتے ہیں۔ جس مدرسے میں وحید کو لے جایا گیا تھا وہاں جب غیر ملکی لوگ آکر لیکچر دیتے تو اس پر وحید سوال کرتا تھا کہ ہمارے ملک کے علما کو کیوں نہیں بلایا جاتا تو اس پر غیر ملکی ایجنٹ کہتا ہے:

"ہمارے ملک کے علماء فرقہ بندی کو ہوا دیتے ہیں۔ دیوبندی، وہابی، بریلوی، شیعہ، سنی کے بکھیڑے ہی نہیں ختم ہوتے۔ ان کو مدرسہ بھلا کیوں بلائے گا۔"(۶۱)

اس کے ذریعے مصنف نے علما میں فرقہ واریت کے حوالے سے پائے جانے والے تنازعات کو اجاگر کیا ہے۔ ہمارے مذہبی اداروں اور علما میں پائے جانے والے فرقہ وارانہ اختلافات کو کس طرح سے مذہب دشمن عناصر اپنے مقاصد کے لیے استعمال کرتے ہیں اس کے پیش نظر مصنف نے تشویش کا اظہار کیا ہے اور اتحاد، افہام و تفہیم، رواداری اور متفقہ نقطہ نظر کی ضرورت کو اجاگر کیا ہے۔

مدرسوں کے بھیس میں ظاہر و باطن کا تضاد لیے اور اچھائی کا مکھوٹا پہنے دہشت پھیلانے والے عناصر کیسے معصوم بچوں کے ذہنوں کو متاثر کرتے ہیں اس کی بھرپور عکاسی بھی افسانے کے ذریعے کی ہے۔

"وحید بیٹا! تمہیں یہ ابھی تک پتا نہیں چلا کہ شہادت کیا ہوتی ہے۔ بھائی! جنگ بدر، جنگ احد میں کیا شہیدوں کی لاشیں سلامت رہی تھیں۔ حضرت حمزہ کی لاش مقدسہ کا کیا حشر ہوا تھا۔ کیا ان لوگوں کے ٹکڑے نہیں ہوئے تھے۔ حضرت امام حسینؑ اور ان کے رفقاء کا کیا حشر ہوا تھا۔ یاد ہے کچھ اور شہید تو جنتی لوگ ہیں، ان کے لیے ہماری دعاؤں کی حیثیت ہی کیا ہے مگر دین حق کی خاطر جان دینا اور ان لوگوں کو ختم کرتے ہوئے اپنی جان دینا ہی تو شہادت کے زمرے میں آتا ہے۔"(۶۲)

اس طرح بچوں کی ذہن سازی کی جاتی ہے کہ بچوں کے نزدیک جہاد ہی افضل عبادت بن جاتی ہے یوں وہ اللہ اور اس کے پیارے رسول کی محبت میں کچھ بھی کرنے کو تیار ہو جاتے ہیں۔ مدرسوں میں طلبہ کی جس طرح

سے ذہن سازی کی جارہی زاہدہ حنا نے افسانہ "رقص مقابر" میں طالبان کی ذہنیت کو تنقید کا نشانہ بناتے ہوئے لکھا ہے:

"ہم نے طالبان کی شکل میں اللہ کی فوج بنائی ہے۔ اللہ کی فوج۔"(۶۳)

"رقص مقابر" مذہبی اداروں کی صورت حال، مذہب میں جہاد کا تصور اور اس کے بدلتے مفہوم، مذہبی انتہا پسندی، دقیانوسی تصورات، امن اور جہاد کا نعرہ ایک دوسرے کے متضاد عناصر کی نشان دہی کرتا ہے۔

"اسکرین دراز داڑھیوں اور سفاک چہروں سے بھرا ہوا ہے۔ تسبیح کے دانے شمار کرنے والی انگلیاں گولے اور میزائل داغ رہی ہیں۔ توپوں کی نالیں شعلے اگل رہی ہیں۔ الجہاد۔۔۔ الجہاد۔۔۔ الجہاد۔۔۔ الامان۔۔۔ الامان۔۔۔ الامان۔۔۔"(۶۴)

ملک میں پھیلنے والی دہشت گردی کے بعد سے اسلام میں داڑھی کی اہمیت اور جہاد دونوں کے معنی بدل گئے داڑھی والے شخص کو دہشت گرد اور جہاد کے نعرے کو دہشت گردی سے تعبیر کر دیا گیا۔ اس حوالے سے تقریباً ہر افسانہ نگار نے افسانے تخلیق کیے۔ خالد فتح محمد کا افسانہ "دھنک" میں بھی ایک شخص جو اسی محلے کا رہائشی رہا تھا جب کئی سالوں بعد وہاں لوٹ کر آتا ہے تو اس محلے کی صورت حال بدل چکی ہوتی ہے۔ اس کی اپنی بھی بڑی بڑی ڈاڑھی ہوتی ہے جس پر دوسرا شخص جو اسے جان پہچان کی بنا پر اپنے گھر میں جگہ دیتا ہے اسے کہتا ہے "کل اپنی ڈاڑھی صاف کروالینا"(۶۵) اسی سوچ کا غماز ہے کہ لوگ اسے دہشت گرد سمجھنے لگیں گے۔ مذہبی اقدار کا زوال اور مساجد کی بے حرمتی جیسے متعدد واقعات نے کس طرح مذہبی اداروں کو متاثر کیا ہے اس صورت حال کو زاہدہ حنا نے "منزل ہے کہاں تیری۔۔۔" افسانے کے سیاق میں اجاگر کیا ہے۔ انسان اپنے دنیا میں بھیجے جانے کے مقصد کو بھول گیا ہے اس کے برعکس صورت حال کو زاہدہ حنا کے الفاظ میں دیکھیے:

"انسان کو امان کہیں نہیں ملتی تھی، وہ رشتوں اور رفاقتوں سے محروم کر دیا گیا تھا نفرتوں کے اسٹاک ایکسچینج میں بھاؤ بڑھ رہے تھے۔ نسلی امتیاز اینڈ کمپنی، فرقہ واریت انٹرنیشنل، لسان اینڈ لسان برادرز، فرزند زمین اینڈ سنز، سب ہی کے بھاؤ آسمان کو چھو رہے تھے۔ نقد جاں کی قیمت گر رہی تھی اور موت کی قیمت چڑھ رہی تھی۔۔۔ "اے لوگو! خدا کے گھروں کی بے حرمتی ہوئی۔ "مسجدیں گرائی جارہی تھیں، مندر جلائے جا رہے تھے گرجاگھروں پر بلڈوزر چل رہے تھے، کچھ مسجدیں گرائی جارہی تھیں، مندرر جلائے جارہے تھے، گرجاگھروں پر بلڈوزر چل رہے تھے، کچھ مسجدیں تھیں جن کی

پیشانیوں سے کلمہ کھرچا جارہا تھا۔ "اے لوگو، خدا کے گھروں کی بے حرمتی ہوئی، بے حرمتی ہوئی۔"(۶۶)

فی زمانہ انسانی مزاج میں جو سفاکی در آئی ہے اس نے انسان کو اتنا خود غرض بنا دیا کہ یہ مسلسل درندگی کا مظاہرہ کر رہا ہے۔ مذہبی حوالے سے معاشرے میں اس وقت انتشار پھیلتا ہے اور مسائل پیدا ہونے شروع ہوتے ہیں جب ذاتی مقاصد کے لیے اس کا استحصال کیا جانے لگے یا پھر مذہب کی تعلیمات کو مسلکی اور سیاسی مفاد کے بھینٹ چڑھا دیا جائے۔ عوام حقائق کا جائزہ لیے بغیر جب ان چیزوں کو اپناتے ہیں۔ مسخ شدہ مذہبی بیانیوں کی اندھی پابندی ایسے نقصان دہ عقائد کو برقرار رکھتی ہے جو امن اور ہمدردی کے اصولوں کے خلاف ہیں۔ انتہائی صورتوں میں، اس طرح کی تحریفات نے بڑے پیمانے پر افراتفری کو ہوا دی ہے اور وسیع پیمانے پر ہنگامہ آرائی کے امکانات پیدا کیے۔ انسان نے کس طرح مذہب کو اپنے مقاصد کے لیے استعمال کیا ہے اس پس منظر میں منشایاد کے افسانے "خواب راستہ" سے مثال دیکھیے:

"صرف تیسری دنیا ہی کی نہیں بیٹا، پہلی اور دوسری دنیا والوں کی بھی ضرورتیں ہوتی ہیں اور بدلتی رہتی ہیں۔ کبھی ان کی ضرورت ملاجرنیل کی تھی انھوں نے اس سے انتہا پسندی کے فروغ کا کام لیا۔ اب نائن الیون کے بعد الٹا پہیا گمانے کی ضرورت پڑ گئی تو اسی مُلّائیت کو دہشت گردی قرار دے کر اس کے خلاف جنگ لڑی جارہی ہے۔"(۶۷)

ہمارے رویے اور رجحان بدلتے جارہے ہیں۔ مذہبی حوالے سے ہر سطح پر جدت آگئی ہے۔ پردے کا تصور تبدیل ہو رہا ہے۔ آصف فرخی کے الفاظ میں: "یہ حجاب کا لفظ بھی اب سننے میں آنے لگا ہے۔ ہمارے لڑکپن میں تو پردہ ہوتا تھا جو عورتیں کیا کرتیں تھیں۔"(۶۸) فرد کے رہنے سہنے کے طور طریقوں میں جدت آ گئی ہے۔ جدید آلات اور ٹیکنالوجی کی ترقی کے بعد مساجد میں لاؤڈ سپیکر کا استعمال عام ہو گیا ہے۔ عبادت، نماز اور اذان کے وقت کا خاص احترام کرتے ہوئے خاموشی اختیار کی جاتی تھی۔ ہندوستان سے جدا ہونے کی وجوہات میں سے ایک بڑی وجہ غیر مسلموں کی جانب سے عبادت کے وقت شور شرابے جیسے مسائل کا سامنا رہتا تھا۔ مگر اب مملکت خداداد میں مساجد کے باہر سے گزرنے والی گاڑیوں کا شور عام بات ہو گئی ہے اور نماز پڑھتے ہوئے فون کی اگر آواز بند نہ ہو تو اس کا شور بھی نماز میں کیسے خلل پیدا کرتا ہے اس کی عکاسی آصف فرخی نے افسانہ "کھجور کا درخت" کے ذریعے کی ہے۔

"سجدے میں سر رکھنے نہیں پایا تھا کہ ایک اور دھن نے چونکا دیا۔ اس کے ساتھ کوئی الفاظ نہیں تھے ایک مشینی بھنبھناہٹ تھی جو اونچی ہوتی، پھر نیچے سُر میں جاتی، پھر بلند ہوتی۔۔۔ ٹی ٹی ٹی ناں ناں ناں۔۔۔ (ایسی ایک اور دھن بھری مسجد میں) تیسری صف کے کسی آدمی کی جیب میں موبائل بج رہا تھا، وہ بظاہر سنی ان سنی کیے ہوئے تیزی سے ہونٹ ہلا رہا تھا۔"(۶۹)

مسجد کے باہر گاڑیوں کا شور، عصری عادات اور مسجد کے مقدس ماحول میں نماز کے دوران بجنے والا فون تصادم کی علامت ہے اور مذہبی مقامات کو درپیش چیلنجز کو اجاگر کرتا ہے اس صورت حال کی عکاسی کے ذریعے مذہبی اداروں کے اندر بدلتے ہوئے رویوں اور ایسی جگہوں کے تقدس پر ٹیکنالوجی کے اثرات پر غور و فکر کرنے کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ اس افسانے میں افسانہ نگار نے راوی کے ذریعے ہمارے اسلامی رہن سہن اور بول چال کے بدلتے ہوئے رویوں کی تصویر کشی بھی کی ہے۔ جو پاکستانی کلچر، ماحول اور مزاج سے مناسبت رکھنے والی چیزوں کے برعکس مغربی کلچر کو اپنانے کا نوحہ ہے۔ افسانے سے اقتباس ملاحظہ ہو:

"ممانی جان کی نواسی، جو ابھی چند دن پہلے اپنی ماں کے ساتھ کینیڈا سے واپس آئی ہے، سر پر دوپٹہ ڈالے گڑیا سی بنی کھڑی تھی۔۔۔ میں تھینک یو نہیں کہتی۔ امی نے بتایا تھا جزاک اللہ کہتے ہیں اور شکراً۔۔۔ وہ کہہ رہی تھی۔ مجھے لگا کہ وہ بچی وہاں نہیں کھڑی ہوئی، میں بہت پیچھے اور بہت پہلے اپنی دادی کی بات سن رہا ہوں جو جانے کب کی خاک میں مل چکی ہوں گی۔۔۔"(۷۰)

ثقافتی منظر نامے میں بدلتے ہوئے اقدار، ادب و آداب کے طریقے ہمارے مشرقی ماحول پر مغربی اثرات کے امتزاج کو اجاگر کرتے ہیں۔ کینیڈا سے آئی بچی کے آداب اس کی ماں کی تربیت کے عکاس ہیں جب کہ پاکستان جو اسلامی ملک ہے یہاں لوگوں نے اپنے اطوار میں کس طرح جدیدیت کو اپنا لیا ہے یہ عالمگیریت کے اثرات اور متنوع ثقافتی اقدار کے ملاپ کو ظاہر کرتا ہے۔ ارتقاء پذیر معاشرتی اقدار کے پیش نظر افراد اپنی مذہبی شناخت کھو چکے ہیں اور روایتی اقدار پر عالمی اثرات نے غلبہ پا لیا ہے۔ اسی طرح سلام کی جگہ ہیلو کا رواج عام ہو گیا ہے۔ ہمارے رسم و رواج بدل رہے ہیں۔ پاکستان کے ابھرتے ہوئے سماجی اور مذہبی منظر نامے میں، روایتی مسلم تہوار جیسے میلاد، عید الفطر، اور عید الاضحیٰ جوش و خروش کے ساتھ منائے جاتے رہے ہیں بچے سال بھر ان تہواروں کا انتظار کرتے تھے اور انہیں جوش و خروش سے منایا جاتا تھا۔ اکیسویں صدی نے اس

حوالے سے عالمی رجحانات سے متاثر ایک قابل ذکر تبدیلی کو قبول کیا ہے جس میں نوجوان نسل نے اپنی مسرت کے نئے نئے دروا کیے جن میں فادرز ڈے، مدرز ڈے، سسٹر ڈے، اور ویلنٹائن ڈے جیسی تقریبات کو قبول عام حاصل ہوا، جو خالصتاً مذہبی رسومات کی طرح افراد میں ان عالمی تقریبات کے جوش و خروش کو اجاگر کرتی ہیں۔ یہ اور ایسے کئی دیگر مغربی تہوار نئی نسل کے لیے تفنن اور خوشی کا ذریعہ جب کہ پچھلی نسل کے لیے کافرانہ افعال ہیں۔ کوئی ان دنوں کو منانا اچھا جانتا ہے کوئی برا معاشرہ اس کش مکش میں مبتلا ہے۔ آصف فرخی کا افسانہ "ویلنٹائن" جدید اور قدیم تہذیب میں الجھے بچوں کی کہانی ہے۔ جہاں ایک چھوٹا سا بچہ سرمد ہارٹز والا کیک نہ آنے پر روتا ہے اور پھر خود ہی یہ بھی کہہ دیتا ہے کہ اچھا ہوا آپ نہیں لائے ورنہ آپ بھی میری طرح کافر ہو جاتے۔

> "۔۔۔ صبح عمار نے اور اسامہ نے ان سے کہا تھا ہیپی ویلنٹائن ڈے مس! سارے بچوں نے اسمبلی میں بڑی میڈم سے بھی کہا تھا۔ وہ تو ہنستی رہیں مگر کلاس مس بہت غصہ ہو گئیں۔ انہوں نے یہ بھی دیا۔۔۔ میں نے دیکھا اس کی مٹھی میں ایک پرچہ دبا ہوا ہے۔ اس پر جلی حروف میں لکھا ہوا تھا۔۔۔ ویلنٹائن ڈے کافروں کی رسم ہے۔ اس کو منانے والے کافر ہیں۔"(۷۱)

بیان کردہ منظر ایک غیر مذہبی رسم ویلنٹائن ڈے منانے کے تناظر میں مذہبی تصادم کی عکاسی کرتا ہے۔ ایک ہی ادارے کی سربراہ کا بچوں کے ہیپی ویلنٹائن ڈے کہنے پر پُر جوش مسکراہٹ کے ساتھ جواب دینا، جب کہ اسی ادارے میں کلاس ٹیچر کا غصہ کرنا اور بچوں کو یہ باور کروانا کہ جو لوگ اسے مناتے ہیں وہ کافر ہوتے ہیں۔ یہ مائیکرو کاسمک واقعہ وسیع تر معاشرتی تناؤ، ابھرتے ہوئے ثقافتی منظر نامے اور مختلف نقطہ نظر رکھنے والوں میں افہام و تفہیم پیدا کرنے کی ضرورت کو اجاگر کرتا ہے۔ افسانہ "نالائق" اسی موضوع کے حوالے سے ایک خوبصورت پیش کش ہے۔ اس کی ندرت یہ ہے کہ اس میں ایک ہی واقعہ دو مختلف زاویوں کو پیش کرتا ہے۔ ایک زاویہ عصری دور میں طلبہ کی اساتذہ سے بے تکلفی کو اجاگر کرتا ہے دوسرا زاویہ مذہبی سیاق و سباق میں اپریل فول کے دن کی مناسبت سے ہے۔ اسلام سچائی، ایمانداری اور دوسروں کے احترام پر بہت زور دیتا ہے۔ اس دن کی مناسبت سے کھلے عام، جھوٹ، دھوکہ دہی، فریب کو مذاق کے نام پر منانا اس کو کچھ لوگ منفی اقدار کے طور مذہبی اصولوں کے خلاف سمجھتے ہیں اور نوجوان جوش و خروش سے اس دن کو ہنسی مذاق کے طور پر اپناتے ہوئے نظر آتے ہیں۔

"ارشد نے آپ کے ساتھ مذاق کیا ہے۔ آج فرسٹ اپریل ہے گدھے کو فرسٹ اپریل فول کا معلوم ہی نہیں، کیا چھپا ہے اس کے پیچھے؟ اور پھر گدھے کو میں ہی ملا تھا بے وقوف بنانے کے لیے۔۔۔"

"ارشد نے خود ہی شوخی سے اور چہک کر کہا تھا۔ سر جی "فرسٹ اپریل فول مبارک۔"(۷۲)

ان دنوں کی خوشیوں کے مقابلے میں نوجوان نسل میں عید کی ماند پڑتی خوشیوں کو حمید شاہد نے افسانہ "خالی بٹوا" میں نسٹلجیائی انداز میں سمیٹا ہے۔ افسانہ کے آغاز میں ہی حال اور ماضی بیک وقت سکرین پر چلتی ہوئی فلم کی طرح نظر آتے ہیں۔ روای جس دور کی بات کر رہا ہے وہ اس کے نزدیک کچھ زیادہ پرانا نہیں ہے لیکن اب عید کے معنی ہی بدل دیے گئے ہیں۔ راوی کے بچپن کے عید کے دن سادہ مگر پر رونق زندگی کی گہما گہمی سے مزین تھے۔ "خالی بٹوا" زندگی کے خالی پن کا عکاس ہیں۔ روای اپنے بچپن کی عید کا حال سناتے ہوئے عید کے چاند سے لے کر عید کے لیے کیے جانے والے خصوصی انتظامات کو بھی بیان کرتا ہے کہ کس طرح سے اب یہ سب کچھ تبدیل ہو گیا ہے۔ روای کے بچپن میں عید کا چاند دیکھنے کا بیان، عہد حاضر کی طرح شعیہ سنی کے آپسی بیر نہ ہونے کا تذکرہ، دوسروں کے عقائد کا احترام، ہر مسجد میں جوش و جذبے کے ساتھ عید کے چاند اور نماز کا اعلان، چاند رات کی خوشی میں رات بھر جاگنا، عید ملنا، خاندان اور رشتے داروں کا مل بیٹھنا، گلی محلے، دوکانوں کو سجانا، میلے، جھولے یہ سب عید کی خوشیوں کا اہتمام ہوا کرتا تھا۔ راوی کے پاس اس وقت جھولا جھولنے کے لیے پیسے نہیں تھے کیوں کہ وہ نیا بٹوا لینا چاہتا تھا لیکن اب تہوار منانے والی وہ تمام اقدار بدل گئی ہیں اب راوی کے پاس ایک نیا بٹوا تو ہے لیکن وہ خوشیاں ماند پڑھ چکی ہیں اس وقت کے دھیلا ملنے کی خوشی اب نادر و نایاب ہے کیوں کہ اب ہزاروں روپے بھی اپنی وہ اہمیت کھو چکے ہیں۔ ان خوشیوں کو ماند ڈالنے والے عناصر بھی غور کرنے پر افسانے میں ہی مل جاتے ہیں جس میں فرقہ واریت، ایک دوسرے کے نظریات و عقائد سے بڑھتا ہوا اختلاف، ملک میں دہشت زدہ ماحول، بچوں کی کمپیوٹر اور موبائل فون پر انٹرنیٹ کی موجودگی میں بڑھتی ہوئی دلچسپی ہر چیز سے بے نیاز ہو جانے والے پروگرام اور موسیقی یا زیادہ ہی ہو تو کسی ہوٹل پر کھانا یا پیزا کھانے چلے جانا آج کے دور میں خوشیاں منانے کا ذریعہ بن چکے۔ جسے بڑی مہارت سے محمد حمید شاہد نے کہانی کے پیکر میں تغیر پذیر حالات کو کوزے میں بند کیا ہے۔

والدین کی خدمت و اطاعت اولاد کا فرض ہے اور اس کا درس قرآن و حدیث کی روشنی میں بھی عیاں ہوتا ہے۔ والدین کی خدمت ان کا ادب و احترام پاکستانی معاشرے میں بنیادی قدر کی حیثیت رکھتا ہے۔ آصف فرخی کے افسانوں میں "مینا کی گنتی"، "نانو ہاؤس" اور "مسہری" ایسے افسانے ہیں جن میں والدین کی تنہائی، اداسی، بے بسی، مایوسی اور محتاجی کو موضوع بنایا گیا ہے کہ کیسے والدین بچوں کو پالتے ہیں، ان کی ہر ضرورت کا خیال رکھتے ہیں، مشکل وقت میں ان کے مددگار و معاون ہوتے ہیں لیکن جیسے ہی وہ خود بڑھاپے میں داخل ہونے لگتے ہیں انہی بچوں کے لیے یہ والدین وبال جان بن جاتے ہیں۔ یہی اولاد روزگار کے حصول کے لیے والدین کو تن تنہا چھوڑ کر دوسرے ممالک میں جا بستے ہیں۔ جو بچے یہاں ہیں وہ بھی اپنی معمولات زندگی میں اس قدر مصروف ہیں کہ والدین کو کھڑے پاؤں ملنے آتے ہیں یا ایک میسج اور فون کال پر انہیں اپنا خیال رکھنے کی تاکید کر دیتے ہیں اور والدین کی وفات کے فوراً بعد جائیداد کے حصول کے لیے ایک دوسرے کے دشمن بن بیٹھتے ہیں اور چھینا جھپٹی کا سما بن جاتا ہے۔ جیسا کہ افسانہ مسہری میں اس صورت حال کو عمدگی سے قلم بند کیا گیا ہے۔ "اس گھر کے سامان پر حق تو ہمارا ہے۔ آخر کو وارث ہم ہیں۔ تم کو تمہارا حصہ مل جائے گا شرع کے مطابق۔"(۷۳) بہن جس نے ساری زندگی والدین کی خدمت کی، چاہے فوری ڈاکٹرز کے پاس لے کر بھاگنا پڑتا، سردی ہو یا گرمی، والدین کے کھانے یا تنہائی میں ان کو بہلانا ہو تا سب کے لیے ان کی بیٹی ان کے پاس ہوتی مگر اس بیٹی کو والدین کی وفات کے بعد جائیداد میں سے حصہ دینے کے نام پر شریعت یاد آجاتی ہے اور اس کے حصے اگر کچھ آ بھی جائے تو اس پر بھی قابض ہو جاتے ہیں۔ ان افسانوں کے ذریعے افسانہ نگاروں نے اس حقیقت کو اجاگر کیا ہے کہ معاشرے میں افراد مذہب کو صرف اپنے مفادات کے طور پر استعمال کرتے ہیں۔

مذہبی تعصب کی وجہ سے معاشرے میں تنگ نظری، گھٹن اور انتشار کی صورت حال پیدا ہوئی۔ ادیبوں نے اپنی تخلیقات کے ذریعے معاشرے میں پھیلی تنگ نظری کے برعکس وسیع النظری کو فروغ دینے کے لیے اپنے قلم میں تاثیر پیدا کی۔ آج مذہبی اور سائنسی ترقی نے انسان کو جو معاشرہ دیا ہے اس میں مذہب کو چاہے آفاقی تصور کیا جائے یا کسی مخصوص گروہ یا نظریے کا پروردہ دونوں کا مقصد تضادات میں گھری انسانی فطرت کی رہنمائی کرنا ہے۔ اکیسویں صدی کے افسانوں کا مطالعہ اس حقیقت کا غماز ہے کہ پاکستانی معاشرے میں پائے جانے والے مذہبی تضادات سے فرد نہ صرف واقف ہے بلکہ اس سے راہ فرار بھی حاصل کرنا چاہتا ہے۔ صحت مند معاشرے کے لیے ضروری ہے کہ انسان اپنی فطری معاشرتی کمزوریوں کو بدلتے ہوئے معاشرے اور نئے تصورات کی روشنی میں از سر نو تشکیل دے۔ افسانوں کا مذہبی تناظر میں مطالعہ اور مذہبی

اداروں کی صورت حال اس ضرورت کو محسوس کرتا ہے کہ معاشرہ جدت کو قبول کرتے ہوئے مذہبی تضادات کو دور کرنے کے لیے مشترکہ حکمت عملی کو فروغ دے۔

د۔ معاصر افسانے میں تعلیمی نظام اور تغیرات

کسی بھی معاشرے کی معاشرتی زندگی میں تغیر اور مستقبل کے تحفظ کا سب سے اہم ذریعہ "تعلیم" ہے۔ تعلیم قوموں کے عروج وزوال، معیار زندگی بہتر بنانے، معاشی ترقی کو فروغ دینے، فرد کو بااختیار بنانے، فرد کی انفرادی اور معاشرے کی اجتماعی ترقی کا ذریعہ ہے کیوں کہ تعلیم فرد کو نہ صرف باصلاحیت بناتی ہے بلکہ اس کے ہنر میں نکھار پیدا کرتی ہے، نئی اختراعات کی ترغیب دیتی ہے اور تخلیقی صلاحیتوں کو بلند کرتی ہے۔ دیگر معاشرتی اداروں کی طرح تعلیمی ادارے بھی فرد کی ذہن سازی اور معاشرتی اقدار کے فروغ میں اہم کردار ادا کرتے ہیں۔ تعلیم سے مراد کسی خاص شعبے میں مہارت حاصل کرنا، اس شعبے کی مبادیات کو جاننا، درست اور غلط چیز کا فیصلہ کرنے کا شعور رکھنا ہے۔ تعلیم، جو کبھی علم کے حصول اور دنیا کے بارے میں سمجھ بوجھ رکھنے کا ذریعہ سمجھا جاتا تھا اس کے مقصد اور معنی میں ایک قابل ادراک تبدیلی آگئی ہے۔ عصری معاشرے میں تعلیم کے حصول کا بنیادی مقصد روزگار کے حصول کی صورت میں سمجھا جاتا ہے۔ پاکستان میں گزشتہ چند دہائیوں کے دوران تعلیمی نظام میں واضح تبدیلیاں آئی ہیں۔ خاص طور پر خواتین کی تعلیم پر خصوصی توجہ دی گئی ہے۔ تعلیمی نظام کو بہتر بنانے کے لیے مختلف پالیسیاں بنائی گئی۔ تعلیم کے میدان میں انفارمیشن ٹیکنالوجی نے بھی اہم کردار ادا کیا ہے۔ بہت سے اہم کورسز آن لائن متعارف ہوئے یوٹیوب اور دیگر آن لائن ذرائع پر کچھ بہترین لیکچرز کی مدد سے لوگ نئے علوم سیکھنے لگے۔ برقی کتب کی دستیابی نے دور دراز کے سفر اور بڑے بڑے کتب خانوں کے چکروں سے بچایا ای میل کی سہولت نے دوسرے ممالک میں بسنے والے پروفیسر صاحبان سے رابطہ آسان بنایا۔ ان جدیدیات کی موجودگی نے تعلیم کے میدان میں اس طرح کے تغیر کے بے شمار راستے کھولے۔ فرد کی شخصیت اور ذات کی تشکیل میں تعلیم کا اہم کردار ہے۔

پاکستان کے تعلیمی اداروں میں ہونے والی تبدیلیوں کی وجہ سے معاشرتی اقدار میں بھی تغیر آیا۔ مثلاً خواتین کو یکساں تعلیمی مواقع فراہم کرنا اور خواتین کا اعلیٰ تعلیم حاصل کرنا؛ جب کہ خواتین کی تعلیم کی طرف پہلے خاص توجہ نہیں دی جاتی تھی۔ اب خواتین اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے ساتھ ساتھ مردوں کے شانہ بشانہ اعلیٰ عہدوں پر بھی فائز ہیں۔ اسی طرح پاکستان میں مخلوط تعلیمی نظام کا تصور نہ تھا اور لڑکے اور لڑکیوں کا ایک

ہی ادارے میں ساتھ ساتھ تعلیم حاصل کرنا پسند نہیں کیا جاتا تھا جب کہ اب یہ معاشرتی قدر بھی تغیر پذیر ہے۔ تعلیمی نظام کو جدید تقاضوں کے ہم پلہ لانے کے لیے تعلیمی اداروں میں نئے اور جدید علوم کی تدریس بھی جاری ہے۔ نئی یونیورسٹیوں کے قیام اور سرکاری اداروں کے ساتھ ساتھ نجی تعلیمی اداروں کا قیام بھی عمل میں آیا جس کے لیے یکساں قومی نصاب اور یکساں طریقہ تدریس کو متعارف کروانے کے لیے بھی اہم اقدامات کیے گئے۔ نصاب کو جدید تقاضوں کے مطابق تشکیل دیا گیا۔ اسی طرح کمپیوٹر کی تعلیم کو بھی درج اول سے نصاب کا حصہ بنایا گیا۔ جدید دور اور جدید تقاضوں کو مد نظر رکھتے ہوئے تعلیمی اداروں کو خاص طور پر اس تیزی سے بدلتے ہوئے منظر نامے میں کافی چیلنجیز کا سامنا ہے۔ شاہد صدیقی لکھتے ہیں:

> "یہ صدی علم کی صدی ہے جس میں تبدیلی کی رفتار کئی گناہ زیادہ ہو گئی ہے۔ وہی تبدیلی جو ماضی میں برسوں بعد آتی تھی اب وہ مہینوں اور دنوں میں آ رہی ہے۔ اس تیز رفتار تبدیلی کے اثرات معاشرے کے ہر شعبے پر پڑ رہے ہیں۔ تعلیمی ادارے بھی اس کی دستبرد سے محفوظ نہیں۔"(۷۴)

اکیسویں صدی کے تیزی سے بدلتے ہوئے منظر نامے میں شعبہ تعلیم کو جدید تقاضوں کے ہم پلہ لانے کے لیے تعلیمی میدان میں بہت سی تبدیلیاں کی جا رہی ہیں۔ پاکستان کے تعلیمی نظام میں جہاں بہت سی تبدیلیاں ترقی اور اہداف کو حاصل کرنے کے لیے رونما ہو رہی ہیں وہاں بیک وقت تعلیمی نظام مختلف مسائل سے بھی دوچار ہے جو ترقی کی راہ میں حائل مشکلات میں اضافے کا باعث ہے۔ بہر حال پچھلے کچھ سالوں سے تعلیم کے میدان میں ہونے والی اہم تبدیلیوں کے باعث طلبہ میں پیشہ ورانہ صلاحیتوں کو اجاگر کرنے میں مدد ملی تاکہ پاکستان میں بھی آنے والی نسلیں اپنے وطن کے لیے علم کی روشنی سے پاکستان کا مستقبل روشن کر سکیں۔ تعلیمی نظام کے حوالے سے اس صورت حال کی بھرپور عکاسی منتخب کردہ اکیسویں صدی کے افسانوں میں بھی ملتی ہے۔ تعلیم کی اہمیت کے پیش نظر حکومتیں تعلیمی نظام کو بڑھانے کے لیے پالیسیاں بنانے اور اقدامات کو نافذ کرنے میں اہم کردار ادا کرتی ہیں۔ پاکستان میں بھی تعلیم کے شعبے میں بہتری کے لیے مسلسل کوششیں کی گئی ہیں۔ حکومت کی طرف سے اٹھائے گئے کچھ اہم اقدامات میں سے ایک تعلیمی اداروں کے لیے فنڈز مقرر کرنا ہے۔ حمید شاہد نے حکومت کی ان کوششوں کو افسانہ "کوئٹہ میں کچلاک" میں اجاگر کیا ہے۔

> "بلوچستان کی حکومت کو اپنے صوبے کے سکولوں اور دوسرے دفاتر کی نئی عمارتیں بنانے اور مزید سکول کھولنے کے لیے بہت سے فنڈز ملے۔۔۔"(۷۵)

انفراسٹرکچر کو بہتر بنانے، معیاری تدریسی مواد فراہم کرنے اور تعلیمی پروگراموں کی حمایت کے لیے فنڈز میں اضافہ ضروری ہے۔ حکومتی سطح پر تعلیم تک ہر فرد کی رسائی کو بڑھانے کے لیے کوششیں کی گئی ہیں، خاص طور پر پسماندہ علاقوں میں سکول بنائے گئے۔ طلبہ کو اسکالرشپ فراہم کرنے جیسے اقدامات کیے گئے جس کا مقصد تعلیم کی راہ میں حائل رکاوٹوں کو کم کرنا ہے۔

پاکستان کے تعلیمی میدان میں بالخصوص اکیسویں صدی میں رونما ہونے والی تبدیلیوں میں قابل ذکر تبدیلی لڑکیوں کی تعلیم کے حوالے سے ہے۔ تعلیم کے معاملے میں روایتی صنفی فرق کو ختم کرنے کی کوششیں کی گئی ہیں، سماجی و اقتصادی رکاوٹوں کو دور کرنے کے لیے اہم اقدامات کیے گئے اور پالیسیاں نافذ کی گئی جن کا مقصد لڑکیوں کو سکول تک رسائی کے مساوی مواقع فراہم کرنا ہے۔ نتیجے کے طور پر، سکولوں اور یونیورسٹیوں میں جانے والی لڑکیوں کی تعداد میں بتدریج اضافہ ہوا۔ خواتین کا تعلیم حاصل کرنا اس وقت دنیا کے تربیت یافتہ سماج کا عمومی رجحان ہے۔ پاکستان میں بھی خواتین کے تعلیم حاصل کرنے پر کافی لے دے ہوتی رہی ہے کئی سارے معاملات جو ناگہانی تھے انہوں نے خواتین کی تعلیم پر پابندیاں لگانی شروع کیں کئی بار فتوے لگائے گئے، مناظرے ہوتے رہے کہ خواتین کو تعلیم حاصل کرنی چاہیے یا نہیں اور کئی بار یہ بھی کہا گیا کہ ایک پڑھی لکھی ماں ہی پڑھی لکھی اولاد کی اچھی تربیت کر سکتی ہے۔ اس طرح کے کئی معاملات سامنے آئے اور دوسرا رجحان اس میں مذہبی تعلیم کی صورت میں آیا کہ خواتین کو دنیاوی تعلیم کے بجائے مذہبی تعلیم اور فنی تعلیم فراہم کرنی چاہیے جس میں سلائی کڑھائی، دست کاری وغیرہ شامل ہے۔ اس حوالے سے بھی عوام کا خاصہ رجحان رہا۔ لیکن آج وقت بڑی حد تک تبدیل ہو چکا ہے خواتین پاکستان میں بھی کئی سارے ایسے شعبوں میں بھی کام کر رہی ہیں جو کسی زمانے میں صرف مردوں کے لیے مختص تھے۔ مثلاً فوج، ائیر فورس، مزدوری وغیرہ کے مختلف کام۔ خواتین کا تعلیم حاصل کرنا اس لیے بھی ضروری سمجھا جاتا ہے کہ کل کو وہ اپنی معاشی اور ازدواجی زندگی میں بہترین کردار ادا کر سکے، اگر کبھی اسے ضرورت پیش آئے تو وہ اپنی اس تعلیم کو بروئے کار لاتے ہوئے گھر کی چکی چلا سکے اور اپنے اخراجات پورے کر سکے کیوں کہ یقین سے کچھ نہیں کہا جا سکتا کہ اگلا لمحہ مخصوص شخص پر کس صورت میں گزرتا ہے۔ لہذا عصری تقاضوں کے مطابق خواتین تمام شعبہ ہائے زندگی میں خواتین نہایت قابلیت اور مستند طریقے سے اپنے فرائض سر انجام دے دیتی ہوئی نظر آ رہی ہیں جو کہ پاکستان کے بدلتے منظر نامے میں معاشرتی تغیر اور اخلاقی برتری کا باعث بھی ہے۔ وقت کی ضرورت کے مطابق والدین کی طرف سے لڑکیوں کی اعلیٰ تعلیم پر توجہ مرکوز کرنا ہماری معاشرتی اقدار میں بڑی تبدیلی کا

پیش خیمہ ہے۔ والدین کو ایسی اقدار اپناتے ہوئے بیٹیوں کی تعلیم اور بااختیار بنانے میں فعال طور پر تعاون کرتے ہوئے دیکھا جاسکتا ہے۔ نیلوفر اقبال نے افسانہ "مساوات" میں اس تغیر پذیر قدر کو روایتی توقعات کے بر عکس ڈاکٹر ستار جیسا کردار تخلیق کر کے (جو اپنی بیٹی مریم کو پی ایچ ڈی کے سلسلے میں امریکہ بھیج دیتے ہیں) والدین کی ترقی پسندانہ سوچ کو اجاگر کیا ہے۔ اقتباس ملاحظہ ہو:

> "جب تعلیم کا وقت آیا تو مریم کو بہترین سکولوں میں پڑھایا گیا۔ پھر اس نے اعلیٰ تعلیم کی خواہش ظاہر کی۔ اس کی ماں نے شادی کا ذکر چھیڑا تو مریم رونے لگی۔ اس کی عمر چھبیس سال ہو چکی تھی جو کہ شادی کے لحاظ سے پہلے ہی خاصی عمر سمجھی جاتی ہے۔۔۔ مگر وہ اور پڑھنا چاہتی تھی۔ اس پر ڈاکٹر ستار نے مخالفت کی اور کہا کہ جس طرح بیٹے اعلیٰ تعلیم حاصل کر رہے ہیں، ویسے ہی بیٹی بھی جتنا چاہے گی پڑھے گی۔۔۔"(۷۶)

ڈاکٹر ستار کا مریم کو ان کے بیٹوں کی طرح تعلیمی مواقع فراہم کرنے کے بارے میں ان کا موقف روایتی سوچ کو چیلنج کرتے ہوئے صنفی بنیادوں پر قائم پابندیوں کی نفی کرتا ہے نیز بیٹوں اور بیٹیوں دونوں کے لیے مساوی مواقع خواتین کو اپنے تعلیمی اور پیشہ ورانہ اہداف کے حصول کے لیے خود مختاری فراہم کرنے کی اہمیت کو واضح کرتا ہے۔ تعلیمی حوالے سے نہ صرف شہروں میں بلکہ دیہاتوں میں بھی اقدار میں تبدیلی آئی ہے۔ خواتین کا تعلیم کے حصول کی طرف رجحان اس قدر بڑھ گیا ہے کہ خواتین میں تعلیم کے حصول کے لیے باغیانہ رویہ بھی دیکھا جا سکتا ہے ۔ حمیرا اشفاق کا افسانہ "روشنی کا سفر" تعلیم حاصل کرنے کے لیے سمی کی بغاوت کا عکاس ہے۔ کہانی کی ابتدائی سطور سمی میں خاص طور پر تعلیم کے تئیں ایک پر عزم اور باغیانہ رویہ کی نشاندہی کرتی ہیں۔ یہ بیان کہ "سندھ کی بیٹی ہوں، مجھے زمین میں گاڑ دو گے تو میں کسی اور طرف سے راستہ بنا لوں گی۔"(۷۷) سمی کی ثابت قدمی اور رکاوٹوں پر قابو پانے کے عزم کا اظہار ہے۔ سندھ کی بیٹی کے طور پر سمی کی شناخت ثقافتی پس منظر میں عزائم کے لیے ڈٹے رہنے کا عکاس ہونے کے ساتھ ساتھ اس ماحول سے روشناس کروانے میں اہم کردار ادا کرتا ہے جو دقیانوسی تصورات سے پیوستہ ہے۔ سمی کا بھائی شیدو اس پر پابندیاں عائد کرتا ہے تاکہ اس کی بہن تعلیم تک رسائی حاصل نہ کر سکے۔ یہ صورتحال صنفی عدم مساوات کے حوالے سے جہالت کو اجاگر کرتی ہے۔

"ہاں شیدو! کیا کیا تو نے بہن کے ساتھ؟ اس کو مارا پیٹا اور کمرے میں بند کر دیا۔" یہ کون سی غیرت ہے عورت پر ہاتھ اٹھاتے ہو۔ چار جماعت پڑھ لی ہوتی تو اس طرح کی گندی حرکت نہ کرتا۔" "دادی وہ ہماری برادری میں کوئی بھی چھوری سکول نہیں گئی۔"(۷۸)

شیدو کی دادی کا شیدو کو تعلیم کا حوالہ دینا کہ چوتھی جماعت مکمل کی ہوتی تو شاید وہ اس طرح کے رویے میں ملوث نہ ہوتا، اپنے آپ میں تعلیم کی اہمیت کو اجاگر کرتا ہے۔ تعلیم انسان کو مہذب بناتی ہے اس میں اقدار اور اخلاقیات کا احساس پیدا کرتی ہے۔ افسانے کا عنوان "روشنی کا سفر" علم کے حصول اور روشن خیالی کو استعاراتی طور پر اجاگر کرتا ہے۔ علی اکبر ناطق کے افسانوی مجموعے قائم دین کے پہلے افسانے "اچھو بازی گر" میں تعلیم کی اہمیت کو اجاگر کیا گیا ہے۔ افسانہ اپنے سیاق میں تعلیمی پس منظر اور تغیرِ روایات کے گرد گھومتا ہے۔ اچھو کلاس میں سی آر ہونے، اساتذہ اور ہم جماعت ساتھیوں میں معروف ہونے کے باوجود زندگی میں وہ مقام نہ پا سکا جو دور جدید میں ایک تعلیم یافتہ شخص کو حاصل ہونے لگا ہے۔ اچھو شروع سے ہی کھیلوں میں دلچسپی رکھتا تھا اس نے بازی گری کو جب بطور پیشہ اپنایا تو اسے تعلیم کی اہمیت کا احساس ہوتا ہے۔

"آہستہ آہستہ زمانہ آگے نکل گیا۔ اب بچے بازی گروں کے تماشوں کی بجائے کمپیوٹر اور انٹرنیٹ سے لطف لینے لگے۔"(۷۹)

بدلتے زمانے کے ساتھ اچھو کی قلابازیوں میں کسی کو دلچسپی نہ رہی کیوں کہ قلابازیوں سے زیادہ دلچسپی کا سماں انٹرنیٹ کی سہولت نے فراہم کر دیا ہے۔ اچھو کے دوسرے ہم جماعت ساتھی جنہوں نے پڑھائی پر خاصی توجہ دی تھی تعلیم یافتہ ہونے کی حیثیت سے ان کے مقام و مرتبے میں خاصہ فرق آ چکا تھا لوگ ان کو عزت سے ملتے تھے۔ افسانہ تعلیم کی معاشرتی اہمیت اور قدر دانی کا عکاس ہے۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ کیسے تعلیم کیریئر کے نئے در وا کرتی ہے۔ معاشرے میں تعلیم کے ابھرتے ہوئے منظر نامے کی اہمیت کے پیش نظر تعلیمی اداروں میں نئے علوم کا اضافہ ہوا۔ تعلیمی اداروں میں روایتی مضامین کے مقابلے ڈیٹا سائنس، مصنوعی ذہانت اور ماحولیاتی مطالعات جیسے اہم شعبوں کو شامل کیا گیا ہے۔ ادارے تیزی سے ترقی کرتے ہوئے ان نئے علوم سے طلبا کو آراستہ کرنے کے لیے نصاب کو ڈھال رہے ہیں۔ اس صورت حال کو رشید امجد نے افسانہ "ایک پرانی کہانی جسے دوبارہ لکھا گیا" میں بڑی مہارت سے اجاگر کیا ہے۔

"مدرسوں میں استاد طالب علموں کو نئے علوم سے آگاہ کر رہے تھے لیکن انہیں خود معلوم نہ تھا کہ یہ علم کیا ہیں اور کیوں اس کی تدریس کر رہے ہیں"(۸۰)

تعلیمی اداروں میں اساتذہ نئے علوم کو متعارف کروا کر طلبا میں فکری بالیدگی کی تشکیل میں اہم کردار ادا کرتے ہیں۔ اساتذہ کی ان کوششوں کے ذریعے انسانی فہم کے وسیع ذخائر اگلی نسلوں میں منتقل کیے جاسکتے ہیں۔ لیکن صورت حال یہ کہ اساتذہ خود نئے علوم کی نوعیت یا مقصد کو پوری طرح سے نہیں سمجھ سکے جو وہ فراہم کر رہے ہیں۔ ایک مثالی تعلیمی ماحول میں استاد سے توقع کی جاتی ہے کہ وہ جس مضمون کو پڑھا رہا ہے اس کی گہری سمجھ رکھتا ہو لیکن روز بروز بدلتے علوم سے اساتذہ کو اپ ڈیٹ کرنے کے لیے اساتذہ کی پیشہ ورانہ ترقی میں سرمایہ کاری کرنا بہت ضروری ہے۔ اساتذہ کے لیے تربیتی پروگرامز کا اہتمام نہ صرف ان کے علم بلکہ ان کی تدریسی مہارتوں کو نکھارنے میں بھی معاون ثابت ہو گا۔

ہنر مند افرادی قوت کی ضرورت کو تسلیم کرتے ہوئے طلبا کو عملی، تخلیقی اور تنقیدی مہارتوں سے آراستہ کرنے کے لیے بھی توجہ دینے کی ضرورت ہے۔ تعلیمی اداروں میں رائج امتحانی نظام کو ماہرین تعلیم اب فرسودہ تصور کر رہے ہیں کیوں کہ یہ امتحان محض یاداشت پر مبنی ہے۔ اس سے رٹا سسٹم کو فروغ حاصل ہوا جو بچوں کے سو فیصد رزلٹ کا باعث تو بن رہا ہے لیکن بچوں کے اعلیٰ نمبر حاصل کرنے کے باوجود ان کا شرح اکتساب تسلی بخش نہیں ہے۔ گل زیب عباسی کے افسانے "ننھا شجیل" سے اقتباس ملاحظہ ہو جو اس تعلیمی ماحول کو اجاگر کرنے میں معاون ہے۔

> "رزلٹ پہلی جماعت سے اعلان ہونا شروع ہوا تھا، شعبہ امتحان کی رپورٹ کے مطابق رزلٹ سو فیصد تھا، پھر دوسری جماعت کا رزلٹ بھی سو فیصد تھا، شجیل کو توقع ہی نہ تھی کہ اس کی پوزیشن ہو گی۔۔۔"(۸۱)

افسانے کا مرکزی کردار سست اور ڈھیلا ڈھالا بچہ شجیل ہے۔ کہانی نائن الیون کے بعد کی صورت حال کو اجاگر کرتی ہے جس کے پس منظر میں ہمارے امتحانی نظام اور اس کے مضمرات کو بھی اجاگر کیا گیا ہے۔ رزلٹ کے دن شجیل جب تڑے مڑے شاپر کو دیکھ کر پشاور والا واقعہ ذہن میں آتے ہی یک دم بم بم چلاتے ہوئے اپنے استاد سے جالپٹتا ہے تو کہانی میں اس کے خوف اور ڈر کی کیفیت کو اجاگر کیا گیا ہے کہ کیسے وہ خوف سے استاد سے جالپٹا تھا غیر شعوری طور پر شجیل کے اس عمل سے دھماکے سے قبل ہی وہاں موجود لوگوں کو اندازہ تھا کہ اب دھماکہ ہو گا یوں شجیل کے استاد سے لپٹنے کی وجہ سے استاد کا بھی جانی نقصان ہونے سے بچ گیا تھا۔ کچھ دن بعد سکول والوں نے شجیل کے اعزاز میں پروگرام منعقد کروایا جس میں شجیل کو بھی سٹیج پر جا

کر تقریر کرنی تھی اس کی تقریر کو افسانہ نگار نے قاری کے سامنے اس طرح پیش کیا ہے جس سے قاری ہمارے تعلیمی نظام کے پس پردہ نقائص کو بھانپنے میں کامیاب ہو جاتا ہے۔

"میری پہچان میرا وطن ہے، جب تک وطن سلامت ہے، ہم سب سلامت ہیں۔۔۔اس روز میں یہ سوچ کر سر مسعود صاحب سے لپٹا تھا، کہ ہمارے استاد کو کچھ نہ ہو، خدا کا شکر ہے، ہمارے اساتذہ اور بچے بچ گئے۔"(۸۲)

پاکستان میں تعلیمی نظام رٹا سسٹم کے فروغ کے حوالے سے تنقید کا نشانہ بنایا جاتا ہے، جہاں طالب علم تصورات کو صحیح معنوں میں سمجھے بغیر معلومات کو حفظ کر لیتے ہیں۔ یہ نقطہ نظر تنقیدی سوچ اور تخلیقی صلاحیتوں کو متاثر کرتا ہے۔ امتحانات میں اچھے نمبروں کے حصول پر مکمل توجہ مجموعی سیکھنے، طالب علم کی عملی صلاحیتوں، تخلیقی صلاحیتوں یا حقیقی دنیا کے حالات میں علم کو لاگو کرنے کی صلاحیت کو متاثر کرتی ہے۔ تعلیمی نظام پر کی جانے والی ایسی تنقید تعلیمی نظام میں تغیر کا موجب بن رہی ہے۔ ماہرینِ تعلیم اس حوالے سے نصاب اور امتحانی سسٹم میں آئے روز تبدیلیاں لاتے ہیں تاکہ تعلیمی نظام کو عالمی معیارات کے ہم پلہ لایا جا سکے۔

عہد جدید کے تعلیمی اداروں میں عربی، فارسی اور اردو کو پس پشت ڈال کر انگریزی کو زیادہ اہمیت دی جا رہی ہے۔ ہمارے تعلیمی نظام میں انگریزی کی اہمیت کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ اب تمام پرائیویٹ ادارے نہ صرف انگریزی زبان کو بات چیت کا بنیادی ذریعہ بناتے ہیں بلکہ وہ مضامین جو پہلے اردو میں پڑھائے جاتے تھے اب انگریزی سے بدل دیے گئے ہیں۔ ہمارے نظامِ تعلیم میں انگریزی کو بنیادی اہمیت حاصل ہے۔ افسانہ "چُھٹکی بی بی سکسینہ - تھوڑا فرانس اور سپین" میں اسد محمد خان نے دور حاضر کے نظام تعلیم کے برعکس اپنے زمانۂ طالب علمی کا احوال بیان کرتے ہوئے فارسی، عربی، سنسکرت کی اہمیت کو اجاگر کرتے ہوئے اس دور کے تعلیمی ماحول کی عکس بندی کی ہے جو عہد حاضر کے نظام تعلیم کا متضاد ہے۔

"ہمارے زمانۂ طالب علمی میں آٹھویں کلاس سے فارسی، عربی، سنسکرت کی باقاعدہ پڑھائی شروع ہوتی تھی۔ یہ اختیاری مضامین تھے، کوئی ایک ضرور لینا ہوتا تھا۔ جنھیں یہ سب اچھا نہ لگتا ہو گا ان کے لیے ڈرائنگ تھی اور جو بہت ہی انوکھے تھے ان کو اڈوانسڈ انگلش پڑھائی جاتی تھی۔"(۸۳)

اسد محمد خان کے اس افسانے میں ماضی کے تعلیمی نظام کو اجاگر کیا گیا ہے جہاں استاد فارسی کے شعر کہتے تھے، گردانیں کراتے، فارسی کے اشعار کی تشریح کرتے اور ایک خوش گوار ماحول میں طلبہ تعلیم حاصل

کرتے۔ اسی طرح انگریزی کی بارے میں لوگوں کے مختلف خیالات تھے پر آج جو اہمیت انگریزی تعلیم اور اس زبان کو حاصل ہے وہ کسی سے بعید نہیں۔ اب معاشرے میں انگریزی بولنے والے کو پڑھے لکھے شخص کی علامت کے طور پر لیا جاتا ہے۔

تعلیمی تناظر میں استاد اور شاگرد کا تعلق نیز مخلوط تعلیمی نظام میں بدلتی ہوئی اقدار کو بھی افسانہ نگاروں نے اجاگر کیا ہے۔ رشید امجد کا افسانہ "صحرا کہیں جسے" میں یونیورسٹی کے کھلے ماحول، لڑکیوں کے لباس، میک اپ، رکھ رکھاؤ اور جدید عہد کی اس لڑکی کی کہانی کو اجاگر کرتا ہے جو اپنے استاد سے روزانہ لان میں پڑھائی کے بہانے باتیں کرنے لگتی ہے اور مستقل ساتھ رہنا چاہتی ہے۔ تعلیمی اداروں میں کھلے ذہن کے نظام کا انضمام بدلتی ہوئی سماجی اقدار کے ضمن میں ایک بڑی تبدیلی کی نمائندگی کرتا ہے۔ طاہرہ اقبال کا افسانہ "کوشش سی" بھی اسی صورت حال کا نمائندہ افسانہ ہے۔

> "جس روز معاذ کے گروپ میں یونیورسٹی کی سب سے خوب صورت لڑکی مونا شامل ہوئی، تو پھر روائتی عشق کی کوئی چنگاری دیکھنے کو سبھی منتظر تھے، لیکن جب ماہم نے سر کی اس سنگت کی جی کھول کر تعریف کی تو مونا کھلنے کی بجائے مرجھاتی چلی گئی۔ ڈیپارٹمنٹ کی سیڑھیوں پر بیٹھا ہوا معاذ جب پیانو کے سر چھیڑتا تو مختلف ڈیپارٹمنٹ کی لڑکیاں برکھا بہار کی گھٹا بن امڈتی چلی آتیں۔۔۔"(۸۴)

"روایتی عشق کی چنگاری" کی توقع اور ماہم کی طرف سے اس کے نتیجے میں غیر روایتی ردعمل، تعلیمی ماحول میں مرد و خواتین کے تعامل اور ارد گرد پھیلے دقیانوسی بیانیوں سے جدا ہونے کی نشاندہی کرتا ہے۔ مخلوط تعلیمی ماحول اور تعلیمی اداروں کے اندر ابھرتی ہوئی سماجی تعامل کی متنوع شکلیں ایک وسیع تر سماجی تبدیلی کی طرف اشارہ کرتی ہیں جو روایتی اصولوں کے برعکس جامع اور کھلے ذہن کے نقطہ نظر کو اجاگر کرتا ہے۔ اسی طرح کا تعلیمی ماحول طاہرہ اقبال کے افسانے "شیلا کے پھول" میں بھی دیکھنے کو ملتا ہے۔ کہانی کے ذریعے اے لیول اور او لیول کے طلبہ کی ذہنی ہم آہنگی نمایاں کی گئی ہے جو آزادانہ طور پر ہر طرح کی سرگرمیوں میں حصہ لیتے ہیں۔ مخلوط تعلیمی نظام ان میں باہمی احترام اور طالبات میں یکساں خود اعتمادی کو اجاگر کرتا ہے۔ افسانے سے اقتباس ملاحظہ ہو:

> "solve the riddle why are you so different and rare." جواباً اے لیول کلاس کی بیشتر لڑکیوں نے اپنا ہی نام لکھا تھا اور اپنی انفرادیت اور نایابی کی وجوہ میں

بڑی وجہ یہ تحریر کی تھی۔Because I am so sexy لیکن لڑکوں میں سے تقریباً
سبھی نے عائشہ کا نام لکھ کر بڑے دلچسپ تبصرے رقم کیے تھے۔"(۸۵)

عصری تعلیمی منظر نامے میں معاشرہ صنفی مساوات اور سماجی ہم آہنگی کو فروغ دینے اور اس کے ممکنہ فوائد کے حصول کے لیے مخلوط تعلیمی نظام کی حمایت کرتا ہے، لیکن اس نظام سے وابستہ خدشات اور مسائل بھی ہیں جن میں خاص طور پر طالبات کو ہراساں کیے جانے والے مسائل اہم ہیں۔ اس ماحول سے پیدا ہونے والے مسائل کو بھی افسانہ نگاروں نے اجاگر کیا ہے۔

"جی سکول سے ہی بد تمیز آئے تھے۔۔۔ اب کالج میں آپ سی ماڈل، آپ سے پٹولے ہوں گے تو، اخلاق نامے "تو کھڈے لین" لگیں گے ہی نا۔۔۔ کہو میں نے کوئی جھوٹ بولا"۔ "رپورٹ کریں پرنسپل کے پاس جا کر"۔ "ایسا تو Co-education میں ہوتا ہی ہے جی، پرنسپل کے پاس جا کر خود کو ہیڈ لائن میں لاؤ گے کیا"(۸۶)

اگرچہ مردوں اور عورتوں کے درمیان دوستی فطری طور پر ممنوع نہیں ہے لیکن پاکستان کے ثقافتی اور سماجی تناظر میں مرد اور عورت کے تعلقات مذہبی اقدار کے تابع ہیں جس کے تحت ایک لڑکے اور لڑکی کی دوستی کوئی معنی نہیں رکھتی بلکہ دونوں ایک دوسرے کے لیے نامحرم ہیں۔ افسانہ نگار نے معاشرتی اقدار کے تغیر کو اجاگر کیا ہے کہ کیسے نوجوان نسل اس بات کو نظر انداز کرتے ہوئے کھلے ذہن کے ساتھ یونیورسٹی اور کلاس فیلوز کے ساتھ دوستانہ تعلقات کے ساتھ منسلک ہیں۔

"موبائل کی آواز سے اسے اندازہ ہو گیا یہ اس کی یونیورسٹی فیلو کا فون ہے جس کے ساتھ اس کا کلاس فیلو کے سوا کوئی رشتہ نہیں تھا۔ وہ اس کی یونیورسٹی فیلو تھی اور دوست۔۔۔ اس معاشرے میں جہاں لڑکی کو دوست کہنا ممنوع ہے پھر بھی وہ اس کی دوست تھی۔۔۔"(۸۷)

گل زیب عباسی کے افسانے "بڑا بھائی" سے منتخب کردہ حصہ مخلوط تعلیمی ماحول میں پیدا ہونے والے مسائل کو اجاگر کرنے میں معاون ہے۔ خواتین کے لباس کے حوالے سے جہاں تنقید کی گئی ہے وہیں ان کو ہراساں کیے جانے کے واقعات بھی پیش آتے ہیں اور اگر لڑکیاں رپورٹ کرنا چاہیں تو اس ممکنہ صورت حال کو بھی اجاگر کیا گیا ہے کہ کیسے رپورٹ کرنے کے بعد وہ ہیڈ لائن کے طور پر منظر عام پر آ جائیں گی۔ اسی طرح دیگر کئی اہم مسائل تعلیمی اداروں میں پائے جاتے ہیں۔ تعلیمی اداروں میں حکومتی سطح پر سخت پالیساں بنائی گئی ہے ہیں جن

کے تحت اساتذہ پر پابندیاں عائد کی گئی ہیں کہ وہ اب بچے پر کسی بھی قسم کا جسمانی تشدد نہیں کر سکتے۔ یہ اقدامات بچوں کے حقوق اور مثبت تعلیمی ماحول کو فروغ دینے کے لیے کیے گئے جس کے تحت بچے کو مارنا قانونی طور پر جرم قرار دیا گیا ہے۔ اس صورت حال اور اس کے منفی اور مثبت حقائق کو بھی افسانوں میں اجاگر کیا گیا ہے۔ "گھُماٹا" افسانے میں شازل پندرہ سالہ شریر بچہ ہے جو ڈاکٹر باسط کی لے پالک اولاد ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس کے والدین نے اسے ہر طرح کی آسائشیں عطا کیں اور اس کی ہر طرح کی جائز ناجائز خواہشات کا خیال رکھا مگر اس بے جا لاڈ پیار نے اسے اخلاقیات اور صحیح درست کی تمیز سے محروم رکھا۔ شازل کو "شازی گھُماٹا" کہہ کر اس کے ساتھی پکارتے تھے جو اس کے لیے تسکین کا باعث ہوتا۔ اس جیسے شریر بچے یا ایسے بچے جو اس کے ساتھ رہتے ہوئے اس جیسی حرکات و سکنات اپنانے لگے تھے ان میں آہستہ آہستہ اساتذہ کا احترام ختم ہوتا جارہا تھا۔ بچے کا سکول میں اساتذہ کے ساتھ رویہ بھی مناسب نہ تھا مگر قانونی طور پر استاد بچے پر ہاتھ نہیں اٹھا سکتے۔ نصر اللہ جو کچھ سختی کرنے والا استاد معلوم ہوتا تھا اس کا پیریڈ تبدیل کروا دیا گیا کہ یہ بچوں کو مارتا ہے۔ اس کے بعد میتھ کے استاد واجد صاحب کو تبدیل کر دیا گیا کہ ان کی ہمیں سمجھ نہیں آتی۔ اور بالآخر رضوی صاحب جو بچے کے ساتھ تھوڑی سختی کرتے ہیں تو بچہ ان سے بحث کرنے لگتا ہے اور ان پر الزام لگا دیتا ہے کہ انہوں نے مجھے گالی دی ہے۔ اس صورت حال پر رضوی صاحب کہتے ہیں کہ: "بھلا ایک استاد بچے کو گالی کیسے دے سکتا ہے اور وہ بھی میڈیا کی جھخ جھخ کے زمانے میں۔"(۸۸) رضوی صاحب کا یہ بیان میڈیا کے دور میں عصری تعلیمی، سماجی و ثقافتی منظر نامے کی عکاسی کرتا ہے۔ یہ بیان اس احساس کی نشاندہی کرتا ہے کہ موجودہ دور میں میڈیا نے بچوں کے حقوق کے بارے میں بیداری میں اضافہ کیا ہے۔ اساتذہ کی طرف سے بدسلوکی کے واقعات منظر عام پر آنے اور بڑے پیمانے پر ایسے اساتذہ کے خلاف ہونے والی کارروائیوں کی اہمیت کو اجاگر کرتا ہے کہ اس سب کے بعد کوئی بھی استاد کیسے بچوں کو کچھ بھی کہہ سکتا ہے۔ تعلیمی اداروں میں طلبا کے ساتھ اساتذہ کا سلوک معاشرتی توقعات کی بدلتی ہوئی سوچ کو واضح کرتا ہے۔ اس صورت حال کے بعد پیدا ہونے والے حالات کو افسانے میں اس طرح اجاگر کیا گیا ہے:

> "اللہ تیری پناہ، کیا زمانہ آ گیا، استاد شاگردوں کے ہاتھوں رسوا ہونے لگے۔۔۔ رضوی صاحب جیسے استاد کا تو کہنا ہی کیا۔۔۔ دنیا سے اٹھ گیا استاد، کتنا گندا ہے شازی گھُماٹا ۔۔۔ماں باپ کو دیکھو الٹا اور آگ لگانے پر تلے ہیں۔۔۔ بد تمیز بیٹے کو نہیں کہہ رہے کہ تیرا استاد ہے۔ معافی مانگ ان سے۔۔۔"(۸۹)

تعلیم کی ضرورت اور اہمیت کے پیش نظر حکومتی سطح پر اہم اقدامات کیے جاتے ہیں لیکن پھر بھی یہ مسائل حل نہیں ہو سکے۔ حکومتی پالیسیوں ، اساتذہ کے مسائل اور ان کی حالت زار کو " معذور طلبہ " افسانے میں اجاگر کیا گیا ہے۔ ہمارے تعلیمی اداروں کا ایک المیہ ہے کہ قوم کے معمار جو قومیں بناتے ہیں ان کی معاشرے میں اپنی حیثیت معدوم ہوتی جا رہی ہے اساتذہ کو ان کے مقام و مرتبے کے مطابق نوازنے کے بجائے سمجھا جاتا ہے کہ جیسے یہ معاشرے میں کوئی خاص کردار ادا نہیں کر رہے۔ اس صورت حال کو گل زیب عباسی نے اس طرح سے اجاگر کیا ہے:

> "محترم! حکومتی پالیسی اساتذہ نہیں بناتے، اور پالیسیاں بنانے والے بھی اساتذہ کا مقام و مرتبہ اور مسائل، وسائل ذہن میں نہیں رکھتے، ان کے نزدیک تو یہ لوگ مفت میں تنخواہ لیتے ہیں"۔ "حالانکہ دنیا کا مشکل ترین کام اور ذمے داری کا کام یہی پڑھانا، نئی نسل اور کسی آدمی کو شعور دینا صحت مند رجحانات کو فروغ دینا اور مثبت اقدار کا پختہ کرانا ہوتا ہے۔"(۹۰)

افسانے کے ذریعے اساتذہ اور حکومتی سطح پر پالیسیاں بنانے کے ذمہ داران کے خلاف مایوسی کی کیفیت کو اجاگر کیا گیا ہے۔ پالیسی سازوں کی اساتذہ کے مسائل سے لاتعلقی اور اساتذہ کو درپیش عملی مسائل پر روشنی ڈالی گئی ہے کہ پالیساں تشکیل دینے والے چونکہ عملی طور پر تعلیمی اداروں سے منسلک نہیں ہیں اس لیے وہ اساتذہ کے مسائل سے انجان ہیں۔ گل زیب عباسی نے افسانہ "بطخ" کے ذریعے اجاگر کیا ہے کہ پالیسیاں بنانے والے نہ صرف اساتذہ کو درپیش مسائل سے انجان ہیں بلکہ وہ طلبہ کی مشکلات سے بھی آگاہ نہیں ہیں۔ بطخ افسانہ یونیورسٹیوں کی بھاری فیسوں، ایچ ای سی کی پالیسیوں اور منسٹرز کے اثر رسوخ کا عکاس افسانہ ہے۔ کہانی میں یونیورسٹی کو ایم فل کے داخلے بند کرنے اور جاری کلاسز کو ختم کرنے کا حکم ملا تو طلبا جو دور دراز سے اتنا خرچہ کر کے آئے تھے، ہاسٹل کی فیسیں ادا کر رہے تھے، والدین کی ان سے وابستہ امیدیں، جب ان سب سے مایوسی کی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے تو وہ کام جو ایچ ای سی کو یونیورسٹی کا وائس چانسلر تک سمجھانے میں ناکام ہو جاتا ہے تو اچانک جب ایچ ای سی اپنا فیصلہ واپس لیتی ہے تو پتا چلتا ہے کہ منسٹر آف ایجوکیشن یہ فیصلہ واپس لینے پر اس لیے آمادہ ہو گئے کہ ان کی اپنی بیٹی نے انہیں بتایا کہ ان کے اس فیصلے سے اسے اور اس کے ساتھی سکالرز کن مسائل سے دوچار ہیں۔ اقتباس ملاحظہ ہو:

"سر میں نے ہی منسٹر آف ایجوکیشن کو میسیج کیا تھا کہ طلبا کو کس قدر پریشانی ہے۔ انہوں نے HEC کا نوٹیفکیشن واپس لے لیا ہے۔ ایم۔فل جاری رہے گا، یہ نوٹیفکیشن اپ لوڈ ہو گیا ہے۔ سر منسٹر آف ایجوکیشن عبدالمتین صاحب میرے ابو ہیں۔"(۹۱)

صحت مند اور روشن خیال معاشرے کی ترقی میں اساتذہ اہم کردار ادا کرتے ہیں۔ افسانوں کا سیاق وسیع تر سماجی تناظر میں اساتذہ کے کردار کی اہمیت کو اجاگر کرتا ہے۔ اساتذہ کا کام نئی نسل کو شعور عطا کرنا اور ان میں مثبت اقدار کو اجاگر کرنا ہے مگر ان سے بیک وقت تدریس کے علاوہ مختلف کام بھی لیے جا رہے ہیں۔ اس کی نشاندہی بھی افسانہ "معذور طلبہ" میں کی گئی ہے۔ جس سے اساتذہ بھی اپنے فرائض سے دور ہونے لگے ہیں۔ ان حالات کے پیش نظر سرکاری سکولوں میں اساتذہ کی کارکردگی بھی متاثر ہوئی ہے۔ گل زیب عباسی کا تخلیق کردہ افسانہ "بے غیرت" اسی سیاق و سباق میں تحریر کیا گیا ہے۔ ایک زمانہ تھا جب اساتذہ محنت سے پڑھاتے تھے مگر اب ٹیچر آشر جیسے اساتذہ بھی ہیں جو سکول میں بچوں کے مستقبل کو سنوارنے کے بجائے اس دوران اپنا بزنس سنبھالتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ تعلیمی اداروں میں اساتذہ آئیں اور نہ پڑھائیں یا پھر غیر حاضر رہ کر اپنے اثر رسوخ کا استعمال کریں تو تعلیمی ادارے بدحالی کی جانب گامزن ہو جاتے ہیں سرکاری سکولوں کی بدحالی کا اندازہ افسانے کے اس منتخب حصے سے لگایا جا سکتا ہے:

"سچ ہے کہ میرا بر خوردار آشر سکول نہیں آتا، سکول کے بچوں کا حق مارا جاتا ہے۔ اگر نہیں آتا تو چھوڑ دے سکول استعفیٰ دے دے۔ کوئی اور ذمے دار استاد آ جائے گا۔ یقیناً میری ہمدردی گاؤں والوں کے ساتھ تھی۔ کسی قوم کی اجتماعی زیاں نظر نہ آئے تو وہ جلد بکھر جاتی ہے۔ یہی گاؤں والوں نے کیا۔ یہ لوگ جو چارپائیوں پر بیٹھے ہیں۔ اب وہ نہیں رہے جو پہلے تھے۔ اب بھلا اکیلا تنکا کیا بھاڑ جھونکے گا۔ یہ بڑی بڑی پگوں والے سب بے غیرت ہو گئے ہیں۔ آشر کو تحفظ دینے آئے ہیں۔ آپ لوگ میری درخواست پھاڑ دیں۔ جہاں سارے لوگ بے غیرت ہو گئے ہیں تو چودھری عظمت بھی بے غیرت ہو گیا ہے"(۹۲)

سرکاری سکولوں کے ایسے حالات، اساتذہ کی عدم دستیابی، غیر حاضری اور احتساب نہ ہونے کی وجہ سے روز بروز خراب ہونے لگی۔ ان حالات کے پیش نظر نجی تعلیمی اداروں میں بچوں کو تعلیم دلوانا اب عوام میں ایک مشترکہ معاشرتی قدر کی حیثیت اختیار کر گیا ہے۔ پبلک پرائیویٹ پارٹنرشپ سے تعلیمی شعبے میں وسائل،

جدت اور کارکردگی میں اضافہ ہوا ہے۔ لیکن اب سرکاری اداروں کے مقابلے نجی تعلیمی اداروں میں صورت حال تجارت بن گئی ہے۔ نجی تعلیمی اداروں کی کارکردگی، عوام کا ان اداروں کو اہمیت دینا، ان میں تعلیمی سرگرمیاں، رزلٹ، اساتذہ کا رکھ رکھاؤ، گل زیب عباسی کے افسانے "پری ہاؤس" میں بیان کیا گیا ہے۔ کیسے نجی تعلیمی ادارے پیسے کمانے کا ایک بہترین ذریعہ بن گئے ہیں اس حوالے سے افسانے کا اقتباس ملاحظہ ہو۔

> "جانے لوگ دوسرے ممالک میں کیوں بھاگے جاتے ہیں، ۔۔۔ یہاں بھی اربوں کمائے جاسکتے ہیں، اب میرا پراجیکٹ ہی دیکھ لو سارا شہر جھکتا ہے، پاؤں پڑتے ہیں لوگ ایڈمشن کے لیے اور پھر منہ مانگی رقم بھی دینے کے لیے ہمہ وقت تیار، یہ تو ہم لوگ داخلہ روک دیتے ہیں، ورنہ دوسرے سکول ہی خالی ہو جائیں۔"(۹۳)

پاکستان میں پرائیویٹ تعلیمی اداروں کی بڑھتی ہوئی اہمیت کے پیش نظر افسانے میں ان کے کھوکھلے پن کو اجاگر کرتے ہوئے کہانی میں افسانہ نگار نے آصف کا کردار تشکیل دیا ہے جو کئی سال کویت میں ملازم کرتا رہا تھا اور پھر واپس پاکستان آگیا یہاں وہ اپنے دوست اعظم صاحب سے ملتا ہے جس نے نویں جماعت میں ہی پڑھائی ترک کر دی تھی لیکن اب ایک پرائیویٹ سکول کا پرنسپل ہے۔ پرائیویٹ اداروں کے کھوکھلے پن کو اجاگر کرتے ہوئے گل زیب عباسی لکھتے ہیں:

> "وہ ملکوں ملکوں گھوما تھا، ہر جگہ یہی دیکھا کہ لوگ بچوں کو سکول داخل کراتے ہوئے انتہائی سوچ بچار سے کام لیتے لیکن پاکستان میں معاملہ برعکس تھا، لوگ پرائیویٹ تعلیمی اداروں کی ظاہری لش پش سے مرعوب ہوتے ہیں حالانکہ یہ ظاہر کچھ باطن کچھ کے مصادق ہیں، لوگ بچوں کو فخر سے صبح صبح تیار کر کے سکول چھوڑنے جاتے ہیں، بھاری فیسیں دیتے ہیں، لیکن بچوں کو جہالت کے ہاتھوں کھلونے بنانے پر تلے ہیں انہیں تو بچہ ایک شو پیس نظر آنا چاہیے، چاہے اخلاقی اقدار کا جنازہ ہی کیوں نہ نکل جائے۔"(۹۴)

مادی اور سطحی چیزوں کی طرف عوام کا رجحان بڑھ گیا ہے خاص طور پر تعلیمی حوالے سے معاشرے میں ایک بڑا تغیر دیکھا جائے تو نجی تعلیمی اداروں کی بڑھتی ہوئی اہمیت کے پیش نظر آیا ہے۔ گو کہ تعلیم میں ٹیکنالوجی کے انضمام نے تدریس اور سیکھنے کے طریقہ کار میں انقلاب برپا کر دیا ہے۔ "دھم م م م م م.....ری سٹارٹ" افسانہ تعلیمی میدان میں پیدا ہونے والی تبدیلیوں کے طور پر نمائندہ افسانہ ہے۔ جو طلبا کی ذہنی نشو نما کرنے میں اس طرح سے معاون ہے کہ بچے آغاز سے ہی سوچنے، سمجھنے اور تخلیق کرنے کی صلاحیتوں سے باور

ہو کر اس کا عملی زندگی میں اطلاق کرنے کے قابل ہو سکتے ہیں۔ تعلیم کے میدان میں ای لیرننگ کی اہمیت کے پیش نظر افسانے سے اقتباس ملاحظہ ہو:

> "بہت ضروری ہے کہ آس پاس ہوتے روزمرہ کے واقعات کے تذکرے سے گریز کیا جائے۔ مافوق الفطرت باتوں سے جانکاری دھیان کو آلودہ کرتی ہے۔ تجویز کیا جاتا ہے کہ ڈبلیو ڈبلیو ڈبلیو ڈاٹ ہُکڈ آن فونیکس ڈاٹ کام پر جا کر سوچے سمجھے بغیر لفظوں کو پہچاننے کی صلاحیتیں بڑھانے کی ایوارڈ یافتہ مشقیں ڈاؤن لوڈ کی جائیں تو بہتری کا امکان ہے۔"(۹۵)

آن لائن لرننگ پلیٹ فارم سے لے کر کمرا جماعت میں ٹیکنالوجی تعلیم کا ایک لازمی حصہ بن چکی ہے۔ حکومتی سطح پر ٹیکنالوجی کی اہمیت کو تسلیم کرتے ہوئے تعلیمی اداروں کو ڈیجیٹل وسائل فراہم کرنے، انٹرنیٹ کنیکٹیویٹی اور ای لرننگ کے اقدامات کو فروغ دینے کی کوششیں جاری ہیں۔ مختلف شعبوں میں تبدیلی کی رفتار کے مطابق تعلیمی اداروں میں نصاب کو اپ ڈیٹ کرنے اور جدید تقاضوں کے مطابق ڈھالنے کی ضرورت ہے۔ انہیں اس بات کو یقینی بنانے کی ضرورت ہے کہ دی جانے والی مہارتیں اور علم موجودہ جاب مارکیٹ اور معاشرے کے تقاضوں سے مطابقت رکھتا ہے۔ روایتی تدریسی طریقوں کو تبدیل کیا جا رہا ہے۔ نہ صرف موضوع سے متعلق علم بلکہ ضروری مہارتوں جیسے کہ تنقیدی سوچ، تخلیقی صلاحیتوں پر بھی زور دیا جا رہا ہے جو تیزی سے بدلتی ہوئی دنیا میں اہم ہیں۔ تعلیمی اداروں کو ۲۱ویں صدی کے چیلنجوں اور مواقع کے لیے طلبہ کو بہترین طریقے سے تیار کرنے کے لیے تیزی سے بدلتی ہوئی دنیا کے ساتھ ہم آہنگی کے لیے ڈھالنا اور تیار کرنا چاہیے۔

بحیثیت مجموعی تعلیمی حوالے سے اکیسویں صدی کے افسانوں کے تناظر میں مطالعہ کے بعد کہا جا سکتا ہے کہ اس حوالے سے جن معاشرتی قدروں میں تغیر آیا ہے ان میں مخلوط تعلیمی نظام کی اہمیت، خواتین کی تعلیم کی طرف رجحان اور سرکاری سکولوں کے مقابلے نجی تعلیمی اداروں کی طرف رجحان بڑھ گیا ہے۔

اس باب میں پیش کیا گیا مطالعہ اکیسویں صدی کے افسانے کی روشنی میں، معاشرتی اقدار اور اداروں کے باہمی تعلق، معاشرتی ترقی کی پیچیدگی اور روانی کی نوعیت کو واضح کرتے ہوئے معاشرے کی ابھرتی ہوئی تصویر، تبدیلی کی نوعیت اور جاری بیانیے کو نشان زد کرتا ہے۔ معاشرتی ادارے جو کسی بھی معاشرے کی ترقی اور تنزلی میں مرکزی کردار ادا کرتے ہیں۔ اردو ادب کے منتخب کردہ پاکستانی معروف فکشن نگاروں نے

پُر جوش کہانی کے ذریعے، اداروں کے کردار کی عکاسی کرتے ہوئے ان کے پس منظر میں بدلتی ہوئی اقدار اور معاشرے میں پیدا ہونے والے تنازعات کی عکاسی کی ہے چاہے یہ جدیدیت کے تناظر میں تبدیل ہونے والے خاندانی ڈھانچے کی تصویر کشی ہو یا روایتی اقدار اور عصری نظریات کے درمیان تناؤ، اردو افسانہ ان اداروں اور سماجی اقدار کی تبدیلی کے درمیان تعامل کو عیاں کرتے ہوئے بصیرت انگیز جھلک پیش کرتا ہے۔

حوالہ جات

۱۔ جمیل جالبی، قومی انگریزی اردو لغت، ص ۲۲۷

۲۔ محمد حمید شاہد، ہر حقیقت کی یہ خواہش ہے کہ افسانہ بنے، (پہلی بات) مشمولہ: سانس لینے میں درد ہوتا ہے، بک کارنر، جہلم، پاکستان، ۲۰۱۹ء، ص ۱۲

۳۔ زبیر شاہ، سید، قربانی جو رائیگاں گئی (افسانہ) مشمولہ: یخ بستہ دہلیز، اعراف پرنٹرز محلّہ جنگی، پشاور، ۲۰۱۷ء، ص ۶۵

۴۔ حسن منظر، بھوبل کا چہکا (افسانہ) مشمولہ: جھجک، شہر زاد، کراچی، ۲۰۱۸ء، ص ۱۴۴

۵۔ رشید امجد، تصویریں اور دیواریں (افسانہ) مشمولہ: دکھ ایک چڑیا ہے، نیشنل بک فاؤنڈیشن، اسلام آباد، ۲۰۱۶ء، ص ۹۰

۶۔ رشید امجد، پرندہ اداس ہے (افسانہ) مشمولہ: دکھ ایک چڑیا ہے، ص ۱۸۷

۷۔ رشید امجد، گمان کے رشتے (افسانہ) مشمولہ: دکھ ایک چڑیا ہے، ص ۱۴۵

۸۔ رشید امجد، آواز اور عکس کے درمیان (افسانہ) مشمولہ: دکھ ایک چڑیا ہے، ص ۹۷

۹۔ سلیم آغا قزلباش، انتظار (افسانہ) مشمولہ: اعلانوں بھرا شہر، الحمد پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۱۹ء، ص ۱۴۶

۱۰۔ ایضاً، ص ۱۴۶

۱۱۔ زبیر شاہ، سید، پہلی قسط (افسانہ) مشمولہ: یخ بستہ دہلیز، ص ۳۱

۱۲۔ شفیق انجم، ڈاکٹر، بوسیدہ دیواروں پر کھدے بیَن، (افسانہ) مشمولہ: میں + میں، اسلوب، اسلام آباد، ۲۰۰۸ء، ص ۴۹

۱۳۔ محمد حمید شاہد، خونی لام ہوا قتلام بچوں کا، (افسانہ) مشمولہ: سانس لینے میں درد ہوتا ہے، ص ۵۷

۱۴۔ گل زیب عباسی، باپ (افسانہ) مشمولہ: نوکیلے پھول، مکتبہ فجر، لاہور، ۲۰۱۹ء، ص ۱۷۷

۱۵۔ ایضاً، ص ۱۸۱

۱۶۔ منشایاد، الہام (افسانہ) مشمولہ: خواب سرائے، دوست پبلی کیشنز، اسلام آباد، ۲۰۰۵ء، ص ۱۰۴

۱۷۔ گل زیب عباسی، ایسے کو تیسا (افسانہ) مشمولہ: زہریلے پھول، رنگ ادب، کراچی، ۲۰۱۳ء، ص ۱۷

۱۸۔ ایضاً، ص ۷۲

۱۹۔ ایضاً، ص ۷۹

۲۰۔ ایضاً، ص ۸۲

۲۱۔ حسن منظر، شبِ حراس (افسانہ) مشمولہ: جھجک، ص ۲۴۸

۲۲۔ رشید امجد، سبز ۂ زہر اب (افسانہ) مشمولہ: دکھ ایک چڑیا ہے، ص ۴۹
۲۳۔ زبیر شاہ، سید، ہنس کی چال (افسانہ) مشمولہ: خوف کے کتبے، مثال پبلشرز، فیصل آباد، ۲۰۱۱ء، ص ۶۰
۲۴۔ طارق ہاشمی، خوف کے کتبے اور پتھرائی ہوئی آنکھیں، (ابتدائیہ) خوف کے کتبے، از سید زبیر شاہ، ص ۶۰
۲۵۔ آصف فرخی، Mac ArabiaTM Meal، (افسانہ) مشمولہ: میرے دن گزر رہے ہیں، شہزاد پبلشرز، کراچی، ۲۰۰۹ء، ص ۱۵۱
۲۶۔ ایضاً، ص ۱۵۲
۲۷۔ ایضاً، ص ۱۵۶
۲۸۔ مبارک علی، ڈاکٹر، پاکستانی معاشرہ، تاریخ پبلی کیشنز، ۲۰۱۲ء، ص ۷۰
۲۹۔ محمد حمید شاہد، ایک مسلسل زرگزشت، (افسانہ) مشمولہ: سانس لینے میں درد ہوتا ہے، ص ۱۱۰
۳۰۔ طاہرہ اقبال، انتخاب (افسانہ) مشمولہ: ریخت، دوست پبلی کیشنز، اسلام آباد، ۲۰۱۰ء، ص ۹۹
۳۱۔ مبین مرزا، خوف کے آسمان تلے، اکادمی بازیافت، کراچی، ۲۰۰۴ء، ص ۶۵
۳۲۔ محمد حامد سراج، موت کھلیان (افسانہ) مشمولہ: بخیہ گری، الفتح پبلی کیشنز، راولپنڈی، ۲۰۱۳ء، ص ۶۹
۳۳۔ زبیر شاہ، سید، یخ بستہ دہلیز، ص ۱۲۹
۳۴۔ مسعود مفتی، کل اور آج، (افسانہ) مشمولہ: وقت کی قاش، دوست پبلی کیشنز، اسلام آباد، ۲۰۱۵ء، ص ۹
۳۵۔ مسعود مفتی، آسیب، (افسانہ) مشمولہ: وقت کی قاش، ص ۴۴
۳۶۔ مسعود مفتی، سرگوشی، (افسانہ) مشمولہ: وقت کی قاش، ص ۳۴
۳۷۔ شفیق انجم، ڈاکٹر، زندگی سیہ پوش (افسانہ) مشمولہ: لکھت لکھتی رہی، الفتح پبلی کیشنز، راولپنڈی، ۲۰۱۱ء، ص ۷۸
۳۸۔ ایضاً، ص ۷۹
۳۹۔ شفیق انجم، ڈاکٹر، شور میں گم ماتم، (افسانہ) مشمولہ: روشنی آواز دیتی ہے، الفتح پبلی کیشنز، راولپنڈی، ۲۰۱۹ء، ص ۹۳
۴۰۔ حمیرا اشفاق، ڈاکٹر، ادھورا مقدمہ (افسانہ) مشمولہ: کتبوں کے درمیان، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۱۹ء، ص ۱۰۵
۴۱۔ Emile durkheim,The Elementary forms of religious life, translated by Karen E. Fields, The free press, New York,1995, P. 44

۴۲۔ عبدالرحمن بن خلدون، رئیس المورخین، علامہ، مقدمہ ابن خلدون، مترجم، علامہ راغب رحمانی دہلوی، نفیس اکیڈمی، کراچی، ۲۰۰۱، ص ۶۹

۴۳۔ جمیل جالبی، ڈاکٹر، پاکستانی کلچر، مشتاق بک ڈپو، کراچی، ۱۹۶۴ء، ص ۱۴۵

۴۴۔ رشید امجد، ہنوز خواب میں (افسانہ) مشمولہ: دکھ ایک چڑیا ہے، ص ۸۲

۴۵۔ منشایاد، ٹھہرا ہوا پانی (افسانہ) مشمولہ: ایک کنکر ٹھہرے پانی میں، دوست پبلی کیشنز، اسلام آباد، ۲۰۱۰ء، ص ۱۶۶

۴۶۔ شفیق انجم، ڈاکٹر، اُکڑوں بیٹھا وقت، (افسانہ) مشمولہ: میں + میں، ص ۱۱۵

۴۷۔ ناصر عباس نیر، ڈاکٹر، کہانی کا کوہِ ندا، (افسانہ) مشمولہ: خاک کی مہک، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۱۶ء، ص ۱۰

۴۸۔ ناصر عباس نیر، ڈاکٹر، کفّارہ، (افسانہ) مشمولہ: خاک کی مہک، ص ۴۴

۴۹۔ اسد محمد خان، عون محمد وکیل، بے بے اور کاکا (افسانہ) مشمولہ: تیسرے پہر کی کہانیاں، القا پبلی کشنز، لاہور، ۲۰۱۵ء، ص ۷۶

۵۰۔ حسن منظر، یاں تو کوئی سنتا نہیں فریاد کسو کی (افسانہ) مشمولہ: جھجک، ص ۱۰۱

۵۱۔ محمد حمید شاہد، خونی لام ہوا قتلام بچوں کا، (افسانہ) مشمولہ: سانس لینے میں درد ہوتا ہے، ص ۸۰

۵۲۔ ایضاً، ص ۸۱

۵۳۔ علی اکبر ناطق، مولوی کی کرامت، قائم دین، سانجھ پبلشرز، لاہور، ۲۰۱۸ء، ص ۶۴

۵۴۔ ایضاً، ص ۶۵

۵۵۔ ایضاً، ص ۶۸

۵۶۔ علی اکبر ناطق، حاجی ابراہیم (افسانہ) مشمولہ: شاہ محمد کا ٹانگہ، سانجھ پبلشرز، لاہور، ۲۰۱۷ء، ص ۱۵۱

۵۷۔ مسعود مفتی، پانچواں گروہ، (افسانہ) مشمولہ: وقت کی قاش، ص ۱۳۷

۵۸۔ زبیر شاہ، سید، محبت خطِ تنسیخ کی زد میں (افسانہ) مشمولہ: یخ بستہ دہلیز، ص ۱۲۲

۵۹۔ منشایاد، سائیکلوسٹائل وصیت نامہ (افسانہ) مشمولہ: ایک کنکر ٹھہرے پانی میں، ص ۶۶

۶۰۔ گل زیب عباسی، دہشت گرد (افسانہ) مشمولہ: آخری پھول، مکتبہ فجر، لاہور، ۲۰۱۶ء، ص ۹۹

۶۱۔ ایضاً، ص ۱۰۰

۶۲۔ ایضاً، ص ۱۰۳

۶۳۔ زاہدہ حنا، رقصِ مقابر (افسانہ) مشمولہ: رقصِ بسمل ہے، الحمد پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۱۷ء، ص ۸۶

۶۴۔ ایضاً، ص ۸۸

۶۵۔ خالد فتح محمد، دھنک (افسانہ) مشمولہ: میں، ص ۳۰

۶۶۔ زاہدہ حنا، منزل ہے کہاں تیری۔۔۔ (افسانہ) مشمولہ: رقصِ بسمل ہے، ص ۶۵

۶۷۔ منشایاد، خواب راستہ (افسانہ) مشمولہ: خواب سرائے، ص ۲۱

۶۸۔ آصف فرخی، برف، (افسانہ) مشمولہ: میرے دن گزر رہے ہیں، شہزاد پبلشرز، کراچی، ۲۰۰۹ء، ص ۱۳۸

۶۹۔ آصف فرخی، کھجور کا درخت، (افسانہ) مشمولہ: میرے دن گزر رہے ہیں، ص ۶۸

۷۰۔ ایضاً، ص ۷۰

۷۱۔ آصف فرخی، ویلنٹائن، (افسانہ) مشمولہ: میرے دن گزر رہے ہیں، ص ۱۴۵

۷۲۔ گل زیب عباسی، نالائق (افسانہ) مشمولہ: زہریلے پھول، ص ۴۶

۷۳۔ آصف فرخی، مسہری، (افسانہ) مشمولہ: میرے دن گزر رہے ہیں، ص ۹۸

۷۴۔ شاہد صدیقی، پاکستان، تعلیم اور اکیسویں صدی: جدید تعلیمی رجحانات اور امکانات، بک کارنر، جہلم، ۲۰۲۲، ص ۱۰۷

۷۵۔ محمد حمید شاہد، کوئٹہ میں کچلاک (افسانہ) مشمولہ: سانس لینے میں درد ہوتا ہے، ص ۱۷

۷۶۔ نیلوفر اقبال، مساوات (افسانہ) مشمولہ: سرخ دھبّے، دوست پبلی کیشنز، اسلام آباد، ۲۰۱۲ء، ص ۱۷

۷۷۔ حمیرا اشفاق، ڈاکٹر، روشنی کا سفر (افسانہ) مشمولہ: کتبوں کے درمیان، ص ۴۵

۷۸۔ ایضاً، ص ۴۷

۷۹۔ علی اکبر ناطق اچھوبازی گر (افسانہ) مشمولہ: قائم دین، سانجھ پبلشرز، لاہور، ۲۰۱۸ء، ص ۱۲

۸۰۔ رشید امجد، ایک پرانی کہانی جسے دوبارہ لکھا گیا (افسانہ) مشمولہ: دکھ ایک چڑیا ہے، ص ۸۳

۸۱۔ گل زیب عباسی، ننھا شجیل (افسانہ) مشمولہ: آخری پھول، ص ۱۱۵

۸۲۔ ایضاً، ص ۱۱۶

۸۳۔ اسد محمد خان، ٹکڑوں میں کہی گئی کہانی، القا پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۱۵ء، ص ۳۲

۸۴۔ طاہرہ اقبال، کوشش سی (افسانہ) مشمولہ: زمیں رنگ، دوست پبلی کیشنز، اسلام آباد، ۲۰۱۴، ص ۹۸

۸۵۔ طاہرہ اقبال، شپلا کے پھول (افسانہ) مشمولہ: زمیں رنگ، ص ۱۱۸

۸۶۔ گل زیب عباسی، بڑا بھائی (افسانہ) مشمولہ: آخری پھول، ص ۲۳۸

۸۷۔ محمد حامد سراج، نصف مکمل (افسانہ) مشمولہ: بخیہ گری، ص ۷۷

۸۸۔ گل زیب عباسی، گھُماٹا (افسانہ) مشمولہ، ہلکان، مکتبہ فجر، لاہور، ۲۰۲۰ء، ص ۱۲۶

۸۹۔ ایضاً، ص ۱۲۷

۹۰۔ گل زیب عباسی، معذور طلبہ (افسانہ) مشمولہ: آخری پھول، ص ۱۳۴

۹۱۔ گل زیب عباسی، بطخ (افسانہ) مشمولہ: نوکیلے پھول، ص ۲۹۷

۹۲۔ گل زیب عباسی، بے غیرت (افسانہ) مشمولہ: نوکیلے پھول، ص ۲۵۱

۹۳۔ گل زیب عباسی، پری ہاؤس (افسانہ) مشمولہ: رسیلے پھول، مکتبہ فجر، لاہور، ۲۰۱۸ء، ص ۹۷

۹۴۔ ایضاً، ص ۹۸

۹۵۔ عرفان احمد عرفی، دھم م م م م..... ری سٹارٹ (افسانہ) مشمولہ: کنٹرول روم، سانجھ پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۱۷ء، ص ۵۳

باب سوم:

اکیسویں صدی کے افسانے میں تغیر پذیر معاشرتی اقدار کے پس پردہ عوامل

پاکستانی معاشرہ کثیر نسلی، کثیر ثقافتی اور کثیر لسانی معاشرہ ہے اور آج ہم جس عبوری دور میں سانس لے رہے ہیں یہ بے پناہ تبدیلیوں کا دور ہے۔ اس میں کسی چیز کو استحکام نہیں۔ اسی طرح اقدار اور رویے جامد نہیں ہوتے ان پر وقت کے ساتھ ساتھ بہت سے اندرونی اور بیرونی عوامل کے اثرات پائے جاتے ہیں۔ ماضی میں جو تبدیلیاں صدیوں بعد آتی تھیں اب وہ تیزی سے آنے لگی ہیں۔ تیز رفتار تبدیلی کے اثرات معاشرے کے ہر شعبے پر پڑے۔ باب دوم میں معاشرتی اداروں میں آنے والی تبدیلیوں، اداروں کی صورت حال اور اقدار کی تغیر پذیری کا مطالعہ پیش کیا گیا ہے۔ ان اداروں میں آنے والی تبدیلیوں کے پس پردہ محرکات کا جائزہ باب سوم کی تخصیص کے تحت کیا جارہا ہے۔ معاشرتی سطح پر اقدار کی تغیر پذیری کا جائزہ لیا جائے تو ہمیں اس کے پس پردہ محرکات یعنی ان معاشرتی عوامل پر توجہ مرکوز کرنی ہوتی ہے جن کی بدولت معاشرے میں تغیر برپا ہوا۔ پرانے رویے نئی اقدار سے متصادم ہونے کی مختلف وجوہات ہو سکتی ہیں جن میں سائنسی علوم و ایجادات، ٹیکنالوجی کی ترقی، عالمگیریت، مختلف حادثات و وقوعات، معاشی انقلاب، ثقافت پذیری اور نئے نظریات وغیرہ کا پرچار نمایاں ہے۔ ڈرخائم کے مطابق تغیر پذیر معاشرتی اقدار کا تعین انفرادی انتخاب یا ترجیح نہیں ہوتی بلکہ یہ وسیع تر معاشرتی قوتوں کا نتیجہ ہوتی ہیں۔ ڈرخائم اپنی کتاب The Rules of Sociological Methods میں معاشرتی حقائق کے مطالعے کے لیے ان عوامل اور عناصر کے مطالعے پر بھی زور دیتے ہیں جن پر انحصار کرتے ہوئے معاشرے تغیریات قبول کرتے ہیں:

> "...What are the factors on which its principal characteristics depend, the intellectual elements to which it gives rise."(۱)

پاکستان میں اکیسویں صدی پر ایک نظر ڈالیں تو اس صدی میں معاشرتی اقدار میں تیزی سے تبدیلیاں رونما ہوئی ہیں۔ یہ تبدیلیاں ایک دوسرے سے منسلک کئی ایک عوامل سے متاثر ہوئی ہیں۔ عالمی منظر نامے نے بھی ہماری سیاست، مذہبی وابستگی اور ہماری سوچ کا رخ موڑ دیا جس نے نظریات، طرز زندگی، رہن سہن کے ڈھنگ و اطوار تصورات و خیالات حتیٰ کہ انسانی رویوں تک کو تبدیل کر دیا۔ اسی طرح معاشرے کے مادی وسائل تبدیل ہونے سے بھی افراد کی ضروریات اور ان سے وابستگی کا نظریہ تبدیل ہو گیا۔ ان سب

محرکات نے ہمارے معاشرے اور تہذیب کو بہت متاثر کیا ہے۔ اکیسویں صدی کے افسانوں میں تغیر پذیر معاشرتی قدروں کے پس پردہ عوامل کا جائزہ لیا جائے تو ٹیکنالوجی کی وسیع پیمانے پر تیز رفتار ترقی خاص طور انٹرنیٹ اور سوشل میڈیا نے تغیر پذیر معاشرتی اقدار کی تشکیل میں اہم کردار ادا کیا ہے۔ عالمگیریت نے مختلف معاشروں اور ثقافتوں کے درمیان تامل کو فروغ دیا جس کی وجہ سے معاشرتی اقدار میں بھی تغیر پیدا ہوا۔ ٹیکنالوجی کی ترقی اور انٹرنیٹ کی بدولت ہی دنیا عالمی گاؤں کی شکل اختیار کر چکی ہے جس نے انسانی ضروریات و خواہشات پر گہرے اثرات مرتب کیے۔ بدلتے ہوئے معاشی حالات خاص طور پر ملازمت کا حصول، صنعتی انقلاب، عالمگیریت اور دیگر عالمی اثرات نے فرد کے معاشی حالات کو بھی متاثر کیا جس کا نتیجہ خاندان میں ہونے والی تبدیلیوں کے طور پر بھی دیکھا جا سکتا ہے۔ ملازمت اور تعلیم کے حصول کے لیے لوگوں نے دیہاتوں سے شہروں کا رخ کیا۔ عوام کا دیہی علاقوں سے شہروں کی طرف سفر اور دیہاتوں سے شہروں میں منتقلی نے بھی معاشرتی قدروں میں تغیر پیدا کیا شہروں میں عوام کی بدلتی ہوئی ترجیحات سے واضح طور پر معاشرتی قدروں میں تبدیلی رونما ہوئی۔ یوں نقل مکانی کی یہ صورت حال معاشرے میں نت نئی تبدیلیوں کا موجب بنی جس نے افراد کو اس کی روایات کو ترک کر کے نئے ماحول کو اپنانے میں مدد کی۔ اکیسویں صدی میں مختلف تحریکوں نے زور پکڑا ان تحریکوں میں مساوات، انصاف، انسانی حقوق، خواتین کی بااختیار سازی کی تحریکیں، LGBTQ کے حقوق وغیرہ کے متعلق چلائی جانے والی تحریکیں بھی اقدار کی تغیر پذیری کا موجب بنی۔ تعلیم یافتہ طبقہ اور مذہبی امور سے متعلق نئی تشریحات وغیرہ بھی معاشرتی قدروں میں تغیر کے پس پردہ عوامل میں سے اہم ہیں۔ البتہ ان عوامل کے اثرات مختلف ثقافتوں اور لوگوں کے درمیان مختلف ہو سکتے ہیں۔ پاکستانی معاشرے میں تبدیلی اور قدروں میں تغیر کے پس پردہ مختلف محرکات میں جہاں درج بالا عوامل نے اہم کردار ادا کیا وہیں پاکستان میں بڑھتی ہوئی دہشت گردی کے واقعات اور دیگر اندونی و بیرونی حادثات و وقوعات نے معاشرتی قدروں کو متاثر کیا ہے۔ اردو فکشن عصر حاضر میں معاشرتی سطح پر رونما ہونے والی ارتقائی اور لمحہ بہ لمحہ بدلتی زندگی کو ظاہر کرتا ہے۔ معاشرہ مسلسل بہاؤ کی حالت میں ہے، نئے خیالات، ٹیکنالوجی اور معاشرتی اصول ابھر رہے ہیں اور تیزی سے ترقی کر رہے ہیں۔ مشینی زندگی کے ذریعے برپا ہونے والے معاشرتی انقلاب نے نہ صرف ہمارے طرز زندگی کو تبدیل کیا ہے بلکہ معاشرتی و ثقافتی اقدار، عقائد اور تخلیق کار کے تخلیقی اظہار کو بھی نمایاں طور پر متاثر کیا ہے۔ اکیسویں صدی کا افسانہ ان عوامل کا عکاس اور مبصر ہے۔ ذیل میں ان عوامل کا جائزہ اکیسویں صدی کے افسانوں کے تناظر میں پیش کیا جا رہا ہے۔

الف۔ ٹیکنالوجی کی ترقی اور عصر حاضر میں بدلتی ہوئی اقدار

بیسویں صدی کی آخری دہائیوں میں ہونے والی ٹیکنالوجی کی ترقی اکیسویں صدی میں تیزی سے بدلتی نت نئی تبدیلیوں کے ساتھ رونما ہوئی ہے۔ زندگی کے ہر شعبے میں گراں قدر ترقی کے اثرات دنیا بھر میں نمایاں ہیں جس نے انسان کو حیرت زدہ کر دیا ہے۔ اس نے عالمی سطح پر زندگی کے تقریباً ہر پہلو پر گہرے نقوش مرتب کیے۔ طرز زندگی، نظام حکمرانی، تجارت، کھیل کود، تعلیم غرض کہ کوئی بھی شعبہ ایسا نہیں جس پر ٹیکنالوجی کی ترقی کے اثرات مرتب نہ ہوئے ہوں۔ بڑی سطح پر لوگ ان سے فیض یاب ہو رہے ہیں۔ انیسویں صدی کی ایجادات سے مہینوں کے سفر گھنٹوں اور دنوں میں طے ہونے لگے۔ جنگی آلات، پیغام رسانی کے ذرائع وغیرہ میں بہتری اور آسانی آئی یہ ایسی ایجادات تھیں جس نے دنیا بھر کی تہذیب و معاشرت میں حیرت انگیز انقلاب پیدا کیے۔ اسی طرح صنعتی ترقی نے بھی معاشرتی حالات میں تبدیلی پیدا کی وہیں جدید کمپیوٹر ٹیکنالوجی، انٹرنیٹ، موبائل ٹیکنالوجی، روبوٹ وغیرہ ایسی ایجادات ہیں جس نے پوری دنیا کے نظام میں جنبش پیدا کر دی اور معاشرتی اقدار و روایات کو یکسر تبدیل کر دیا۔ اکیسویں صدی کو انٹرنیٹ اور سوشل میڈیا کی صدی کہا جائے تو بے جا نہ ہو گا۔ دورِ جدید کی یہ ایک ایسی ایجاد ہے جس کی بدولت دنیا گلوبل ولیج میں تبدیل ہو گئی۔ اگر یہ کہا جائے کہ مغربی ممالک کی ترقی کا دارومدار ٹیکنالوجی پر ہے تو بے جا نہ ہو گا۔ پاکستان میں بھی حالیہ برسوں میں ٹیکنالوجی کے میدان میں خاصی ترقی ہوئی۔ اس نے مختلف شعبہ ہائے زندگی کو ایسے اپنی گرفت میں لیا ہے کہ اب یہ معاشرتی زندگی کے ایک لازمی جزو کی حیثیت رکھتی ہے۔ گو کمپیوٹر کی ایجاد بیسویں صدی کے اوائل میں ہو چکی تھی لیکن تب لوگ اس سے نہ آشنا تھے مگر اکیسویں صدی میں ٹیکنالوجی کی ترقی نے اس کو اس قدر عام فہم بنا دیا کہ اب فرد کی روزمرہ زندگی اور مصروفیات اسی کے گرد گھومتی ہیں۔ گھر ہو یا دفتر، بزنس ہو یا تعلیمی سرگرمیاں انفارمیشن ٹیکنالوجی کے بغیر ہر سرگرمی نامکمل ہے۔ اگر ان ایجادات کو زندگی سے خارج کر دیا جائے تو نہ صرف معاشرتی تبدیلی اور ترقی کا عمل رک جائے گا بلکہ معاشرہ پسماندگی کی طرف گامزن ہو جائے گا۔ معاشرے پر انفارمیشن ٹیکنالوجی کے مثبت اور منفی دونوں طرح کے اثرات ملتے ہیں۔ اکیسویں صدی کے افسانوں میں انفارمیشن ٹیکنالوجی کے استعمال اور اس کے نتیجے میں معاشرتی اقدار کی تغیر پذیری کا مطالعہ اس زمرہ تحقیق کا خاصہ ہے۔

آج کے دور میں ابلاغ اور ترسیل کا سب سے زیادہ مؤثر ذریعہ موبائل فون یا سمارٹ فون انسانی زندگی کا اہم حصہ بن چکا ہے۔ یہ آسانی سے ہاتھ میں پکڑے جانے والے، چھوٹے سائز کے الیکٹرونک آلات ہیں جو

بہت سارے کاموں کو آسان بناتے ہیں۔ کوسوں دور بیٹھے شخص سے رابطہ کرنا اس کو روبرو دیکھنا یہ سب سمارٹ فون کی آمد سے ممکن ہو گیا ہے۔ موبائل پر ایسی ایسی ایپس متعارف ہو گئی ہیں جن کے بغیر نوجوانوں کو زندگی کا تصور دشوار لگنے لگا ہے۔

سلیم آغا قزلباش کے افسانے "آخر آخر میں!" اکیسویں صدی میں موبائل کی آمد اور اس کے استعمال کو موبائل کی آپ بیتی کے انداز میں تحریر کرتے ہوئے اس کے مثبت اور منفی استعمال، معاشرتی تغیرات، معاشرتی برائیوں اور اداروں پر اس کے اثرات کو اجاگر کیا گیا ہے۔ یہ افسانہ اس حوالے سے قابل قدر بصیرت فراہم کرتا ہے کہ کس طرح موبائل ٹیکنالوجی کی آمد نے اکیسویں صدی میں معاشرے کے تانے بانے کو متاثر کیا اور اس کی تشکیل کی ہے۔ افسانے کی کہانی بیانیہ انداز میں آگے بڑھتی ہے جس میں موبائل فون اپنی آپ بیتی بیان کرتا ہے کہ کیسے اس کی پیدائش ہوئی اور کس طرح وہ مختلف لوگوں کے ہاتھ لگتا رہا ہے۔ شروع کے چھے ماہ طبقہ امرا کے درمیان رہنے پر پتا چلا کہ یہ طبقہ کالے دھن کو سفید میں منتقل کرنے اور محلاتی سازشوں میں گھرا رہتا تھا۔ اس کے بعد جب فون اس امیر زادے کے بیٹے کے پاس جاتا ہے تو پتا چلتا ہے اس کے نہ جانے کتنے معاشقے چل رہے ہیں اور وہ اپنے معاشقوں کے بارے اپنے دوستوں کو بھی ہنسی مذاق میں بتاتا ہے۔ یہ صورت حال نوجوان نسل پر ٹیکنالوجی کے اثرات کو نمایاں کرتی ہے۔ یہاں سے وہ فون ایک پروفیسر کے ہاتھ میں جاتا ہے جو اس تغیر پذیر صورت حال کو اجاگر کرنے میں معاون ہے کہ کیسے وہ اس پر تحقیقی کام سرانجام دیتے ہیں جو آج کے دور میں ایک اہم ضرورت بن چکی ہے۔

> "پروفیسر صاحب کے جاننے والے ان سے کسی نہ کسی علمی تحقیقی موضوع پر تبادلۂ خیالات کرتے رہتے؛ اس کے ساتھ ساتھ بہت سے طلبا بھی ان سے مختلف کتابوں اور مصنفوں کے بارے میں معلومات حاصل کرتے رہتے۔"(۲)

پروفیسر کے ہاتھ سے نکل کر فون ایک فیشن ایبل لڑکی کے پاس جاتا ہے۔ اس کے دھندے کا ذکر اور اس کا قتل ہونے کے بعد کی صورت حال، معاشرے کے مختلف مسائل، پولیس والوں کی رشوت خوری اور مکاری کو عیاں کرتی ہے۔ ساتھ ہی معاشرے کے نچلے طبقے کو درپیش مسائل اجاگر ہوتے ہیں۔ غرض یہ موبائل ایک کے بعد دوسرے اور دوسرے کے بعد تیسرے کے پاس جاتا ہے یوں یہ معاشرے کے ہر فرد کے ہاتھ چاہے وہ اعلیٰ افسر ہو، قانون دان ہو، مولوی ہو، غرض ہر طبقے اور پیشے کے لوگوں کی حقیقت اس کی آپ بیتی کے ذریعے اجاگر ہوتی ہے۔ اس کا بڑھتا ہوا استعمال اس بات کا عکاس ہے کہ کیسے یہ معاشرے کے لیے ناگزیر ہے۔

وہ فون جو کبھی صرف پیغام رسانی کا ذریعے ہوا کرتے تھے وہ تیزی سے افراد کی زندگی میں سرایت کر گئے ہیں کہ "ادھر کوئی نیا موبائل فون خریدو ادھر اس کا شمار پرانے ماڈل میں ہونے لگتا ہے۔"(۳) صرف شہروں میں ہی نہیں اس کے اثرات تیزی سے دیہی علاقوں تک بھی پہنچے۔ گاؤں کی بدوباش میں حد درجہ تبدیلی آگئی ہے۔ پرانی چیزیں معدوم ہو چکی ہیں۔ افسانوں میں ان بدلتے ہوئے معاشرتی افعال اور رویوں کی بھی عکاسی کی گئی ہے۔ ٹیکنالوجی کی ترقی کے بعد کی صورت حال خالد فتح محمد افسانہ "تارک مِیرک" میں دو نسلوں میں حائل ہو جانے والے فرق کا موازنہ پیش کرتے ہوئے کرتے ہیں۔ ان کے مطابق تیز رفتار سفر کاروں، جہازوں وغیرہ میں ہونے لگا اس کے مقابلے میں پرانے دور کے گھوڑوں کی افادیت کم ہو گئی۔ اسی طرح موبائل ٹیکنالوجی کے حوالے سے لکھتے ہیں:

> "جدید دور نے پیغام رسانی کی مشکلات کو ختم کر دیا ہے۔ پرانے وقتوں میں اپنی آمد کی اطلاع کرنے کے لیے مجھے ہرکارہ بھیجنا پڑتا تھا لیکن کل شام دو منٹ سے کم کی موبائل کال سے گاؤں میں میری آمد کی اطلاع ہو گئی۔"(۴)

پہلے دور دراز کے سفر دنوں، مہینوں اور سالوں میں ہوتے تھے جہاں سفری مشکلات ختم ہو چکی ہیں وہیں وہ ٹکٹ جو پہلے لینے جانا پڑتا تھا یا لمبی قطاروں میں لگ کر حاصل کیا جاتا تھا وہ بھی سمارٹ فون کی ایجاد کے بعد سے فون پر ہی لیا جا سکتا ہے۔ جیسے افسانہ "انا پرست" میں انصر اپنے دوست کی وفات پر فوری پہنچنے کے لیے فون پر ٹکٹ بک کرواتا ہے۔

> "کمپنی منیجر کی کال بند ہوتے ہی، انصر نے کمرے سے تمام کپڑے اور سامان لپیٹنا شروع کر دیا۔ موبائل پر ایمرجنسی میں ہوائی جہاز کا ٹکٹ لے لیا۔"(۵)

موبائل فون کی آمد کے بعد اس کی ضرورت درج ذیل بنیادی ضروریات کے پیش نظر اس قدر بڑھ گئی ہے کہ اس کے بغیر زندگی کا تصور بھی مشکل محسوس ہونے لگا ہے۔ موبائل فون کی اہمیت اور انسان کی زندگی میں اس کا سب سے بڑا کردار یہ ہے کہ آپ کسی بھی وقت کسی بھی خطے میں موجود دوسرے انسان سے رابطہ کر سکتے ہیں۔ اس کی ضرورت اور اہمیت کے پیش نظر دوسری بڑی وجہ یہ ہے کہ اس کی مدد سے آپ کسی بھی طرح کی معلومات حاصل کر سکتے ہیں۔ مختلف ایپس ویب سائٹس اور سوشل میڈیا کے ذریعہ، آپ کسی بھی موضوع کے بارے میں معلومات نہ صرف حاصل کر سکتے ہیں بلکہ پھیلا بھی سکتے ہیں اور اب یہاں پر آن لائن کمانے کے بھی بے شمار طریقے متعارف ہو چکے ہیں۔ کاروباری طبقہ سوشل میڈیا کے ذریعے اپنی اشیا گھر بیٹھے کسٹمرز کو فراہم کر

سکتا ہے۔ خطرناک صورتحال میں موبائل فون کے ذریعے پولیس، ایمرجنسی سروسز یا اپنے معاونین کو فوراً آگاہ کر سکتے ہیں۔ آج کل موبائل فون کی ایک بڑی ضرورت تفریحی مقاصد کے تحت ہے بچے سے لے کر بڑے بزرگ تک کی تفریح کا ساماں یہ آلہ فراہم کرتا ہے۔ رشید امجد نے افسانہ "دست گزیدہ" میں اس منظرنامے کا تجزیہ ٹیکنالوجی کے ظہور کے بعد بدلتی ہوئی سماجی اقدار کے تناظر میں کیا ہے۔

> "میں نے تمہارے موبائل پر فون کیا، لیکن کوئی اور اٹھالیتا تھا۔ بھانجا تھا، وہ گیم کھیلنے کے لیے میرے موبائل پر قبضہ جمائے رکھتا تھا۔"(۶)

یہ بیانیہ اس تبدیلی کی علامت ہے کہ لوگ کس طرح خاندانی یا معاشرتی ماحول میں تعامل کرتے ہیں۔ موبائل فون کو صرف مواصلات کے لیے استعمال کرنے کے بجائے اب یہ تفریح کے لیے ایک مشترکہ وسیلہ ہے، جو سماجی اقدار اور ترجیحات میں تبدیلی کی عکاسی کرتا ہے۔ بچے کا موبائل پر گیم کھیلنے کے لیے قبضہ اس حقیقت کا غماز ہے کہ بچوں کے لیے باہر کی دنیا میں یا دوسرے کھیلوں سے زیادہ موبائل پر تفریح کا سامان موجود ہے اور وہ اس کے ساتھ کس طرح مشغول ہیں۔ نسل در نسل تبدیلی جاری ہے، نوجوان نسلیں اکثر پرانی نسلوں سے مختلف طریقے سے ٹیکنالوجی کو اپناتی اور استعمال کرتی ہیں۔ حامد سراج نے افسانہ "ایک اور داؤ" میں گاؤں اور شہر کی زندگی کا موازنہ کرتے ہوئے گاؤں میں کھیلوں کے مقابلے شہروں میں ٹیکنالوجی کی ترقی کی وجہ سے بدلتے ہوئے سماج میں ٹیکنالوجی کے کثیر الجہتی پہلوؤں کی تصویر کشی کی ہے۔ زندگی کی ایک گونج خاص طور پر شہری ماحول کے حوالے سے افسانے سے منتخب کردہ اس حصے میں دیکھیے:

> "ہماری زندگی کاغذی ہوتی ہے۔ اس میں کوئی خوشبو نہیں ہوتی۔ شہر میں ہوں یا گھر پر۔۔۔ کیبل، کمپیوٹر، انٹرنیٹ ہی ہماری تفریح کا واحد ذریعہ ہیں۔ یہ سب مشینی انداز ہیں۔"(۷)

یہاں زندگی کا استعارہ بطور "کاغذی" زندگی کی ناگزیر رکاوٹوں، مشکلات اور عارضی زندگی کی علامت کے طور پر لیا گیا ہے۔ ٹیکنالوجی سے پہلے کی زندگی میں پائی جانے والی رونقیں اب ختم ہو چکی ہیں جسے خوشبو کی عدم موجودگی کے طور پر لیا گیا ہے۔ تفریح کے بنیادی ذرائع کے طور پر کیبل، کمپیوٹر اور انٹرنیٹ کا ذکر فرد کی زندگی پر ٹیکنالوجی کے بڑھتے ہوئے اثر کو اجاگر کرتا ہے۔ انٹرنیٹ کا سب سے زیادہ استعمال آسانی سے اور جلد از جلد معلومات کا حصول بن گیا ہے۔ حمیرا اشفاق کا افسانہ "گھگو گھوڑے" اس حقیقت کا غماز ہے کہ کیسے انسان کو ٹیکنالوجی نے حیرت کے انقلاب میں مبتلا کر دیا اور اس کے پاس اسے اپنانے کے سوا کوئی چارہ نہ رہا۔ گو کہ

اس افسانے کی ظاہری پرت دل گرفتہ صورت حال کی عکاس ہے لیکن باطن میں ٹیکنالوجی نے ہماری معاشرتی قدروں میں کیسے تغیر پیدا کیا اس کو سموئے ہوئے ہے۔ افسانے میں ایک غریب باپ جو مٹی سے بنا کر گھگو گھوڑے بیچتا اور اسی آمدنی پر گزارہ کرتا تھا اس کی گھگو گھوڑے پر کی جانے والی محنت اور بازار تک انہیں لے کر جانا اور ان کے مقابلے میں پلاسٹک کے کھلونے اور چابی والے گھوڑوں کی بڑھتی ہوئی مانگ کو کہانی میں تشکیل دیا گیا ہے۔ میلے میں وہ اپنے مٹی کے گھوڑوں سے زیادہ بچوں کی دلچسپی پلاسٹک کے گھوڑوں میں دیکھتا ہے اور گھوڑے نہ خریدے جانے پر مایوس ہوتا ہے لیکن یہ مایوسی احساس زیاں میں اس وقت بدل جاتی ہے جب اس کا اپنا بیٹا ان گھوڑوں کو نقلی کہہ دیتا ہے اور دوسرے گھوڑے کو اصلی سمجھتے ہوئے لینے کی ضد کرتا ہے۔ آخر وہ اپنے بیٹے کو بھی مٹی سے بنائے اپنے گھوڑوں سے بہلانے میں ناکام ہو جاتا ہے اور اس کی خوشی کے لیے اسے بھی پلاسٹک کا گھوڑا لے کر دیتا ہے۔

> "مٹی سے پلاسٹک تک آتے آتے جیسے انسان کی سانس اکھڑ جاتی ہے۔ پلک جھپکتے ہی چابی والا گھوڑا گھگو گھوڑوں کی فوج کو پاؤں تلے روندتا کچے صحن میں دندناتا پھر رہا تھا۔"(۸)

افسانے کا سیاق انسانی زندگی پر ٹیکنالوجی کی ترقی اور اس کے اثر رسوخ کو اجاگر کرتا ہوا روایات میں ناگزیر تبدیلی کی علامت کے طور پر ابھرتا ہے۔ کیسے مٹی کے کھلونے بیچنے والے کے پیشے کو ٹیکنالوجی کی ترقی نے زوال بخشا، کیسے انسان کی دلچسپی کا سماں بدلتا جا رہا ہے، چیزیں پرانی ہوتی جا رہی ہیں اور ان کی جگہ ترقی یافتہ چیزوں نے لے لی ہے۔ انسان کی تیزی سے بدلتی ہوئی دلچسپیاں نامعلوم انداز میں انسان کو جکڑے ہوئے ہیں۔ یہ کہانی روایتی طرز زندگی پر ترقی کے گہرے اثرات کو اجاگر کرتی ہے۔

سید زبیر شاہ کا افسانہ "محبت خطِ تنسیخ کی زد میں" جہاں ایک طرف انسانی زندگی پر مذہب اور سیاست کے اثرات کو اجاگر کرتا ہے وہیں اس افسانے کا دوسرا بڑا موضوع انسان کی روزمرہ زندگی میں ٹیکنالوجی کے اثرات کا عکاس ہے۔ افسانے سے کچھ منتخب اقتباسات ملاحظہ ہوں:

> "یہ بھی گلوبل ویلج کا کمال ہی ہے، کوسوں دور ہونے والی لڑائی کا شور ہمارے گھر میں سنائی دیتا ہے۔"(۹)

> "اسے معلوم تھا کہ آج کل بریکنگ نیوز کی دوڑ میں ہر قسم کے سچے جھوٹے، پسندیدہ اور ناپسندیدہ واقعات فوراً ٹیلی وژن اسکرین کی زینت بن جاتے ہیں۔"(۱۰)

"پارک میں بیٹھے ہوئے چند نوجوانوں کو دیکھ کر وہ ان کی طرف جانا چاہتا تھا مگر وہ سب اپنے اپنے موبائل میں اس قدر مصروف تھے کہ ایک دوسرے سے بھی لاتعلق نظر آ رہے تھے۔"(۱۱)

ان اقتباسات سے با آسانی اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ فرد کی زندگی ٹیکنالوجی کے بعد کس قدر نہ صرف تبدیل ہوئی بلکہ دنیا کو عالمی گاؤں بنانے میں بھی سب سے بڑا کردار ٹیکنالوجی کا ہے۔ پہلے لوگ صرف اپنے گلی محلے میں ہونے والے جھگڑوں میں دلچسپی رکھتے تھے اب دوسرے کسی بھی ملک میں ہونے والے جھگڑے کا شورٹی وی، انٹرنیٹ اور شوشل میڈیا پر دیکھا جا سکتا ہے۔ ان ذرائع سے پوری دنیا میں چلنے والی سرگرمیوں سے عوام آگاہ ہو رہے ہیں۔ تبدیلی کے منظر نامے میں عالمی سطح پر معلومات اور ثقافتی تعملات بڑھانے میں ٹیلی ویژن، بریکنگ نیوز اور ڈیجیٹل میڈیا نے اہم کردار ادا کیا۔ پہلے وہ خبر جو عوام تک پہنچ ہی نہیں پاتی تھی اب وہ بریکنگ نیوز کی دوڑ میں ہر چینل پر گردش کرتی ہے بلکہ پچھلے کچھ سالوں سے اس کمی کو سوشل میڈیا سائٹس نے دور کر دیا ہے۔ ٹیکنالوجی نے بنیادی طور پر ہر فرد کی زندگی کو نئی شکل دی ہے۔ سوشل میڈیا اور فوری مواصلات کے ذرائع کی آمد نے ذاتی رابطوں میں انقلاب برپا کر دیا ہے، مختلف پس منظر کے لوگوں کے درمیان افہام و تفہیم اور ثقافتی تبادلے کو فروغ ملا ہے۔ لوگ فون میں اتنے مشغول ہو گئے ہیں کہ آس پاس کی خبر رکھنے یا آس پاس کے دوستوں سے ملنے جلنے سے زیادہ دور دراز کی خبروں میں دلچسپی رکھی اور سوشل میڈیا دوستوں سے تعلقات قائم کر لیے۔ موبائل مواصلات جدید تعلقات کا ایک وسیع پہلو بن گیا ہے، جس سے افراد کے اظہار خیال اور بات چیت کے طریقے پر اثر پڑا اور تعلقات ٹیکنالوجی میں ضم ہو گئے۔ سمارٹ فون اسکرین پر پیغامات کی تکرار ٹیکنالوجی سے متاثر جدید رشتوں کی ابھرتی ہوئی نوعیت کی علامت ہے۔ یہ تبدیلی تغیر پذیر معاشرتی اقدار کی عکاسی کرتی ہے۔ اس صورت حال کو مختلف افسانہ نگاروں نے اسلوب کے مختلف پیراؤں میں بیان کیا ہے۔ خالد فتح محمد کے افسانے "دل کو دل سے راہ" سے اقتباس ملاحظہ ہو:

"جب سے ہم نے موبائل پر جنسی chat شروع کی تھی یہ ہماری اکیلے میں ہونے والی پہلی ملاقات تھی۔۔۔ اس دوپہر وہ سب دہرایا گیا جو ہم سکرین پر لفظوں کے ذریعے لکھتے تھے۔"(۱۲)

متن موبائل مواصلات کے اثر و رسوخ کی وجہ سے ممکنہ رومانوی تعلقات کی حرکیات میں ایک اہم تبدیلی کی طرف اشارہ کرنے کے علاوہ اس ڈیجیٹل تبدیلی کے ساتھ منسلک سہولت اور ممکنہ مسائل کو بھی اجاگر کرتا

ہے۔ یہ عصری ڈیٹنگ کلچر کی تصویر کشی کرتا ہے۔ انسانی رشتوں کے بدلتے ہوئے منظر نامے کے بارے میں باریک بینی سے کیے گئے مشاہدے کا عکاس ہے کہ کس طرح تعلقات کے دائرے میں معاشرتی اقدار ڈیجیٹل کمیونیکیشن ٹولز (Communication Tools) کے انضمام کے بعد تیار ہو رہی ہیں۔ عصری فکشن کے دائرے میں مصنفین کو ایک ایسے معاشرے کی تصویر کشی کا موقع ملا ہے جہاں افسانوں کے کردار جسمانی اور ڈیجیٹل دنیاؤں کے درمیان کی سرحدیں ایک نئے احساس کے ساتھ عبور کر رہے ہیں۔ یہ کردار ایک ایسے جہان کو تشکیل کر لیتے ہیں جہاں جسمانی موجودگی اور ورچوئل مشغولیت ان کے لیے ایک سماں ہے۔ یوں افسانہ نگاروں نے بھی اس زمانے میں انسانی تعلق کی پیچیدگیوں کو اجاگر کیا ہے۔ صرف تعلقات ہی نہیں بلکہ انسان کی پوری زندگی ہی مشینی ہو گئی ہے۔ جو کام پہلے انسان کیا کرتے تھے اب وہ کام مشینوں کے ذریعے آسانی سے کیے جانے لگے ہیں۔ سماجی اقدار کے بدلتے ہوئے منظر نامے کو افسانوں میں اس طرح سمویا گیا ہے کہ باہمی تعلقات کی بدلتی ہوئی حرکیات بھی سامنے آتی ہیں اور پتا چلتا ہے کہ مشینیں روزمرہ کی زندگی پر کیسے اثر انداز ہو رہی ہیں۔ مثلاً حمیرا اشفاق کے افسانے "مسٹر چرچل" میں تخلیق کیے گئے کردار کی زبانی اس حقیقت کو تسلیم کیا گیا ہے۔ اقتباس ملاحظہ ہو:

> "گزشتہ برسوں میں جھانکتے ہوئے وہ کہنے لگے؛ پہلے کام انسان کرتے تھے اب ہر کام مشین کے ذریعے ہوتا ہے۔"(۱۳)

یہ مشاہدہ ایک وسیع تر معاشرتی بیانیے کا عکاس ہے۔ مختلف صنعتوں اور شعبوں میں مشینوں کے ذریعے کام کے بے شمار فوائد حاصل ہوئے۔ انسانوں کے مقابلے مشینیں تیز رفتاری سے کام کر سکتی ہیں۔ مشینی سہولت سے مجموعی کارکردگی اور پیداوری ذرائع میں اضافہ ہوا۔ جدید مشینوں کو آسانی سے پروگرام کیا جا سکتا ہے اور پیداواری ضروریات میں تبدیلیوں کو اپنانے کے لیے دوبارہ ترتیب دیا جا سکتا ہے۔ مشینیں اپنی کارکردگی کے اعتبار سے انسانوں سے سبقت لے جا رہی ہیں۔ مینوفیکچرنگ سے لے کر ہسپتالوں تک مختلف شعبوں میں ٹیکنالوجی کے میدان میں اہم پیش رفت ہوئی۔

> "سب بینکوں میں ملازموں کو ہٹا کر ایک مشین رکھ دی۔ اب ٹکٹ گھروں سے لوگوں کو ہٹا کر خودکار مشینیں نصب کر رہے ہیں۔"(۱۴)

یہ بیانیہ عصری معاشرے میں مشینوں کے اثر و رسوخ کے ایک وسیع تر رجحان کی عکاسی کرتا ہے جہاں روایتی انسانی کرداروں کے برعکس دونوں شعبوں میں دیکھی جانے والی یہ ترقی روزگار پر ٹیکنالوجی کے دوررس اثرات

کو واضح کرتی ہے اور ممکنہ سماجی مضمرات کے حوالے سے بصیرت فراہم کرتی ہے۔ مصنفہ نے مسٹر چرچل کے کردار کی تشکیل کر کے مشینی ترقی کے اس عہد میں معدوم ہوتے ہوئے انسانی کردار اور اس کے مستقبل کے تحفظ کے حوالے سے پیدا ہونے والے خدشات کو قلم بند کیا ہے۔ جہاں انسانی زندگی پر مشینوں کے اثر رسوخ کو اجاگر کیا گیا وہیں اس حقیقت کو بھی تسلیم کیا گیا ہے کہ انسانوں کے بغیر یہ مشینی نظام جام ہو جائے گا۔ معاشرے پر ٹیکنالوجی کے اثرات اور اس سے ابھرتے ہوئے نئے تقاضوں کو ڈاکٹر حمیرا اشفاق نے اپنے مختلف افسانوں میں مختلف حوالوں سے پیش کیا ہے۔ مثال کے طور پر ایک اور افسانے "کتبوں کے درمیان" میں یہ باور کروایا ہے کہ جہاں سائنسی ترقی کا ایک نیا باب کھلا وہیں قدامت پرستی ایک نئی شکل میں ابھر کر سامنے آئی۔ سائنس نے جہاں یہ سہولت پیدا کر دی کہ مشینوں کے ذریعے بچے کی پیدائش سے پہلے ہی پتا لگایا جا سکتا تھا کہ بچہ لڑکا ہے یا لڑکی وہیں اس کے منفی اثرات بھی دیکھے جا سکتے ہیں جو قبرستان میں چھوٹی چھوٹی ڈھیریوں کی صورت نظر آتے ہیں۔ افسانے میں مشینی ترقی کے اس ناسور کو اجاگر کرتے ہوئے ڈاکٹر حمیرا اشفاق لکھتی ہیں:

> "جب مشینیں کوکھ کے اندھیروں میں بھی لڑکی ڈھونڈ لیتی ہیں تو ان کا مقدر یہ ننھی ڈھیریاں بن جاتی ہیں۔"(۱۵)

جدید ایجادات نے انسان کے طرز زندگی میں خاصہ فرق پیدا کیا ہے۔ زمینیں جو پہلے اناج اگاتی تھیں اب پراپرٹی کے دھندے کے زیر قبضہ آ گئی ہیں اور ان کی دن بدن بڑھتی ہوئی اہمیت کے پیش نظر شہری انہیں اپنانے پر مجبور نظر آتے ہیں۔ انہوں نے مہنگے سے مہنگے سسٹم کو اپنا معیار بنا لیا ہے۔ آصف فرخی نے افسانہ "بونسائی" میں اس کی زندہ مثال پیش کی ہے۔

> "یہ الارم سسٹم ہمارے لیے ضروری ہے، مہنگا ہے تو کیا ہوا، اس علاقے میں رہنے کے لیے It's a must..."۔(۱۶)

معاشرے کی ضروریات تبدیل ہوتی جا رہی ہیں۔ افسانہ نگار اپنے شعور میں اس یاد کو لے کر آتا ہے کہ الارم سسٹم کے وجود سے پہلے کیا حالات تھے۔ اس جدید دور میں انسان کی ضروریات تبدیل ہو گئی ہیں اور وہ مہنگے سے مہنگے الارم سسٹم کو اپنانے کے لیے تیار ہے جب کہ اس کے بچپن کے دنوں میں اس کی نانی آیت الکرسی پڑھ کر ایسے پھونکتی جیسے اس کے گرد حصار بن گیا ہو اور ان کا خیال تھا اب یہ سب کی حفاظت کرے گا۔ اس افسانے کا سیاق شہری زندگی کی عصری حقیقت کی عکاسی کرتا ہے۔ ملکی اور شہری ترقی کے نام پر بلند و بالا

عمارتیں تعمیر کی جانے لگیں۔ دیہات شہر کا روپ دھارنے لگے۔ زراعت کے لیے زمین کم ہوئی تو مصنوعی طریقہ کار سے پیداوار میں اضافے ہوئے۔ زراعت اور پودے اگانے میں بھی ٹیکنالوجی غالب آتی جارہی ہے۔ کسانوں کے لیے ٹیکنالوجی نے جہاں جدید سہولیات میسر کی ہیں وہیں کسان کی زمین کے پیڑ پودوں سے محبت ختم ہوگئی ہے۔ کسانوں نے جدید طریقوں کو اپنانے کے لیے نیٹ سے استفادہ کیا۔

"تمہارا خیال غلط ہے کہ اس سے درخت کو تکلیف ہوتی ہو گی ۔۔۔ میں نے اس کے بارے انٹرنیٹ پر چیک کر لیا ہے، یہ بڑا خاص طریقہ ہے جسے styling کہتے ہیں۔"(۱۷)

آصف فرخی نے اپنے بے شمار افسانوں میں انسان کی بدلتی اقدار پر ٹیکنالوجی کے اثرات کو اس طرح موضوع بنایا ہے کہ حال اور ماضی کا موازنہ قاری کے روبرو پیش کر دیا۔ بظاہر ان کے افسانے کراچی کے حالات کے عکاس ہیں لیکن تبدیل ہوتے ہوئے ماحول کو ٹیکنالوجی کی ترقی کے تناظر میں قلم بند کرتے ہیں جیسے ان کا افسانہ "کہر"، "سمندر کی بیماری" اور "آج کا مرنا" ٹیکنالوجی کے اثرات اور انسان کی مصنوعی زندگی کو اجاگر کرتا ہے۔ عصری افسانوں میں موسمیاتی تبدیلی اور ٹیکنالوجی کا سنگم ایک بھرپور اور فکر انگیز منظر پیش کرتا ہے۔ مصنفین نے ایک ایسے مستقبل کی تصویر کشی کی جو مشینی ترقی کی بدولت پیدا ہونے والے تباہ کن نتائج اور ماحولیاتی انحطاط کو اجاگر کرتے ہیں۔ ان افسانوں کے کردار ٹیکنالوجی کے غیر ارادی ضمنی اثرات سے دوچار ہیں۔ دوسری طرف کچھ پر امید بیانیے ایک ایسی دنیا کو پیش کرتے ہیں جہاں ٹیکنالوجی موسمیاتی تبدیلی کے خلاف جنگ میں امید کی کرن کا کام کرتی ہے۔ شفیق انجم کے افسانے بھی ان تغیرات کے عکاس ہیں جو اس صدی کی پہچان ہے۔ "خدا مصروف ہے" افسانے میں جہاں انسان کی ابتدائی زندگی کے خدوخال اجاگر کیے گئے وہیں جدید دور کی ٹیکنالوجی کو موضوع بنایا گیا ہے۔ مصنف کے خیال میں جہاز، راکٹ، انجن، چھوٹی بڑی مشینیں خاص طور پر ٹیکنالوجی کے حیرت انگیز کرشموں کے بارے بات کرتے ہوئے آج کل کوئی نہیں اکتاتا اور انسان نے اس ضمن میں ایسی ایسی ایجادات کی ہیں کہ

"پرانے ہتھیاروں، برچھیوں، تلواروں، نیزوں کی جگہ میزائل، ایٹم بم اور ہائیڈروجن بم بالکل تیار رکھے پڑے ہیں۔۔۔ چھوٹی موٹی ہلاکت خیز وارداتیں تو اب شغل کے لیے کی کرائی جاتی ہیں اور گولیوں کی بوچھاڑوں سے معصوم جسموں کو چھید کر یہ جاننے کی کوشش کی جاتی ہے کہ کون کتنا بارود سہہ سکتا ہے۔۔۔"(۱۸)

انسان کے بنائے ہوئے اپنے ان جدید ہتھیاروں جو کسی بھی بڑے تصادم کے لیے تیار ہیں اور وہ سب کچھ جو خود انسان نے اپنے لیے تیار کر رکھا ہے اسی سے خوف زدہ بھی ہے اور اپنی بربادی کا سامان تیار کر کہ غفلت میں کہتا پھرتا ہے کہ خدا شاید مصروف ہے، سو رہا ہے یا مر چکا ہے۔اسی طرح ایک اور افسانے "کھپت۔۔بیانیہ ہے" میں ڈاکٹر شفیق انجم نے بیک وقت ماضی، حال اور مستقبل کا موازنہ پیش کیا ہے کہ کس طرح سے ٹیکنالوجی کی بدولت زندگی اس قدر تبدیل ہو گئی کہ پتا ہی نہیں چلتا کہ جو اسباب قدیم زمانے میں زندگی گزارنے کے لیے ضروری تھے ان کو اب کسی کے پاس یاد کرنے کا وقت بھی نہیں ہے، یوں افسانے کا مرکزی موضوع ٹیکنالوجی کے اس کھپت بیانیے کو بیان کرتا ہے۔افسانے سے اقتباس ملاحظہ ہو:

> "خود کار مشینوں کی ایجاد نے تمدنی نقشے میں ایسے نئے نئے رنگ بھر دیے ہیں کہ رہنے سہنے، کھانے پینے، پہننے اوڑھنے اور نشست و برخاست سے متعلق کم و بیش ساری ہی چیزیں اپنی ہیئت بدل چکی ہیں۔زرعی سماج نے صنعتی اوڑھنی اوڑھ کر دیہات کے مقابلے میں شہری معاشرت کے جس جادوئی تسلسل کی بنیاد رکھی ہے، وہی زندگی کے ہر شعبے میں معیار بندی کا حوالہ بن چکا ہے۔"(۱۹)

انسانی زندگی اس قدر تیزی سے تبدیلی کا سفر طے کر رہی ہے کہ یہ سب کچھ بقول مصنف ڈیجیٹل انقلاب کا نتیجہ ہے۔نت نئی سائنسی ایجادات نے پورا نظام ہی تبدیل نہیں کیا بلکہ انسان کے عادات و اطوار میں بھی واضح تبدیلیاں پیدا کی ہیں۔ انسانوں کی جگہ روبوٹس سے کام لیا جانے لگا ہے اور یہ تقریباً ہر میدان میں ہی جاری ہے۔ ٹیکنالوجی کے میدان میں اس قدر ترقی ہوتی جا رہی ہے کہ مصنف کا خیال ہے کہ بہت جلد اب انسان بھی لیبارٹریوں میں تیار ہونے لگیں گے۔جب کہ جنسی اعضا کی خرید و فروخت پہلے ہی عام رویہ بن چکا ہے۔انسان کی معاشرتی قدروں میں یہ تبدیلی اس قدر تیزی سے رونما ہوئی ہے کہ

> "مدتوں پہلے کسی نے جنسی اعضا بنانا اور خریدنا بیچنا چاہے تھے تو خوب ٹھٹھ ہوا تھا لیکن اب اسلحے کی خرید و فروخت کے بعد سب سے بڑی منڈی یہی ہے۔ سیلی کون کی عورت اور سیلی کون کے مرد کہ جو مصنوعی ذہانت رکھتے، باتیں کرتے، جذباتی تسکین کا سامان فراہم کرنے کی صلاحیت سے مالا مال ہیں اور اس کے ساتھ ساتھ ایسے کل پرزے متحرک و متنوع بھی ہیں اور ارزاں بھی، ہر کسی کی خواہش بنتے چلے جا رہے۔۔۔"(۲۰)

افسانے سے یہ فکر انگیز اقتباس انسانی رشتوں پر ٹیکنالوجی کے اثرات اور معاشرتی اقدار کے باہمی ربط پر پیدا ہونے والے پیچیدہ سوالات کو جنم دیتا ہے۔ انٹرنیٹ کی سہولت اور ترقی کے ساتھ مصنوعی ذہانت کی حامل مخلوق کے سلسلے میں بھی بہت ترقی ہوئی جنہیں بوٹس کا نام دیا جاتا ہے۔ اس کے حیرت انگیز فوائد نے انسان کی زندگی میں ایک بڑی تبدیلی پیدا کی ہے کیوں کہ یہ بوٹ بالکل ایسے کام کرتے ہیں جیسے ایک انسان کام کر رہا ہو۔ بوٹس کے کردار کے بارے میں منشا یاد لکھتے ہیں:

> "اس حقیقی نظر آنے والی مخلوق کی بے شمار قسمیں اور گروپس ہیں۔ چیٹنگ کرنے، آن لائن اسٹورز سے خریداری میں مدد دینے، سرچ اور انٹرنیٹ کے جملہ امور میں معاونت کرنے، تکنیکی اور نفسیاتی معاملات میں مشورہ دینے گیمز میں رہنمائی کرنے اور آپ کے پرسنل سیکرٹری یا اسسٹنٹ کے فرائض سر انجام دینے والے ایجنٹس اور بوٹس۔ ایسی ورچوئل لیڈی سکرٹریز جو آپ کی مصروفیت کا شیڈول مرتب کرتی، آپ کو ای میل کا متن پڑھ کر سناتی اور آپ کی غیر موجودگی میں آپ کی ٹیلی فون کال سنتی اور جواب دیتی ہیں۔"(۲۱)

لوگوں نے اس ترقی یافتہ دور کی جدید سہولیات کے سہارے دور دراز کے لوگوں سے دوستیاں تو استوار کی مگر مصروفیات کے لمحوں میں بوٹ سسٹم نے ان کی طرف مختلف کاموں کو سنبھالنے میں اہم کردار ادا کیا ہے۔ یہ بوٹس مواصلت کو ہموار کرنے اور معمول کے افعال کو مؤثر طریقے سے انجام دینے کے لیے ڈیزائن کیے گئے، جس سے افراد اپنے وقت کو زیادہ مؤثر طریقے سے منظم کر سکتے ہیں۔ اس سے انسان کو ملنے والی بہت سی سہولیات میں فرق آیا تو اس کی ترجیحات بھی بدل گئیں۔

مجموعی طور پر ٹیکنالوجی کی ترقی اور سوشل میڈیا نے اکیسویں صدی میں سماجی اقدار کی تشکیل میں اہم کردار ادا کیا ہے۔ سماجی اصولوں، باہمی تعلقات اور ثقافتی رویوں پر سوشل میڈیا اور ٹیکنالوجی کی ترقی کا اثر بہت گہرا رہا ہے جو مثبت اور منفی دونوں طرح کی تبدیلیوں کا باعث بنا۔ ایسے رابطوں کو فروغ ملا جو ماضی میں ممکن نہیں تھے۔ انسان کے ایک دوسرے سے تعلقات کا نظام بدل گیا۔ سوشل میڈیا کی وجہ سے سماجی اقدار میں ہونے والی تبدیلیوں میں آن لائن تعلقات کا سطحی پن نمایاں ہے جو مختلف افسانہ نگاروں نے بیان کیا ہے۔ سوشل میڈیا نے مواصلات کے نئے طریقے متعارف کرائے، جیسے ایموجیز، مخففات اور بصری مواد، روایتی تحریری اور زبانی مواصلاتی انداز میں تبدیلی کو اجاگر کرتا ہے۔ سماجی اور سیاسی سرگرمیوں کے لیے افراد کو

پلیٹ فارم مہیا ہوا جس نے فرد کی سوچ کو مختلف زاویے عطا کیے۔ اس سے ثقافتی تبادلے کو فروغ حاصل ہوا، بدلتے ہوئے منظر نامے نے لوگوں کی ترجیحات کو بھی متاثر کیا ہے۔ فوری مواصلات کی سہولت، معلومات کی وسیع مقدار تک رسائی اور بعض کاموں کو خود کار کرنے کی صلاحیت جدید زندگی کے لازمی پہلو بن چکے ہیں۔ اس نے انسان کو سہل پسند بنا دیا ہے۔ اردو افسانہ سوشل میڈیا کی وجہ سے سماجی اقدار میں ہونے والی ان تبدیلیوں کو تلاش کرنے اور جدید معاشرے کی پیچیدگیوں کو اجاگر کرنے میں معاون ہے۔ افسانہ نگاروں نے ایسے کرداروں کی تصویر کشی کی جو ابھرتے ہوئے سماجی منظر نامے کے مختلف پہلوؤں اور ان کی زندگیوں پر ڈیجیٹل کلچر کے اثر ورسوخ کو نمایاں کرتا ہے۔ سادہ اور فطری انداز زندگی کی جگہ مشینی زندگی نے لے لی ہے۔ وقت کی تیز رفتاری میں ایسا اضافہ ہوا ہے انسان اپنی پہچان کھو کر خود بھی مشین کی طرح ہو گیا ہے۔

ب۔ معاصر افسانے میں عالمگیریت کا تصور اور معاشرتی اقدار

انٹرنیٹ اور سوشل میڈیا کی آمد نے عالمی سطح پر رابطے میں سہولت پیدا کی ہے جس سے گلوبلائزیشن کا تصور ابھرا۔ گلوبلائزیشن نے دنیا بھر میں بدلتی ہوئی معاشرتی اقدار کی تشکیل کرنے اور اقدار پر اثر انداز ہونے میں اہم کردار ادا کیا اور زندگی کے ہر شعبے کو متاثر کیا ہے۔ معیشتوں، ثقافتوں اور معاشروں کے باہم مربوط ہونے کی وجہ سے خیالات، اقدار اور طرز عمل کا متحرک تبادلہ ہوا ہے۔ اس نے پاکستان کے سماجی و سیاسی منظر نامے پر بھی مستقل نقوش چھوڑے ہیں۔ یہ عصری دور ہے جس میں مغربی اثر ورسوخ کا بے مثال اضافہ دیکھنے میں آیا ہے۔ تہذیبی تصادم یا امتزاج سے پیدا ہونے والی صورت حال کے اثرات گو کہ برصغیر پر انگریزوں کی حکومت کے بعد سے ہی دیکھنے کو ملتے ہیں لیکن گزشتہ کچھ برسوں میں عالمی منظر نامے میں ایسی تبدیلیاں آئی ہیں کہ مغربی اثرات ایک وسعت اور شدت کے ساتھ عصری تقاضوں کو متاثر کر رہے ہیں۔ حالیہ برسوں میں عالمگیریت کی قوتوں نے مغربی اثر ورسوخ کو نئی بلندیوں تک پہنچایا ہے، جس نے پاکستانی معاشرے کو کثیر جہتی طریقوں سے متاثر کیا۔ ٹیکنالوجی کی تیز رفتار ترقی، معلومات کے عالمی بہاؤ اور معیشتوں کے باہم مربوط ہونے نے ایک ایسا ماحول پیدا کیا ہے جہاں مغربی خیالات، مصنوعات اور ثقافتی برآمدات پاکستانی معاشرے پر اثر انداز ہوتی ہوئی نظر آتی ہیں۔ اس اثر ورسوخ کی شدت، طرز زندگی عوام کی ترجیحات اور یہاں تک کہ سیاسی نظریات جیسے شعبوں میں بھی دیکھی جا سکتی ہے۔ عالمگیریت نے بین الاقوامی میڈیا، موسیقی، فلموں اور فیشن کے پھیلاؤ کے ساتھ ثقافتی تبادلے میں اضافہ کیا ہے۔ مغربی فلموں، موسیقی، فیشن اور اس طرز زندگی کے رجحانات کے پھیلاؤ نے ایک عالمی ثقافتی ماحول سے آگاہی میں بڑا کردار ادا کیا ہے جس

سے روایتی طرز زندگی پر مغربی اثرات مرتب ہوئے۔ جو معاشروں میں نئی اقدار کو اپنانے اور ان کے انضمام کا باعث بنا۔ ناصر عباس نیر عالمگیریت کی متعین کردہ تعریفوں کی روشنی میں اس کو اپنی اصل میں سرمایہ دارانہ نظام قرار دیتے ہوئے لکھتے ہیں:

> "قسم قسم کی صنعتی اشیا کو مسلسل پیدا کرنا، انھیں دنیا کے کونے کونے میں پہنچانا، ان کے صرف کے لیے نئی نئی انسانی ضرورتوں کی تخلیق کرنا، ان کے لیے ذہن سازی کرنا قوانین بنانا، قومی حکومتوں کے کردار کو کم کرنا، ثقافت و زبان کو بروے کار لانا، عالمگیریت کی خصوصیات ہیں۔"(۲۲)

پاکستانی معاشرے کے بدلتے ہوئے منظر نامے میں جو عالمی اثرات غالب نظر آتے ہیں ان کی روشنی میں عالمگیریت کی یہ تعریف درست معلوم ہوتی ہے۔ پاکستانی معاشرے میں عوام کا اوڑھنا بچھونا عادات و اطوار سب کچھ عالمی اثرات سے متاثر نظر آتے ہیں۔ "کفن سے انکاری" افسانے میں ڈاکٹر انوار احمد نے ایک ایسی کہانی قلم بند کی ہے جو معاشرے پر اثر انداز ہونے والے بیرونی عوامل کے بعد پیدا ہونے والے تغیر کی علامت ہے۔ یہ ایک ایسی کالونی کا بیانیہ ہے جس پر جب تک خارجی اثرات مرتب نہ ہوئے تھے تب تک یہ ایک پر سکون کالونی کہلاتی تھی جہاں لوگ محنت و مشقت کرتے، تعلیم حاصل کرتے، وقت پر انہیں ملازمت بھی مل جاتی، شادی بیاہ کے معاملات طے پاتے تھے، سب مل جل کر محبت سے رہتے تھے، کبھی کسی قسم کے بحث و مباحثے کا حصہ نہ بنے تھے، غرض ہر طرح کے مسائل کے باوجود مختلف شعبوں سے تعلق رکھنے والے یہاں کے لوگ خوشحال تھے۔ لیکن اب حالات اس صورت حال کے متضاد ہیں جیسے آج کل جمہوریت کی بحالی، بے حالی اور بد حالی پر گفتگو ایک بڑے تنازعے کے روپ میں عیاں ہوتی ہے۔ مذہب کو تشدد پسند بنا کر پیش کیا جانے لگا ہے۔ اس افسانے میں گلوبلائزیشن سے پہلے اور بعد کے حالات کو اجاگر کیا گیا ہے۔ جیسا کہ اس کالونی پر جب کیبل کے اثرات مرتب ہونا شروع ہو گئے تو جو صورت حال پیدا ہوئی اسے کرداروں کی زبانی ان الفاظ میں قلم بند کرتے ہیں:

> "میرے دوستوں کا بھی یہی خیال ہے کہ آپ جیسے بزرگوں کو کیبل کے ذریعے علی الصبح دکھائے جانے والے ایک دو چینلوں کے پروگراموں نے گمراہ کیا ہے یا بزرگوں میں جنسی توفیق کے حوالے سے خود فریبی پیدا کرنے والے اشتہاروں نے آپ کو اپنی عاقبت خراب کرنے پر آمادہ کر دیا ہے۔"(۲۳)

اس افسانے کے ذریعے اس حقیقت کو پیش کیا گیا ہے کہ جب معاشرے میں تبدیلی پیدا کرنے والے ان ذرائع کا اثر ورسوخ بڑھا تو معاشرہ تیزی سے تبدیل ہوتا گیا۔ جیسا کہ کیبل کے اثرات کے بعد سوچ اس قدر تبدیل ہو گئی کہ ڈرپوک شہری کے طور پر زندگی گزارنے یا ہمسایوں، والدین اور بیوی بچوں کی دل نوازی سے راہ فرار اختیار کرتے ہوئے افسانے کا مرکزی کردار قاضی شاہد اپنی منشا کے مطابق زندگی گزارنے کے لیے آواز اٹھاتا ہے اور دیکھتے ہی دیکھتے یہ آواز محلے اور پھر عالم ارواح تک پھیل جاتی ہے۔ یہاں افسانہ نگار نے اس سوچ کی عکاسی کی ہے جو عالمگیریت کے باعث معاشرتی اور ثقافتی تبدیلیوں کا باعث بنی۔ اکیسویں صدی کے افسانے کا مطالعہ اس حقیقت کو اجاگر کرنے میں معاون ہے۔ تقریباً تمام افسانے ہی گلوبلائزیشن کے بعد کی صورت حال کو اجاگر کرتے ہیں۔ گلوبلائزیشن نے تعلیم میں بہتری لائی ہے اور معلومات تک رسائی میں اضافہ کیا ہے۔ روایتی صنفی کرداروں کو چیلنج کرنے اور صنفی مساوات کو فروغ دینے میں اپنا کردار ادا کیا ہے۔ یوں پاکستان میں خواتین کے لیے تعلیم اور روزگار کے مواقع بڑھے ہیں۔ گلوبلائزیشن نے تجارت اور معاشی ترقی کے مواقع کھولے ہیں، جس سے بہت سے پاکستانیوں کے معیار زندگی میں بہتری آئی ہے۔ اقتصادی طور پر، عالمگیریت کی وجہ سے تجارت اور سرمایہ کاری میں اضافہ ہوا ہے جس سے عالمی منڈی میں پاکستانی معیشت کا انضمام ہوا ہے۔ اس نے اقتصادی منظر نامے کو نئی شکل دینے والے مغربی کاروباری طریقوں کو اپنانے میں سہولت پیدا کی۔ یوں ٹیکنالوجی سے چلنے والی صنعتوں کا عروج ان تبدیلیوں کی علامت ہے۔ غیر ملکی سرمایہ کاری کی اہم ترین شکل ملٹی نیشنل کمپنیاں ہیں۔ ان کے قیام سے گو کہ ایک نئے سامراجی دور کا قیام عمل میں آتا ہے لیکن وقت کی ضرورت کے تحت پاکستان میں بھی کئی ملٹی نیشنل کمپنیوں کا قیام عمل میں آیا۔ "بین کرتی مَیّا" افسانے میں سید زبیر شاہ نے ان کمپنیوں کے اثر رسوخ کو میانامی کردار کے خیالات کے ذریعے اجاگر کیا ہے۔ معاشرے کے ذہنوں کو نئی صدی کے تقاضوں کے مطابق ڈھالنے کے لیے یہ کمپنیاں کیا کردار ادا کر رہی ہیں اس حوالے میں اقتباس دیکھیے:

> "غیر سرکاری دفتر ترقی یافتہ کاموں کے ذریعے محلے کے پسماندہ ذہنوں کو نئی صدی کے تقاضوں سے ہم آہنگ کرنے میں منہمک تھا۔ میا کو ایک آنکھ نہ بھاتا۔ وہ پہلے تو اسے کافروں کا دفتر کہتی رہی لیکن جب سے اسے یہ معلوم ہوا تھا کہ اس دفتر کو تمام پیسے انگریزوں سے ملتے ہیں، تب وہ اسے گوروں کے چمچوں کا دفتر کہتی تھی۔"(۲۴)

میاکا ردعمل بیرونی قوتوں کی جانب سے متعارف کرائی گئی تبدیلیوں کا عکاس ہے۔ یہ ایک استعاراتی اظہار ہے جو معاشرے کی تشکیل میں مغربی طاقتوں کے اثر ورسوخ کی نشاندہی کرتا ہے اور بیرونی اثرات کے پیش نظر مقامی شناخت کے ممکنہ مٹ جانے کے خدشات کو بھی اجاگر کرتا ہے۔ عالمگیریت نے برینڈ کلچر کو بھی فروغ دیا ہے۔ انسان کے رہن سہن پر برینڈ کی ایک چھاپ نظر آنے لگی ہے اسی کو عوام نے معیار زندگی بنا لیا ہے۔ محمد حامد سراج نے افسانہ "اندراج" میں عالمگیریت کے اثرات کو قلمبند کرتے ہوئے کہانی میں نفیسہ کا کردار شہر کی ماڈرن اور بے باک لڑکی کے طور پر تشکیل دیا ہے جو بظاہر تو ایک نیک لڑکی ہے مگر اس کی حرکات و سکنات، انٹرنیٹ کا بے دریغ استعمال اور اس کے ذریعے نیوڈ سائٹس پر اس کی سرگرمیاں عادل کے ساتھ ساتھ معاشرے میں تہذیب کے نام و نشان کے اندراج کی کھوج پر سوال اٹھاتا ہے۔ برینڈ کی چمک دمک نہ صرف نفیسہ کے اپنے لباس میں دیکھنے کو ملتی ہے بلکہ اس کی پھوپھی کا بیٹا عادل جب انجرہ سے آتا ہے تو اسے بھی بڑے بڑے برانڈز پر لے کر جاتی ہے۔ اس کا بیان افسانے میں اس طرح سے ملتا ہے۔

> "رات کے کھانے کے بعد وہ عادل کو گھمانے پھرانے کے لیے نکلی۔ تیز روشنیوں کے درمیان اس نے ایک مارکیٹ کی پارکنگ میں کار پارک کی اور اسے ساتھ لے کر ایک "شوسٹور" میں داخل ہوئی۔ "سنو۔۔۔ اتنی سمجھ مجھ میں بھی ہے۔ اس برانڈ کے جوتے بہت مہنگے ہیں۔ چھوڑو یہ اسراف ہے۔" یہ کوئی اسراف نہیں۔ بس میں اپنی پسند کی جوتی لے کر دے رہی ہوں اور تم نے پہننی ہے"(۲۵)

اسی طرح نفیسہ اور عادل کا موبائل بھی ایک ہی ماڈل اور برانڈ کا ہونا انسان کی زندگی پر بڑھتے ہوئے برانڈ کلچر کی اہمیت کو اجاگر کرتے ہیں۔ عالمگیریت کے اثرات کے تحت ملنے جلنے کھانے پینے کی عادات بھی تبدیل ہوئیں۔ پاکستان میں فاسٹ فوڈ کے رجحان میں اضافہ ہوا۔ آصف فرخی کا افسانہ " Mac Arabia Meal۔۔۔"، مرزا حامد بیگ کا افسانہ "مٹیالے چھجّے والا ریستوران"، اسد محمد خان کا افسانہ "بوب کا چائے خانہ" اور گل زیب عباسی کا افسانہ "کھانا" اس کی بہترین مثالیں ہیں۔ عالمگیرت کی اس لہر سے مغربی معاشروں کے لباس کو بھی پاکستانی معاشرے میں مقبولیت حاصل ہوئی۔ اسی طرح افسانہ "ویلنٹائن" کی مثال بھی انہی عالمی اثرات کا نتیجہ ہے جس کے زیر اثر مختلف دنوں کی مناسبت سے معاشرتی سرگرمیوں کی طرف بڑھتے ہوئے مختلف رجحان دیکھنے کو ملے ہیں۔ اسی طرح پاکستانی معاشرے میں لسانی تغیرات بھی عالمی اثرات کا پیش خیمہ ہیں۔ اکیسویں صدی کے افسانوں میں عالمگیریت کے زیر اثر پاکستانی معاشرے میں رواج پا جانے والے

نئے فیشن، نئی تفریحات اور رہن سہن میں آنے والی جابجا تبدیلیوں اور تغیر پذیر اقدار کی عکاسی کی گئی ہے۔ یہ افسانے تبدیلیوں کو اپنی گرفت میں لیتے ہوئے ایک ایسے معاشرے کی تصویر کشی کرتے ہیں جو اپنی منفرد شناخت کو برقرار رکھنے اور عالمی اثرات کو اپنانے کی دوہری قوتوں سے نبرد آزما ہیں۔

ج۔ معاصر افسانے میں نقل مکانی کی صورتیں اور بدلتے ہوئے تقاضے

نقل مکانی فرد کے معاشرتی و اقتصادی منصب میں تبدیلی کا باعث بنتی ہے۔ اکیسویں صدی کے افسانے میں اجاگر کی گئی معاشرتی اقدار کے پس پردہ محرک قوتوں میں افراد کا دیہاتوں سے شہروں کی طرف اور شہروں سے بیرون ممالک میں نقل مکانی کا رجحان شامل ہے۔ جیسے جیسے لوگ تیزی سے شہروں کی طرف بڑھ رہے ہیں، ادب میں بیانیے بھی انفرادی زندگیوں اور معاشرتی حرکیات پر اس آبادیاتی تبدیلی کے گہرے اثرات کی عکاسی کر رہے ہیں۔ منتخب کردہ افسانوں میں بے شمار افسانے ایسے ہیں جن کے کردار اپنی روایتی دیہی طرز زندگی سے کٹ کر شہروں کے تیز رفتار اور کثیر الثقافتی ماحول میں داخل ہو رہے ہیں۔ بالخصوص ناصر عباس نیر کا افسانوی مجموعہ "خاک کی مہک" سلیم آغا قزلباش کا "اعلانوں بھرا شہر" علی اکبر ناطق کا "قائم دین" اور "شاہ محمد کا ٹانگہ"، رشید امجد کا "دکھ ایک چڑیا ہے" نقل مکانی کے پس منظر میں ترتیب دی گئی کہانیاں ہیں۔ ثقافتی انضمام، بیگانگی، اور روایت اور جدیدیت کے درمیان تصادم جیسے موضوعات ان بیانیوں میں مرکزی محرکات کے طور پر ابھرتے ہیں۔ رشید امجد کے افسانے "مٹی کی مہک" میں دیہی زندگی، شہری زندگی اور دیارِ غیر کی زندگی کا ایک موازنہ ملتا ہے۔ عوام کی شہروں سے رغبت متنوع نقطہ نظر کے تحت رہی خاص طور پر معاشی مواقع اور تعلیم تک رسائی کی سہولیات کے پیش نظر لوگوں نے شہروں کا انتخاب کیا۔ افسانے کے سیاق میں بیان کیا گیا ہے کہ روزگار کی تلاش میں پہلے لوگ گاؤں سے شہروں کی طرف آئے اور اب جب شہروں میں بھی روزگار کے مواقع کم ہونے لگے تو لوگوں نے ملک سے باہر پناہ تلاش کی اس طرح افراد کے خیالات، عقائد اور طرز زندگی میں تبدیلی آئی جس نے معاشرتی اقدار کی تبدیلی میں حصہ ڈالا۔ دیہی اور شہری اقدار کے درمیان تصادم، نسلی تقسیم اور غیر مانوس ماحول میں تعلق کے احساس کی جستجو ادب میں بار بار آنے والے موضوعات ہیں جو ہجرت کے اثرات کو اجاگر کرتے ہیں۔ "مٹی کی مہک" افسانے سے اقتباس ملاحظہ ہو:

> "شہر آئے تو بھی اڑوس پڑوس موجود رہا، گاؤں جیسی رفاقت، قربت اور اجتماعی چس تو نہ تھی لیکن پھر بھی کچھ نہ کچھ تو تھا، کئی برس اپنے فلیٹ میں رہتے ہوئے آس پاس کے فلیٹوں کی کچھ نہ کچھ خبر ضرور تھی، آتے جاتے سلام دعا۔۔۔"(۲۶)

شہروں کی طرف ہجرت تبدیلی کا ایک ایسا تجربہ ہے جس سے نہ صرف جسمانی ماحول بلکہ افراد کے ذہنی اور جذباتی احساسات بھی متاثر ہوئے۔ گاؤں کے ماحول میں اجتماعی دکھ سکھ، قربت کا احساس پایا جاتا تھا شہروں میں یہ اقدار بھی تبدیل ہو گئیں جس نے لوگوں کو ایک دوسرے سے جوڑے رکھا تھا۔ ہجرت کا تجربہ چاہے اندرونی ہو یا بین الاقوامی چیلنجوں سے بھرا ہوا نظر آتا ہے۔ اس پس منظر میں ترتیب دیے گئے افسانے بیگانگی، نقل مکانی، اور فرد میں ذات کی تلاش کی جستجو جیسے مسائل کو اجاگر کرتے ہیں۔ افسانہ نگاروں نے قارئین کو ہجرت کے دھاروں میں پھنسے لوگوں کی ذاتی جدوجہد اور کامیابیوں کے بارے میں ہمدردانہ بصیرت فراہم کی ہے۔

> "شہر واقعی انسان کی چھپی صلاحیتوں کو کھوج نکالتے ہیں اور اجاگر کر دیتے ہیں مجھے تو اپنے وجود کی قیمت کا احساس ہی نہ تھا یہ شہر ہی ہے جس نے میری صلاحیتوں کو کیش کر کے اک بھاری رقم میرے ہاتھ میں تھما دی ہے۔" ابا! اب تم ایک کماؤ بیٹے کے باپ ہو اب چودھریوں سے ڈرنے یا ان سے مانگنے کی ضرورت نہیں ہے۔"(۲۷)

شہری ماحول ذاتی ترقی اور کسی بھی فرد کی صلاحیت کے ادراک کے لیے ایک پلیٹ فارم مہیا کرتا ہے۔ طاہرہ اقبال نے اس افسانے (اوکاں والا سکول) میں شہری زندگی سے وابستہ معاشی مواقع کی نشاندہی کی ہے۔ شہر متنوع پیشوں، صنعتوں اور کاروباری اداروں کے لیے مراکز کا کام کرتے ہیں، جو افراد کو مالی فائدہ اور پیشہ ورانہ کامیابی کے لیے اپنی صلاحیتوں کو بروئے کار لانے کا موقع فراہم کرتے ہیں۔ کمانے والا بیٹا بننے کا ذکر اور باپ کو یہ یقین دہانی کہ اب چوہدریوں (زمینداروں یا بااثر شخصیات) سے ڈرنے یا بھیک مانگنے کی ضرورت نہیں ہے، سماجی و اقتصادی حیثیت میں تبدیلی کی نشاندہی کرتا ہے۔ دیہی سے شہری نقل مکانی کے تناظر میں یہ بیانیہ فرد کو نہ صرف معاشی طور پر بااختیار بنانے بلکہ خود مختاری اور خود انحصاری کے احساس کی بھی علامت ہے۔ خاندانی حرکیات اور سماجی ڈھانچے پر شہر کاری کے وسیع تر مضمرات کو اجاگر کرتے ہوئے شہری ماحول خود ان کہانیوں میں ایک کردار بن جاتا ہے۔ شہروں میں آنے کے بعد انسان کی پرانی یادیں اور اقدار بھی شہر کی مصروف ترین زندگی میں کھو جاتی ہیں۔ سلیم الرحمٰن افسانہ "ہونٹ کنارے" کا مرکزی کردار اپنی جوانی کے دنوں میں گاؤں سے شہر تعلیم حاصل کرنے کی غرض سے آیا تھا اور اس وقت وہ اپنے ساتھ گاؤں کی محبت زیتون کی یاد بھی ٹرنک میں لے آیا تھا لیکن شہر میں تعلیم حاصل کرنے کے بعد شہر میں ہی اسے اچھی پوسٹ پر ملازمت مل جاتی ہے جس کے بعد شہر کی رونق اور مصروف زندگی نے اسے کبھی گاؤں کا رخ نہ کرنے دیا۔ رشتے دار احباب

سب کھو گئے جس کا دل چاہتا ہو سلیم الرحمٰن سے ملنے شہر آ جاتا۔ یہاں تک کہ وہ ٹرنک جو ابتدائی دنوں میں وہ اپنے ساتھ لایا تھا وہ بھی ٹین کے بھاؤ بک گیا۔ انسان کو شہری زندگی کی ہو ہاؤ میں اتنا وقت میسر نہیں ہوتا کہ وہ پلٹ کر اپنے رشتوں کے لیے وقت نکال سکے یہاں تک کئی سالوں بعد بہن کے جنازے پر جانے کے لیے سلیم بامشکل وقت نکالتا ہے۔

> "گاؤں جانا ضروری تھا۔ ڈیجیٹل ڈائری کھول کر اس نے اپنے معمولات اور شیڈول کو دیکھا۔ بیرونِ ملک دورے اور بہن کے جنازے کے اوقات کو جمع تفریق کیا۔ جنازہ پڑھ کر فلائٹ پکڑی جاسکتی تھی۔ فاصلوں کی پیمائش کے بعد اس نے بہنوئی کو فون کیا کہ وہ جنازے میں پہنچ رہا ہے۔ اس کے شعور میں ایسی کسی تاریخ کا اندراج نہیں تھا کہ وہ کتنے برس بعد اپنے گاؤں جا رہا ہے۔"(۲۸)

نقل مکانی کے خاندانی ڈھانچے اور اس کی حرکیات پر گہرے اور کثیر جہتی اثرات مرتب ہوئے، جس کی وجہ سے مختلف سطحوں پر متعدد تبدیلیاں آئی ہیں۔ نقل مکانی دیہات سے شہروں کی طرف ہو یا شہروں سے مختلف خطوں یا ممالک میں اس سے خاندان کے افراد میں جسمانی دوری پیدا ہوئی۔ یہ دوری اس قدر بڑھ گئی کہ فرد کی ترجیحات وہ رشتے نہ رہے جو پہلے کبھی ہوا کرتے تھے۔ ہجرت نے خاندانوں کو نئے ثقافتی ماحول سے روشناس کروایا یوں خاندانوں کو ایک مختلف ثقافتی تناظر میں ضم کرنے کی ضرورت پڑی، جس کے نتیجے میں نئے رسم و رواج، زبانیں اور معاشرتی اصول اپنائے جانے لگے اور فرد نے اپنا معیار زندگی بھی تبدیل کر لیا۔ اس صورت حال کو محمد حمید شاہد کے افسانے سے منتخب اس حصے میں دیکھیے:

> "بشارت کا باپ مر گیا تو اس نے ساری زمینیں بیچ ڈالیں اور شہر میں آ کر بس گیا۔ یہی اس کے خاندان سے کٹتے چلے جانے کی وجہ بنا۔ اس نے شہر میں شیخوں کے خاندان میں شادی کر لی تو برادری نے جیسے اس کی طرف دیکھنا ہی چھوڑ دیا تھا۔ وہ برادری سے ویسے بھی بے نیاز ہو گیا تھا اور اپنی زندگی میں مگن تھا۔"(۲۹)

آبائی زمینیں بیچنے اور شہر میں آباد ہونے کا فیصلہ روایتی زرعی جڑوں سے علیحدگی کی عکاسی کرتا ہے جو دیہی سے شہری زندگی کی طرف وسیع تر معاشرتی تبدیلی کا عکاس ہے۔ معاشی تبدیلیاں اور تبدیل شدہ خاندانی ڈھانچے کی عکاسی کے لیے یہ افسانے عصری سیاق و سباق میں سماجی اقدار کے ارتقاء کی بھرپور عکس بندی کرتے ہیں۔ اس مطالعے سے نقل مکانی کی جو وجوہات سامنے آئی ہیں ان میں بیرون ممالک اور شہروں میں روزگار

کے مواقع، جدید سہولیات، بہتر تعلیم و تربیت اور وسیع کاروباری سہولیات اہم ہیں۔ نوجوان نسل پرانی نسل کے مقابلے میں زیادہ تیزی سے ترقی کے اثرات قبول کرنے لگی۔ نقل مکانی خاص طور پر شہری علاقوں کی طرف اور دیکھتے ہی دیکھتے شہروں سے بیرون ممالک ایک ایسی قوت ہے جو اکیسویں صدی کے افسانوں کے بیانیہ منظر نامے کو تشکیل دے رہی ہے۔ مبین مرزا کے افسانوی مجموعے "زمینیں اور زمانے" کے اکثر کردار دیار غیر میں جا بسے ہیں یا جانے کے عمل سے گزر رہے ہیں۔ مثلاً افسانہ "بھولی بسری عورت" کا مرکزی کردار طارق امریکا سے واپس آتا بھی ہے تو یہاں صرف اپنی زمینوں کے معاملات دیکھنے، افسانہ "اجنبی موسم" کا کردار منور نہ صرف امریکا مقیم ہے بلکہ مشرقی اقدار بھی بھول چکا ہے، افسانہ "دہری سزا" میں احتشام اعلیٰ تعلیم کے حصول کی غرض سے یو کے چلا جاتا ہے، افسانہ "واٹس ایپ" میں روبینہ اپنی بیٹی کے ساتھ کینیڈا منتقل ہو رہی ہے، "یخ رات کا ٹکڑا" میں فہمی سعودی عرب چلا جاتا ہے۔ ڈاکٹر سلیم آغا قزلباش ان افسانوں پر اظہار خیال کرتے ہوئے کہتے ہیں:

> "افسانوں کے زیادہ تر کردار شہری زندگی سے وابستہ ہیں۔۔۔ اکثر غیر ممالک میں جا کر آباد ہو چکے اور کچھ ایسے ہیں جو وہاں جانے کے لیے کمربستہ ہیں۔ یہ پہلو اس جانب واضح اشارہ کرتا ہے کہ دنیا ایک گلوبل ولیج بن چکی ہے اور خاص طور پر برصغیر پاک و ہند کے لوگوں کا عرب اور مغرب کے ممالک میں جا بسنے کا رجحان افزوں تر ہو گیا ہے۔ گویا زمینی فاصلے سمٹ رہے ہیں، مگر ذہنوں اور رشتوں کے درمیان دوریاں بڑھتی چلی جا رہی ہیں۔"(۳۰)

یہ افسانے معاشرتی اقدار میں ہونے والی گہری تبدیلیوں کو اجاگر کرنے میں معاون ہیں، جو افراد اور برادریوں میں وسیع تر معاشرتی تانے بانے پر ہجرت کے اثرات کو اجاگر کرتے ہیں۔ ادیبوں نے روایت اور جدید معاشرے میں پائی جانے والی تبدیلی کی قوتوں کے پیچیدہ تعامل کو اجاگر کیا ہے۔ نقل مکانی کی یہ صورت حال بیسویں صدی کے ادب میں بھی دیکھی جا سکتی ہے لیکن تلاشِ معاش اور اقتصادی تضادات نے فرد کو نہ صرف دیہات سے شہروں کا رخ کرنے بلکہ بیرون ممالک کی راہ اختیار کرنے کی سوچ کو تقویت دی۔

د۔ اکیسویں صدی میں رونما ہونے والے حادثات و وقوعات اور اردو افسانہ

حادثات کسی بھی معاشرے پر گہرے اور دیرپا اثرات مرتب کر سکتے ہیں جس کی وجہ سے افراد کے رویوں اور اقدار میں بھی تبدیلی رونما ہوتی ہے۔ لیکن کسی بھی واقعے کے اثرات کا انحصار اس واقعے کی نوعیت

پر ہوتا ہے جو ملکی حالات کے پیش نظر حکومت اور اس ملک کی عوام کے رد عمل کے طور پر عیاں ہوتا ہے۔ کچھ حادثات و واقعات ایسے ہوتے ہیں جو دیرپا اثر چھوڑتے ہیں اور کچھ وقتی اثرات مرتب کرتے ہیں۔ اکیسویں صدی کے دو بڑے واقعات جس نے پاکستانی معاشرے کو واضح تبدیلیوں سے دوچار کیا اور اس کے دُوررس اثرات معاشرے پر ثبت ہوئے۔ ذیل میں ان کا مطالعہ اکیسویں صدی کے افسانوں کی روشنی میں پیش کیا گیا ہے۔

پاکستان کی معاشرتی اقدار میں تغیر پیدا کرنے والے واقعات میں سب سے بڑا سانحہ جو پاکستان سے کوسوں دور رونما ہوا لیکن اس کے دوررس اثرات دیگر ممالک کے علاوہ پاکستان پر بھی مرتب ہوئے وہ ۱۱ ستمبر ۲۰۰۱ء کا حملہ ہے جسے عام طور پر نائن الیون کے نام سے جانا جاتا ہے۔ گو کہ یہ المناک واقعہ پاکستانی سرزمین سے بہت دور رونما ہوا لیکن اس واقعے کے ملک کی معاشرتی اقدار پر بڑی سطح پر برے اثرات مذہبی، سیاسی اور معاشی سطح پر رونما ہوئے نیز عام شہری زندگی کا سکون غارت ہوا۔ ۹/۱۱ کے بعد مذہبی منظر نامے میں اہم تبدیلیاں آئیں۔ خاص طور پر قوم مذہبی لحاظ سے دو حصوں میں بٹ گئی ایک روشن خیال طبقے کے ساتھ تھی اور دوسرا طبقہ وہ تھا جو منطق اور دلیل سے کام لینے کے بجائے دقیانوسی تصورات پر اٹکا ہوا تھا۔ عراق اور افغانستان پر امریکہ کے حملے شدت سے پاکستان کو متاثر کر رہے تھے۔ مسلمانوں کو شک کی نگاہ سے دیکھا جا رہا تھا۔ یہی وجہ بنی کہ پاکستان سمیت عالمی سطح پر مسلمانوں کی تلاشی لی جانے لگی اور دقیانوسی تصورات میں اضافہ ہوا۔ ڈاکٹر نجیبہ عارف نے اس واقعے کے فکشن پر مابعد اثرات پر بات کرتے ہوئے اس تغیر کی طرف بھی اشارہ کیا ہے جو ان حالات کے بعد شدت پسندی کی بڑھتی ہوئی لہر جس سے اسلامی شناخت خاص طور پر ڈاڑھی، نقاب اور جہاد کا تصور متاثر ہوا ان تصورات کو ادیبوں نے اپنی تحریروں میں سمویا۔[۳۱]

سیاسی طور پر، پاکستان دہشت گردی کے خلاف جنگ میں امریکہ کے ساتھ صف بندی کرتے ہوئے بین الاقوامی رد عمل میں امریکہ کا کلیدی اتحادی بن گیا۔ اس صف بندی کے مقامی طور پر پیچیدہ مضمرات تھے جو سیاسی حرکیات اور معاشرتی تصورات کو متاثر کرتے تھے۔ شراکت داری نے پالیسیوں، سفارتی تعلقات اور اندرونی حرکیات کو متاثر کیا، جس سے پاکستان کے اندر ایک پیچیدہ سماجی و سیاسی ماحول پیدا ہو گیا۔ اقتصادی طور پر پاکستان کو اپنی جغرافیائی سیاسی پوزیشن کی وجہ سے چیلنجوں کا سامنا بھی کرنا پڑا، جس کی وجہ سے پاکستان علاقائی عدم استحکام کے اثرات سے دوچار ہوا۔ ان حالات کی چھاپ اکیسویں صدی کے تقریباً ہر افسانے پر دیکھنے کو ملتی ہے۔ اس حوالے سے تحریر کیے گئے افسانوں میں فرد کی زندگی کے رنج والم اور نشیب و فراز کی داستان ملتی

ہے۔ حمید شاہد کے افسانے "سوَرگ میں سوَر (تمثیلی انداز میں پاکستان کے سیاسی حالات اور عالمی منظر نامے میں ۹/۱۱ کے بعد تشکیل پانے والے معاشرے کا عکاس)"، "لوتھ (نائن الیون کے ساتھ ساتھ مادیت پرستی کی وجہ سے کمزور رشتوں کی کہانی)"، "گانٹھ (امریکہ میں مقیم پاکستانی ڈاکٹر کا المیہ)"، "موت منڈی میں اکیلی موت کا قصہ (طاقتور قوتوں کے ہاتھوں ہونے والی اجتماعی اموات کے ڈھیر میں کسی بھی ایک فرد کی موت کا دب جانا اس کہانی کا موضوع ہے)"، "کوئٹہ میں کچلاک"، "جنگ میں محبت کی تصویر نہیں بنتی!"، زاہدہ حنا کے افسانوں میں "منزل ہے کہاں تیری۔۔۔"، "رقصِ مقابر"، "جاگے ہیں خواب میں"، نیلوفر اقبال کا افسانہ "اوپریشن مائس"، "سرخ دھبے (اوپریشن مائس II)"، منشا یاد کا افسانہ "ایک سائیکلوسٹائل وصیت نامہ"، "خواب راستہ"، مسعود مفتی کا افسانہ "آسیب"، رشید امجد کے افسانوں میں "سراب"، "دھنلکا"، "متلاہٹ"، "شہر بدری"، گل زیب عباسی کے افسانوں میں "دہشت گرد"، "ننھا شجیل"، "آپریشن"، "معذور طالبہ"، "بریف کیس"، طاہرہ اقبال کا افسانہ "واکنگ ٹریک۔۔۔ دو کلو میٹر"، سلیم آغا قزلباش کا افسانہ "کوئی جگہ ہے!"، اسد محمد خان کا افسانہ "دھماکے میں چلا ہوا بزرگ"، محمد حامد سراج کا افسانہ "ایک اور داؤ"، کے نام اس حوالے سے خصوصی طور پر لیے جاسکتے ہیں۔ افسانہ "کوئٹہ میں کچلاک" میں محمد حمید شاہد نے بلوچستان کے قریبی قصبے کچلاک کی حالت زار کو موضوع بنایا ہے جس میں راوی کا دوست ملک بشارت ہمیشہ کوئٹہ میں راوی کے ٹھہرنے کا انتظام کرتا تھا یوں راوی کئی مرتبہ وہاں گیا تھا اس طویل بیانیے کے سیاق میں جہاں بدلتی اقدار سموئی گئی ہیں وہیں نائن الیون اور اس کے بعد بدلتے ہوئے حالات کو قلم بند کرتے ہوئے کہتے ہیں:

> "جب سے امریکہ میں نائن الیون والا حادثہ ہوا اور ٹوئن ٹاور سے دو جہاز ٹکرائے اور بدلے میں امریکہ نے عراق اور بعد ازاں افغانستان پر چڑھائی کی تھی، ادھر پاکستان کے ہر شہر میں سیکورٹی کا سامان بیچنے والوں کی چاندی ہوگئی تھی۔ خیر، کہیں کہیں تو واقعی ایسے اقدامات کی ضرورت تھی کہ دہشت گردوں کی کارروائی سے بچا جاسکے۔ بہ طور خاص امریکی ڈرونز کے نہ ختم ہونے والے سلسلے نے دہشت کی ایسی فضا کو جنم دیا تھا کہ کسی وقت کچھ بھی ہو سکتا تھا۔"(۳۲)

ان حملوں نے پاکستان سمیت دنیا بھر کے مسلمانوں پر گہرا اثر ڈالا۔ وسیع پیمانے پر اسلاموفوبیا میں اضافہ دیکھا گیا۔ دنیا کے مختلف حصوں میں مسلمانوں کو شکوک و شبہات اور تعصب کی نظر سے دیکھا جانے لگا۔ پاکستان میں بھی مسلمانوں کی شناخت متاثر ہوئی۔ عالمی بیانیہ چوں کہ اسلام کو دہشت گردی سے جوڑتا ہے،

جس کی وجہ سے ملک کے اندر اور بیرون ملک مسلمانوں کے لیے ایک چیلنجنگ ماحول پیدا ہوا۔ افسانہ "مرگ زار" روس اور افغانستان کی جنگ کے پس منظر میں لکھا گیا۔ اس کہانی کے مرکزی کردار کو اس کے بھائی (مصعب) کی جہاد میں شہید ہونے کی خبر ملتی ہے۔ مصعب کے دل میں شہادت کی موت کی تمنا ہمیشہ سے تھی۔ لیکن قاری جیسے جیسے کہانی کی حقیقت تک پہنچتا ہے تو اس پر موجودہ عہد میں مسلمانوں کے جذبہ ایمانی پر اٹھتے سوالوں کی حقیقت بھی عیاں ہو جاتی ہے جو منظور احمد کے تجزیے کے مطابق درست ہے کہ شہادت کے معنی بدل دیے گئے ہیں استعمار چاہے تو ہماری موت کو بھی شہادت بنا دیتا ہے اور وہ چاہے تو ہماری زندگیوں میں اپنی منشا کے مطابق شہادت کو تہمت بنا دیتا ہے۔ (۳۳)

ایسی ہی صورت حال کی تصویر کشی محمد حمید شاہد نے افسانہ "جنگ میں محبت کی تصویر نہیں بنتی!" کے ذریعے پیش کی ہے۔ اس افسانے کی کہانی میں کہانی کار نے ایک نئے اور اچھوتے انداز میں روای جو خود کہانی کا حصہ ہے اس نے بند آنکھوں کے ساتھ اندھے کردار کی کہانی کو صفحہ قرطاس پر اتارا ہے اس نے نہ صرف نائن الیون بلکہ افغانستان پر امریکہ کی جانب سے کی جانے والی چڑھائی اور اس کے نتیجے میں پاکستان میں پیدا ہونے والے حالات کو موضوع بناتے ہوئے معاشرے کے افراد کی بے حسی کو اندھے پن کی علامت بنا دیا ہے۔ پاکستان میں دہشت گردی کے واقعات معمول سے ہونے لگے تو معاشرے کی وہ اقدار بھی بدل گئیں جو ذرا سا کسی جگہ کچھ ہونے پر کئی دنوں تک سوگ کے سماں کا موجب ہوتی تھیں۔

> "بازار میں دھماکے ہوتے ہیں مگر دکانیں پھر کھل جاتی ہیں۔ مسجدیں، ان کے محراب، ان کے مینار تو ہر کہیں ہیں مگر ان سب کو اپنے ہالے میں لیتا تقدس میری کہانی میں کہیں نہیں ہے کہ یہاں مسجدوں، خانقاہوں، امام بارگاہوں اور دوسری مقدس عمارتوں میں جب دھماکے ہوتے ہیں تو اندر سے لاشیں برآمد ہوتی ہیں۔ ان عمارتوں کا جمال اور جلال ہمارے اپنوں کے بارود بندھے جسموں اور ہمارے اپنوں ہی کی لاشوں نے میری کہانی سے الگ کر دیا ہے۔ ہم سب مارکیٹ کا حصہ ہیں یا پھر اس کا حصہ ہوتے چلے جاتے رہے ہیں۔۔۔" (۳۴)

حمید شاہد کے اس پورے افسانے کا نچوڑ جو ہماری قدروں کے بدل جانے کا نوحہ ہے۔ راوی خود یہ کہنے پر مجبور ہے کہ پوری کہانی میں ابھی تو اس بے حسی کا ذکر کہیں نہیں ہے جس نے ہمارا جلال و جمال پس پشت ڈال دیا ہے۔ کہیں دھماکہ ہو یا ہنگامہ کاروبار اور معمولات زندگی رواں دواں رہتے ہیں۔ یہ ہنگامے ہماری روزمرہ کی

زندگی کا ایسے حصہ بن گئے ہیں کہ کہیں بھی کوئی حادثہ ہو جائے لوگ اس سے بے پروا اپنے روزمرہ کے کاموں میں مشغول رہتے ہیں۔ اس صورت حال کو رشید امجد کے افسانے "شہر گریہ" میں بھی دیکھا جاسکتا ہے۔

"پہلا دھماکہ بہت ہی حیران کن اور بہت ہی اداس کرنے والا تھا۔ کئی گھر اجڑ گئے تھے، سب روئے تھے، چند دن بعد معمول نے اپنی بُکل میں لے لیا۔۔۔ لیکن صرف چند دن، پھر دھماکے خود معمول بن گئے۔"(۳۵)

افسانے میں ابتدائی طور پر دھماکے کے گہرے اثرات ایک چونکا دینے والے افسوس ناک واقعہ کے طور پر اجاگر کیے گئے ہیں جو روزمرہ کی زندگی کے معمول میں خلل ڈالتا ہے۔ گھروں کی تباہی اور ہر ایک کو درپیش اجتماعی غم مشترکہ صدمے اور غم کے احساس کو جنم دیتا ہے لیکن کچھ دنوں بعد کے حالات ان قدروں میں معاشرتی لچک کو ظاہر کرتے ہیں جو ایک بڑے المیے کے باوجود معاشرے میں پائے جانے والی غیر حساسیت کی نشاندہی کرتا ہے۔ ان حالات نے پہلا وار انسان کی اخلاقیات پر کیا۔ ایسے حالات میں فرد کسی انجان کی مدد کرتے ہوئے بھی گھبرانے لگا۔ "شہر گریہ" مکمل طور پر ان حالت کے نچوڑ کو پیش کرتا ہے۔ جیسا کہ بوڑھا شخص جب اپنی گاڑی میں کسی کو لفٹ دیتا ہے تو اسے پتا چلتا ہے کہ اس نے ایک دہشت گرد کو پناہ دی ہے۔

"سفید ریش نے اپنے پیٹ کی طرف اشارہ کیا اور بولا، "اللہ نے تمہیں جنت میں جانے کے لیے چن لیا ہے، جدھر میں کہوں خاموشی سے چلتے رہو، ورنہ۔۔۔"۔۔۔ سفید ریش کے موبائل کی گھنٹی بجی۔ وہ کچھ دیر سنتا رہا، پھر بولا، واپس مڑو، شاید ابھی تمہارے نصیبوں میں جنت نہیں، پروگرام بدل گیا ہے، اگلے موڑ پر مجھے اتار دو خبر دار! پیچھے مڑ کر نہ دیکھنا۔"(۳۶)

"شہر گریہ" میں معاشرتی قدروں میں واضح تبدیلی ہی نظر نہیں آتی بلکہ وہ خوف بھی دندناتا نظر آتا ہے جو بھروسے، یقین، مروت، احساس ہمدردی اور انسانیت جیسی اقدار کو معاشرے میں سے مٹاتا ہوا معلوم ہوتا ہے۔ وہ سماج جہاں بھولے بھٹکوں کو سیدھا راستہ دکھانا، انجان مہمان کو بھی کشادہ پیشانی سے خوش آمدید کہنا اور دوسروں کے دکھ درد میں بلا جھجھک اور بلا تفریق شریک ہونا ایمان کی حد تک اکثریت کے کردار کا حصہ تھا، وہاں دہشت گردی کے الم ناک واقعات نے کسی بھی انجان پر بھروسہ کرنا معاشرے میں ناپید کر دیا۔ متواتر ہونے والے دہشت گردانہ حادثات کے سبب دکھ درد کا احساس بھی ختم ہو کر رہ گیا اور ایسے حادثات ہمارے معاشرے میں پیش آنے والے روزمرہ واقعات کی طرح دیکھے جانے لگے۔ دہشت گردی کے عروج

کے دورانیے میں جب روز اخبار کا صفحہ اول ملک میں ہونے والے دہشت گرد حملوں کی سرخیوں سے لبریز ہوتا، قاری ایسی خبروں کو ایک معمول کے حادثے کے طور پر دیکھ کر آگے بڑھ جاتا۔

خالد فتح محمد کے افسانے "جو چلے تو۔۔۔" میں بھی ملکی حالات اور دھماکوں کی بازگشت سنائی دیتی ہے کہ کیسے اقدار بدل گئی ہیں انسان کہاں سے چلا تھا کہاں پہنچ گیا۔ افسانے کے کرداروں کو جب جن بتا دیتا ہے کہ سمندر کے ساحل پر دھماکہ ہونے والا ہے تو وہ پولیس کو اطلاع دے کر وہاں موجود لوگوں کی حفاظت کرنے کے برعکس اپنی جان بچاتے ہوئے وہاں سے چلے جاتے ہیں۔ اس عمل کے لیے فرد کو مجبور بھی معاشرے نے کیا ہے کیوں کہ اگر وہ بتا دیتے کہ انہیں خبر ہے کہ یہاں دھماکہ ہونے والا ہے تو انہیں ہی ذمے دار سمجھ کر سارے دھماکے ان کے سر تھوپ دیے جاتے:

> "میں نے ایک دم حکام کو مطلع کرنے کا سوچا: "دھماکہ ان کے علم میں ہے۔ آپ کو کیسے پتا چلا کہ یہاں دھماکہ ہونے والا ہے؟ قومی فریضہ نبھاتے نبھاتے آپ دھر لیے جائیں گے اور ملک میں ہوئے تمام دھماکے آپ کے سر پر تھوپ دیے جائیں گے۔"(۳۷)

افسانے کا منظر نامہ ایک ایسے بیانیے کی عکاسی کرتا ہے جہاں افراد کا اداروں پر اعتماد ختم ہو چکا ہے، افراد کو اخلاقی مخمصے اور خوف کے اثرات کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ یہ افسانہ قارئین کو دعوت دیتا ہے کہ وہ معاشرتی ڈھانچے کے اخلاقی مضمرات اور انفرادی فیصلہ سازی پر ان کے اثرات کا جائزہ لیں۔ اسد محمد خان کے افسانوں میں "دھماکے میں چلا ہوا بزرگ" بھی دہشت گردی کے پس منظر میں لکھا گیا افسانہ ہے۔ جس میں بزرگ جو دہشت گرد نہیں تھا لیکن اسے مرا ہوا شہید بزرگ بنا دیا گیا ہے اور جیکٹ پہنا دی گئی۔(۳۸)

دہشت گردی کے واقعات میں سے ایک پاکستان میں پشاور کے آرمی پبلک سکول (اے پی ایس) پر ہونے والے ہولناک حملے کا ہے۔ یہ المناک واقعہ ۱۶ دسمبر ۲۰۱۴ء کو پیش آیا۔ اسکول کو طالبان عسکریت پسندوں نے نشانہ بنایا جس کے نتیجے میں طلبا، اساتذہ عملے کے ارکان سمیت کئی معصوم جانیں شہید ہوئیں۔ اس دن دہشت گرد اسکول کے احاطے میں داخل ہوئے اور ایک وحشیانہ حملہ کیا۔ پشاور میں اے پی ایس حملہ پاکستان کی تاریخ کے مہلک ترین دہشت گردانہ حملوں میں شمار ہوتا ہے۔ اس کے نتیجے میں دہشت گردی سے نمٹنے اور حفاظتی اقدامات کو بہتر بنانے کے لیے دہشت گردی اور انتہا پسندی کے خلاف کوششوں میں اضافہ ہوا۔ ۱۶ دسمبر کو اب پاکستان میں اے پی ایس حملے کے متاثرین کی یاد کے دن کے طور پر منایا جاتا ہے اور یہ تعلیمی اداروں کی حفاظت کو یقینی بنانے کے لیے جاری چیلنجوں اور کوششوں کی یاد دہانی کے طور پر کام کرتا

ہے۔ سید زبیر شاہ کے افسانے "ہجوم مرگ میں زندگی" دہشت گردی اور ۱۶ دسمبر کو ہونے والے آرمی پبلک سکول کے سانحے کو دانیال کی کہانی کے روپ میں قلم بند کرتے ہیں کہ کیسے وہ سکول علم کی روشنی لینے گیا تھا لیکن تاریک ذہنوں سے یہ روشن خالی برداشت نہ ہوئی۔

> یہ سانحہ اتنا شدید تھا کہ جن لوگوں نے دیکھا وہ بینائی سے محروم ہو گئے اور جنھوں نے سنا ان کی سماعتیں جواب دے گئیں۔"۔۔۔"ایک دن دانیال کے سکول سے اس کی کچھ تصویریں اور اس سانحے کے دوران اس بہادری اور ذہانت کی چند باتیں ذہن میں لے آیا۔ وہاں اسے یہ بھی معلوم ہوا کہ دنیا پر اپنی مظلومیت ظاہر کرنے کے لیے اس بار شہدا کی برسی سرکاری سطح پر منانے کا اعلان ہوا اور اس سلسلے میں مغربی میڈیا کو بطور خاص دعوت دی گئی۔"(۳۹)

سید زبیر شاہ نے ہجوم مرگ میں زندگی میں جہاں سانحہ دیکھنے والے لوگوں کو بینائی سے محروم ہوتے اور سانحہ کے بارے میں سننے والے لوگوں کو سماعتوں سے محروم ہوتے ہوئے دکھایا ہے وہیں انھوں نے سرکار کو اس انسانیت سوز واقعہ پر بے حسی کا مظاہرہ کرتے ہوئے پیش کیا ہے۔ وہ حادثہ جس کے نتیجے میں پوری قوم کو یک جان ہو کر دہشت گردوں کے خلاف برسرپیکار ہونے کی ضرورت تھی اور جہاں سرکار کو کسی واضح اور پر اثر حکمت عملی کے تحت دہشت گردوں کی سرکوبی کرنے کی مہم پوری قوت سے شروع کرنے کی ضرورت تھی وہاں بھی ایک واضح لکیر کھینچی ہوئی نظر آتی ہے۔ ایک ایسی لکیر جس کے ایک طرف وہ لوگ ہیں جو حساسیت کے سبب خود کو اسی دکھ میں ڈوبا محسوس کرتے ہیں جس سے وہ گزرے ہیں اور دوسری طرف وہ اشرافیہ ہے جو ایسے واقعات پر بھی اپنے ذاتی فائدے کے پہلو ڈھونڈتی ہے۔ افسانہ "غالب خستہ کے بغیر" میں رشید امجد نے بھی دہشت گردی کے سکولوں میں ہونے والے واقعات کو سمویا ہے۔ جس میں ایک بچے کی ماں کی کیفیت اور بچوں کے گھر والوں پر گزرنے والے حالات کو موضوع بنایا گیا ہے۔

> "موبائل کی گھنٹی پھر بجی، بیوی کہہ رہی تھی۔۔۔اور اس کی آواز میں رونا اور خوشی دونوں شامل تھے۔۔۔"بہت سے بچے مارے گئے لیکن شکر ہے کہ سمیرا اور عائشہ دونوں ٹھیک ہیں، ابھی سکول کے اندر ہی ہیں، میں وہیں جا رہی ہوں آپ بھی فوراً پہنچیں۔"(۴۰)

رشید امجد نے اسی الم ناک حادثے کا نقشہ کھینچا ہے جہاں ننھے بچوں کو سفاکانہ حملوں کا نشانہ بنایا گیا۔ ایک ہی حملہ میں حادثے کا شکار ہونے والوں کو دہائیاں دیتے اور حادثے میں بچ جانے والوں کا شکر ادا کرتے ہوئے دکھایا گیا ہے۔ یہ تفریق بھی معاشرتی رویوں میں تبدیلی کا واضح ثبوت ہے۔ جان لیوا حملوں میں بچ جانے والے جان سے جانے والوں کے دکھ اور کرب سے کہیں دور اس الم ناک حادثے میں بچ جانے کو غنیمت جان کر الگ کھڑے نظر آتے ہیں۔ رشید امجد نے اُن رجحانات کی طرف بھی اشارہ کیا ہے جو پاکستان میں بسنے والے افراد کے رویوں میں تبدیلی کا سبب بنے ہیں۔ ان حالات کے مغربی ممالک میں پاکستان اور مسلمانوں کے خلاف پیدا ہونے والے تاثر اور پاکستانی عوام کی حالت زار کو مغربی عوام کے دلوں میں پائے جانے والے خدشات کو امریکہ میں مقیم پاکستانی بزرگ اور امریکی بچے کی گفتگو میں آشکار کیا ہے۔

"اوہ، پاکستان، وہاں تو ہر وقت ڈزڈز ہوتی ہے اس نے انگلیوں سے پستول کی شکل بنائی اور ڈزڈز کی آوازیں نکالنے لگا، پھر خوب ہنسا۔

وہاں اتنے دھماکے کیوں ہوتے ہیں؟ اس نے معصومیت سے پوچھا۔

جی چاہا کہ کہوں کہ تمہاری ہی مہربانیوں سے، تم ہی تو انہیں پیسے دیتے ہو، لیکن چپ رہا، تا دیر چپ، پھر بولا۔۔۔ یہ تو کسی کو بھی معلوم نہیں، ان کو بھی نہیں جو یہ سب کچھ کرتے ہیں۔"(۴۱)

پاکستان سے دور بسنے والے غیر ملکیوں کے نزدیک پاکستان کا منفی تصور اس قدر راسخ ہو چکا ہے کہ وہ یہاں ہونے والے دھماکوں پر بھی تضحیک آمیز قہقہے لگاتے دکھائی دیتے ہیں۔ پاکستان میں لگائی جانے والی آگ کے پیچھے سازش اور دولت انہی مغربی ممالک کی ہوتی ہے مگر اہل مغرب بھی اس سازش سے ناواقف پاکستان اور پاکستانیوں کے بارے میں ایک عقیدہ راسخ کر لیتے ہیں۔ غیر ملکیوں کا یہ تصور بھی پاکستانی معاشرے میں بسنے والے افراد کے سماجی رویوں میں تبدیلی کا سبب بنتا ہے۔ سید زبیر شاہ لکھتے ہیں:

"حالات اتنے کشیدہ ہو گئے کہ اپنے ہی لوگ عبادت خانوں میں جانے سے کترانے لگے۔ وحشی پن اور ظلم و بربریت کی نئی نئی مثالیں قائم ہو رہی تھیں۔ مخلوق نے خالق کو اس کے ہی گھر سے دربدر کر دیا، بہادری اور جواں مردی کے انوکھے کرتب پیش کیے جا رہے تھے، ہر طرف زندگی رو رہی تھی، درد کراہ رہا تھا۔"(۴۲)

مسلمانوں کے خلاف امتیازی سلوک، تعصب اور تشدد پسندی میں اضافے کے نتیجے میں حالات اتنے کشیدہ ہو گئے کہ مسلمان نماز کے لیے مسجد تک جانے سے کترانے لگے۔ عوامی رویوں میں اس قدر تبدیلیاں آئیں کہ خوف و ہراس کی فضا لوگوں کے دلوں میں سما گئی، ایک فرد دوسرے پر اعتبار کرتے ہوئے اس کی مدد کرتے ہوئے گھبرانے لگا ہے تو دوسری طرف لوگ دقیانوسی تصورات کا مقابلہ کرنے کے لیے مختلف سرگرمیوں میں مشغول ہوئے۔ ایسی تحریکوں نے مختلف عقائد اور پس منظر کے لوگوں کے درمیان افہام و تفہیم کو فروغ دیتے ہوئے اسلاموفوبیا سے نمٹنے اور اس کا مقابلہ کرنے کی کوشش کی۔ ان حالات کے نتیجے میں مذہبی اداروں میں کثیر جہتی تبدیلیاں آئیں جنھوں نے روایتی مذہبی اقدار کو پس پشت ڈال دیا۔ جہاد تک کا تصور بدل دیا گیا۔ دہشت گرد تنظیموں کے ذہنوں میں یہ نقش کیا گیا کہ وہ جو کچھ کر رہے ہیں وہ جہاد ہے اور جہاد سے بڑھ کر کچھ نہیں اس کا صلہ شہادت ہے۔ اس پوری صورت حال کو منشایاد نے مختصر افسانے جہاد میں پیش کیا ہے۔ افسانے کا یہ حصہ ملاحظہ ہو:

"وہ جہاں بھی ہیں انھیں واپس لے آؤ۔ انھیں مشن مکمل کرنے کا ثواب ملے گا"

"میں کوشش کرتا ہوں حضور۔۔۔ مگر ابوصالح بہت جوشیلا ہے۔ شہادت سے کم مرتبے پر راضی نہ ہو گا"

"اسے بشارت دو کہ اللہ نے اس کی شہادت قبول کر لی"

"ٹھیک ہے حضور۔ مگر جہاد؟"

"جہاد بند کرنے کا حکم آیا ہے"

"کہاں سے؟"

وحی کے ذریعے؟"

"نہیں وائرلیس پر"(۴۳)

افسانہ دہشت گرد بنائے گئے سادہ لوح ذہنوں کا مکمل عکاس ہے۔ ان حالات نے پورے معاشرے کو اپنی لپیٹ میں لے لیا جس سے بچوں کی نفسیات بھی اثر انداز ہوئیں۔ انہوں نے عام اور سادہ کھیلوں یا بچپن کے چور پولیس کھیل کے مقابلے میں اب دہشت گرد اور کمانڈرز کے مابین ہونے والا مقابلہ بچوں کا کھیل بن گیا ہے۔ ٹریننگ افسانے میں بچوں کے کھیل کے ذریعے معاشرے میں دہشت گردی کے حوالے سے بڑھتے ہوئے رجحان کی عکاسی کی گئی ہے کہ کیسے عوام ان حالات سے بے خبر ہے اب ایسے واقعات کو منظر عام پر لانا

میڈیا کے لیے بھی معمول کی خبر بن گئی ہے اور وہ بھی ایسی خبروں کی طرف کم توجہ دینے لگے ہیں۔ بچوں نے کھیل کے ذریعے دہشت گرد تنظیم کو بے بس اور کمانڈرز پر حاوی ہوتے ہوئے دکھایا ہے۔ بچوں نے اس کے لیے خود کو دہشت گرد کے روپ میں تیار کرنے کے لیے سکول کا بستہ پہن رکھا تھا، گرمی کے موسم میں بھی گرم ٹوپی میں سوراخ کر کے منہ پر چڑھا رکھے ہیں، کھلونے والی بندوق اور پستولیں اٹھائی ہوئی میں باقی کام وہ اپنی آوازوں سے لے رہے ہیں۔

> "ایک عجیب بات یہ بھی تھی کہ اس قدر پر ہول اور متوجہ کرنے والا منظر نامہ اسٹریٹ کے آس پاس۔۔۔ گھروں کی چھتیں خالی تھیں جیسے کچھ ہو ہی نہیں رہا۔ یہاں تک کہ کئی پولیس موبائلز بھی گزری تھیں لیکن ایسی بے اعتنائی کے ساتھ جیسے کچھ ہو ہی نہیں رہا۔۔۔ سب کے لیے شاید یہ ایک معمول کی کاروائی تھی۔۔۔ جبکہ بہت کچھ ہو رہا تھا۔۔۔"(۴۴)

ٹریننگ افسانہ میں اس بات کی نشان دہی کی گئی ہے کہ کس طرح دہشت گرد کے تصور نے بچوں تک کی نفسیات کو متاثر کیا۔ ہاتھ میں پستول تھامے ہوئے ایک فرد جو معاشرے میں تباہی پھیلانے کا ارادہ رکھتا ہے، کس طرح تربیت یافتہ اہلکاروں پر غلبہ پا کر اپنے مقاصد کو پورا کرتا ہے۔ اس افسانے میں اس پہلو کی بہترین انداز میں عکاسی کی گئی ہے۔ دہشت گرد طاقت کا مرکز و محور ہونے کی وجہ سے بچوں کے کھیلوں میں بھی مرکزی کردار کا حامل ٹھہرا۔ ان حالات کا اثر ہر فرد کی نفسیات اور معاشرتی زندگی پر پڑا۔ مثال کے طور پر زاہدہ حنا کے افسانے "جاگے ہیں خواب میں" کا یہ ٹکڑا دیکھیے:

> "وہ جب تک جاگتی رہتی سب کچھ ٹھیک رہتا لیکن بستر پر لیٹتے ہی مرتے ہوئے لوگوں کی چیخیں، خون کی بساند، دیواروں اور پیڑوں سے چپک جانے والے انسانی بدن کے چیتھڑے اس کا تعاقب کرنے لگتے۔۔۔ وہ چیخیں مارتے ہوئے اٹھ کر بیٹھ جاتی، چہرہ آنسوؤں سے تربتر۔"(۴۵)

ان حالات کا بیان ابھرتے ہوئے سماجی منظر نامے کی تشکیل میں اہم کردار ادا کرتا ہے۔ اس نے اجتماعی شعور کو متاثر کیا۔ بحیثیت مجموعی ہماری وہ اقدار جو مذہبی اور اخلاقیات کا درس دیتی تھی وہ بری طرح متاثر ہوئیں۔ اکیسویں صدی میں رونما ہونے والے بڑے واقعات جو ایک بڑی تبدیلی کا موجب بنے اور ان کی وجہ سے ہماری معاشرتی قدروں میں بھی تغیر رونما ہوا، ان میں دوسرا بڑا محرک انسانی تاریخ کا کرب ناک واقعہ

عالمی سطح پر متاثر کرنے والا وائرس کورونا ہے، جسے کووڈ۱۹ کا نام بھی دیا جاتا ہے۔COVID-19 وبائی مرض نے دنیا بھر کے معاشروں پر گہرے اثرات مرتب کیے، اس نے زندگی کے مختلف پہلوؤں بشمول اقدار اور ترجیحات کو بھی متاثر کیا ہے۔ یہ ایک ایسی وبا تھی جس کے باعث دنیا بھر میں کئی انسانی جانیں اس جہان فانی کو الوداع کر گئیں۔اس وبا اور اس کے مقامِ افزائش کے بارے میں مختلف آرا ملتی ہیں۔عام طور پر اس کی ابتدا ۲۰۱۹ء میں چین کے شہر ووہان سے بتائی جاتی ہے۔چین کے بعد یہ وبا پھیلتے پھیلتے دنیا بھر میں پھیل گئی۔بظاہر تو کورونا فرد کے نظام تنفس کو متاثر کرتا لیکن یہ حملہ اس قدر شدید ہوتا کہ مریض کو بستر مرگ تک پہنچا دیتا اور اس سے متاثر ہونے والے افراد میں بچے، بڑے، بزرگ غرض کہ اس نے ہر عمر کے افراد کو اپنا شکار بنایا۔ یہ وبا اس قدر وبال جان بن گئی کہ نظام زندگی دُوبھر ہو گئی۔ تعلیمی سرگرمیاں، کاروبار، مساجد، عبادت گاہیں، شادی بیاہ کی تقاریب سب کچھ متاثر ہوا۔انسان ڈپریشن میں مبتلا بے بس، لاچار، خوف و ہراس اور بے یقینی کی کیفیات سے دوچار ہو گیا۔اس وبا کے باعث ہر شے متاثر ہوئی۔چوں کہ یہ وائرس ایک انسان سے دوسرے تک منتقل ہونے میں وقت نہیں لگاتا تھا ایک شخص اگر اس سے متاثر ہوتا تو آس پاس کے ہر فرد میں اس وائرس کی تشخیص ہوتی اور تیزی سے پھیلنے کا خطرہ ہوتا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ اس سے بچاؤ کے لیے مختلف تدابیر اختیار کی گئیں سب سے بڑھ کر ملک میں لاک ڈاؤن لگا دیا گیا۔اس وبا کے اثرات کو مولانا محمد ناظم ندوی نے ان الفاظ میں بیان کیا ہے:

> "فطرت کو چیلنج کرنے والے اس وائرس نے نظام زندگی کو بدل ڈالا، معاشرت کے اطوار اور قدریں بدل ڈالیں، زندگی میں ایسی کوفت، تلخی اور ذہنی کشمکش سے کبھی واسطہ نہیں پڑا۔۔۔لیکن اس کورونا وائرس کے دامن اور اس کے جیب و گریبان میں بیماری سے لڑنے کے ساتھ ساتھ نیا فلسفہ، نئے افکار و اقدار، نیا عالمی نظام، الحاد و تشکیک کا نیا لشکر اور مادیت و مادہ پرستی کا ایک نیا مذہب ہے، جس کی سرپرستی یہودی تنظیمیں اور جدید ٹیکنالوجی کے پردے میں دجالی طاقتیں کر رہی ہیں۔"(۴۶)

ایسے حالات میں جب ایک دوسرے سے سلام و مصافحہ کو بھی احتیاطی تدابیر میں شامل کیا گیا تھا، ماسک پہننا اور ایک دوسرے سے فاصلے پر رہنا لازمی قرار دیا گیا ان حالات نے ہمارے رویوں کو تبدیل کیا اور معاشرتی قدروں کو متاثر کیا۔ جہاں معاشرے میں دیگر بہت سی تبدیلیاں آئیں وہیں سارا تعلیمی نظام آن لائن منتقل ہو گیا اور تعلیمی میدان میں ٹیکنالوجی کا عمل دخل بڑھ گیا جس کے اثرات کورونا وبا کے ختم ہونے کے بعد

بھی قائم رہے۔ اس وبا کے اثرات سے پہلے لوگوں کا میل جول اور طرح کا تھا بیمار ہونے والے کی عیادت کو جانا ضروری خیال کیا جاتا تھا لیکن یہاں کچھ احتیاطی تدابیر کی روشنی میں اور کچھ لوگوں میں پائے جانے والے خوف نے اس مشکل وقت میں متاثر ہونے والے فرد کی عیادت کے لیے جانا تو دور متاثرہ افراد کے خاندان سے بھی دوری برتی۔

اردو افسانوی نثر کی صنف افسانے میں اگر کسی نے کورونائی صورت حال کو قلم بند کیا ہے تو اس سلسلے میں غلام رسول کا نام نہ صرف سر فہرست ہے بلکہ نایاب ہے۔ غلام رسول کا قلمی نام خاور چودھری ہے۔ انہوں نے اپنے افسانوی مجموعے "طلسم کہن" کے ذریعے ایسی کہانیاں تخلیق کیں جن کی بدولت ان کے افسانوں کا یہ مجموعہ کورونا کے تناظر میں عالمی سطح پر اولیت کا درجہ رکھتا ہے۔ اس مجموعے میں شامل کہانیوں کے ذریعے انہوں نے عالمی وبا کے دنوں کی تاریخ، پاکستان کے حالات، غیر ملکی پاکستانیوں کی مشکلات، خوف و ہراس اور وبا کے باعث بدلتے سماج، اقدار و روایات کو اس طرح سے اجاگر کیا ہے کہ مستقبل میں یہ کہانیاں تاریخ دانوں کے لیے اس دور کے حالات کی حقیقی صورتوں کو اجاگر کرنے کے لیے بنیادی مآخذ کا کردار ادا کریں گی۔ "طلسم کہن" پر گفتگو کرتے ہوئے محمد حمید شاہد کا یہ بیان کہ "کووڈ۱۹ کی پیش قدمی رکی نہیں اور ابھی اس کے رک جانے کے آثار بھی نظر نہیں آ رہے۔ یہ وبا نہ جانے کتنوں کے کلیجے چبا کر ٹلے گی۔"[۴۷] سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ جب یہ کہانیاں قلم بند ہوئی ہیں تب وبا جیسی آفت سے بچنے کے آثار نظر نہیں آ رہے تھے ان حالات میں لکھی گئی کہانیاں وبا کے دنوں کی مکمل عکاس ہیں۔ عامر سہیل نئے کورونائی معاشرے اور طلسم کہن کی کہانیوں کے متعلق لکھتے ہیں:

> "طلسم کہن اس اعتبار سے لائق توجہ ہے کہ اس میں شامل تمام افسانے کرونائی صورت حال سے پیدا ہونے والی نئی سماجی زندگی کا بھرپور عکس پیش کرتے ہیں۔۔۔ یہ مجموعہ قاری کی فکر کو بار بار جھنجھوڑنے کی صلاحیت بھی رکھتا ہے اور اس نئی سماجی دانش میں اپنے کردار پر نظر ثانی کی طرف مائل بھی کرتا ہے۔"[۴۸]

ان حالات کی عکاسی خاور چودھری کے افسانے "ادھوری تصویر" میں اس طرح سے کی گئی ہے:

> "ہر طرف سے روح فرسا خبریں سننے کو ملتی تھیں۔ کاروبارِ زندگی معطل ہونے جا رہا تھا۔ کئی ملکوں نے اپنی سرحدیں بند کر دی تھیں اور کئی ممالک فیصلہ کرنے والے تھے۔"[۴۹]

ان کے افسانے "چراہ گاہ" میں وبا کے دنوں میں لوگوں کی معمولات زندگی کا نقشہ کھینچا گیا ہے۔ وبا کے دنوں میں پہرے کی سختی، لوگوں کا گھروں میں دبک کر بیٹھ جانا، باہر کی دنیا سے لوگوں کی کنارہ کشی کے ساتھ ساتھ اس پہلو کو بھی اجاگر کیا ہے کہ ان لوگوں کو جن کو ایک نظر دیکھنے کے لیے بھی انسان بے قرار ہوتا تھا وبا کے دنوں میں کوشش کی جاتی تھی کہ کسی طرح بچ کر نکل جائے۔ ایسے میں گھر کے باہر سے گھر آنے والا فرد مکمل احتیاطی تدابیر پر عمل پیرا ہونے کے باوجود جن مشکلات کا سامنا کرتا تھا اس کو مصنف نے ان الفاظ میں بیان کیا ہے:

> "میرے محتاط طرزِ عمل کے باوجود ایسے موقعوں پر میرے بچے، یہاں تک کہ میری بیوی بھی مجھ سے فاصلے پر رہتی۔ بعض اوقات یہ سب مجھے معیوب لگتا اور دکھ بھی ہوتا تھا۔ میں سوچتا: "ان لوگوں کے لیے میں جان خطرے میں ڈال کر باہر جاتا ہوں اور انہی کو مجھ سے کراہت ہوتی ہے۔ احسان فراموشی کی اس سے زیادہ مثال کیا ہو سکتی ہے؟"(۵۰)

کورونا کے بعد پیدا ہونے والی اس صورتحال نے اس قدر کو بھی تبدیل کر دیا جہاں والد کے گھر آنے پر بچے خوشی اور جوش کے ساتھ والد کو ملتے تھے مگر ان حالات میں وبا کے خوف کی لہر پیدا ہو جاتی تھی کہ کہیں وائرس بھی والد کے ساتھ ہی نہ آ گیا ہو۔ اس افسانے میں مارکیٹ خاص طور پر سپر سٹورز جہاں سے تمام عام ضرورت کی اشیا مل جاتی تھی اس کے حالات بھی بیان کیے گئے ہیں کہ جیسے ہی سٹور کا دروازہ کھلتا لوگ جانوروں کی طرح چیزوں کو ایسے جھپٹ کر اٹھا لیتے جیسے تمام مال گھروں میں ذخیرہ کر لیں گے۔ پورے ملک میں لاک ڈاؤن تھا ایسے حالات میں عام ضرورت کی اشیا سے محروم ہونے کا خوف بڑھتا ہی جا رہا تھا۔ "چراہ گاہ" بنیادی طور پر لوگوں کی مارکیٹ میں جانوروں کی طرح چیزوں پر ٹوٹ پڑنا اور دیکھتے ہی دیکھتے سٹور کا ویران ہو جانا جانوروں کے چارہ گاہ کی علامت کے طور پر لیا گیا ہے۔ اس مجموعے میں شامل افسانہ "کرودھ" بھی انہیں حالات کا عکاس ہے کہ کیسے ان دنوں میں کرفیو کی طرح جگہ جگہ پولیس کا پہرہ لگا ہوتا تھا۔ کھانے پینے کی اشیا کی دوکانیں بھی مخصوص اوقات میں ہی کھلتی تھیں صرف ادویات فروشوں کی دکان کھلی ہوتی تھی۔ اس افسانے کا مرکزی کردار اپنی ماں کی سخت بیماری کے باعث گھر سے دوا لینے کے لیے نکلتا ہے تو جن حالات کا اسے سامنا کرنا پڑتا ہے وہ معاشرے کی بے حسی اور کھوکھلے پن کو اجاگر کرتے ہیں۔

"شہر جانے کے لیے وہ گاؤں سے دس بارہ میل کی پیدل مسافت طے کر کے سڑک تک پہنچا۔ اکا دکا گاڑی گزر رہی تھی؛ وہ ہر گاڑی کو ٹھہرنے کا اشارہ کرتا۔ گاڑیاں اس کے پاس سے ہوا کی طرح گزرتی جاتی تھیں۔ اسے رہ رہ کر اپنی بے چارگی اور غربت پر غصہ آرہا تھا۔۔۔ گاڑیاں گزرتی رہیں اور وہ سڑک کے کنارے ایک گھنٹے سے زیادہ وقت گزار چکنے کے بعد پریشان کھڑا تھا۔"(۵۱)

پیش کردہ اقتباس واضح طور پر اس صورت حال کا عکاس ہے کہ لوگوں کے ایک دوسرے کے کام آنے اور مدد کرنے والی قدر اب بدل چکی ہے۔ حالات کی ستم ظریفی اس وقت اپنے عروج پر پہنچ جاتی ہے جب وبا کے حالات کی پابندیوں کے پیش نظر پولیس اس کو مشکوک انداز میں جیل میں ڈال دیتی ہے جب کہ وہ اپنی وضاحت بھی دیتا ہے کہ وہ اپنی ماں کے لیے دوا لینے نکلا ہے مگر پولیس اس کے بیان کو مسترد کر دیتی ہے اور تین دن بعد جب وہ گھر پہنچا تو ہر طرف نفرت بھری نگاہیں تھی اور اس کی ماں مٹی کے ڈھیر کا حصہ بن چکی تھی۔

کورونا وائرس کے پھیلاؤ کے حوالے سے پیدا ہونے والے مختلف نظریات کو خاور چودھری نے "کورونائی نظریات" عنوان کے تحت افسانے میں قلم بند کیا ہے جو معاشرے کی اجتماعی صورت حال کا عکاس ہے اس حوالے سے ہر فرد کا اپنا نظریہ تھا۔ کسی کے نزدیک یہ عالمی طاقتوں کی باہمی جنگ کا نتیجہ ہے تو کوئی اسے چمگادڑ کھانے کا نتیجہ اور کوئی گناہوں کی سزا قرار دیتا ہے۔ ہر فرد اپنا ایک موقف رکھتا ہے یہ افسانہ ایک کانفرنس کی روداد کی صورت میں لکھی گئی کہانی ہے جس میں حکومت کے کردار اور مذہبی سطح پر مسلکی اختلافات کو بھی چابک دستی سے اجاگر کیا گیا ہے۔

"کونپل کا قتل" افسانہ وبا کے دنوں میں ایک مہذب اور سلجھی ہوئی لڑکی اور اس کے نامولود بچے کی موت کا المیہ ہے۔ جو وبا کے دنوں میں انگلینڈ سے پاکستان پوری احتیاطی تدابیر کے ساتھ وطن واپس آتی ہے لیکن وائرس کے خدشے کی بدولت پہلے ہی ذمے دار فرد کی حیثیت سے والدین کو اپنے لیے الگ کمرے اور رہائش کے انتظامات کا کہہ دیتی ہے اور وطن لوٹنے کے بعد کورونا ٹیسٹ کرواتی ہے اور رپورٹ آنے تک خود کو سب سے الگ تھلگ رکھنے کا فیصلہ کرتی ہے اس کے باوجود اچانک سرکاری گاڑیاں وائرس کی تشخیص ہونے اور مقامی لیبارٹری کی اطلاع پر اس کے بنگلے کے باہر پہنچ جاتی ہیں۔ لڑکی کے والد بڑے افسر اور والدہ خود بھی ڈاکٹر ہیں۔ مگر اس سب کے باوجود ان کی بیٹی کو تکلیف دہ مرحلے سے گزرنا پڑتا ہے۔ ایمبولینس کی تکلیف دہ حالت، ہسپتال کی گندگی اور بدبو سے اس کی حالت خراب ہونے لگی۔ ڈاکٹر اس کو باشعور فرد جانتے ہوئے مکمل احتیاطی

تدابیر کے ساتھ گھر جانے کی اجازت تو دے دیتے ہیں مگر اگلے ہی دن میڈیا پر اس کے اور اس کے والد کے خلاف احتجاج کے طور پر پھر سے ہجوم امڈ آتا ہے اور اسے ہر صورت اپنے ساتھ لے جانے پر بضد ہوتے ہیں ان تمام حالات کا سامنا اس کے لیے مشکل ہو جاتا ہے اور اس کی طبعیت بگڑنے لگتی ہے۔یوں اس کی موت سے پہلے ننھی کونپل کا قتل ہو جاتا ہے۔ معاشرے کی خستہ حالی کا عکاس یہ افسانہ معاشرتی قدروں کے زوال کا عکاس ہے۔ ان حالات کے برعکس لڑکی کی تربیت میں شامل عناصر ہماری اعلیٰ قدروں کی مثال تھا۔

"جس ماحول میں وہ پروان چڑھی تھی، وہاں بلند آواز میں گفتگو معیوب سمجھی جاتی اور اختلافِ رائے کے اظہار پر اعتراض، بداخلاقی کے دائرے میں داخل شمار ہوتا۔"(۵۲)

آج کل اونچی آواز میں گفتگو اور اختلاف رائے کو حق کا نام دے کر تمام قدروں کو پامال کر دیا جاتا ہے۔ غرض وبا کے دنوں کی صورتحال اقدار کے تغیر اور معاشرے کے ہر پہلو کو خاور چودھری نے "طلسم کہن" کے افسانوں میں سما دیا ہے۔ ان دنوں سوشل میڈیا اور ٹیکنالوجی کا کردار بھی ان کہانیوں میں نمایاں ہے۔ افسانہ "وبا" میں لکھتے ہیں کہ وبا سے صرف انسانی جسم ہی متاثر ہوا ہوتا تو اس کا علاج کسی طرح کر لیا جاتا مگر اس نے انسان کو روحانی طور پر نقصان پہنچایا۔ مذہبی، اخلاقی، تہذیبی، سماجی، معاشی اور علمی اعتبار سے ایک عجیب بانجھ پن طاری کر دیا تھا۔(۵۳)

ان دنوں انسان کی اعلیٰ اخلاقی قدروں کو پہنچنے والے زوال کو بھی دیگر افسانوں کے ساتھ ساتھ افسانہ "وبا" میں کھل کر بیان کیا ہے جو اس دوران پائے جانے والے رویوں کی دستاویز ہے۔ جھوٹ، فریب، بہتان، چوری اور ڈکیتی جیسے گھناؤنے افعال اختیار کرنے پر فرد مجبور تھا۔ اس افسانے میں جن تغیر پذیر قدروں کو بیان کیا گیا ہے اس میں سے نکلنے والے نکات درج ذیل ہیں:

"انسانی معاشرے میں اپنائیت اور قربت اور اجتماعیت کو بنیادی حیثیت حاصل تھی،
وبا نے پہلا وار اسی پر کیا جب معانقہ اور مصافحہ محبت میں اضافے کا باعث تھا، وبا نے اسی سے روک دیا"
"عبادتوں اور دعاؤں سے اعتبار اٹھ گیا۔ مذہب اور اس کی رسوم پس منظر میں چلی گئیں"
"دوسروں کی حق تلفی اور بہیمانہ اقدامات فروغ پا گئے۔"
"مر جانے والوں کی توہین بھی معمولی سی بات کے برابر آ گئی۔"
"مختلف تعلیمی ایپلی کشنز تیار کر لی گئیں۔ ای لرننگ کا خوب صورت سلسلہ شروع ہو گیا۔"(۵۴)

گو کہ معاشرے میں وقتی طور پر مثبت تبدیلیاں آئی جس میں فلاحی تنظیموں کے کردار، ڈاکٹروں کی خدمات، دین سے دور افراد کا دین و دنیا سے رغبت وغیرہ جیسے افعال شامل ہیں لیکن دوسری طرف ایک بے پر واصورت حال بھی پیدا ہوئی۔ کچھ قدریں مخصوص حالات میں تبدیل ہوتی ہیں جیسا کہ وبا کے دنوں میں لوگوں نے جن رویوں کو اپنایا وہ اس دور کے مخصوص حالات کے پیش نظر تھے، حالات کی بہتری اور خوف و ہراس کی اس صورت حال کے ختم ہونے کے بعد جیسے جیسے زندگی واپس اپنے گزشتہ معمولات کی طرف لوٹی تو بہت سے رویے واپس زندہ دل ہوئے مگر ان حالات کے معاشرے پر اس قدر گہرے اثرات مرتب ہوئے کے ہمارے بہت سے رویے ایک نئی ڈگر کی جانب تشکیل پا گئے ہیں جن سے باہر نکلنا یا بچنا ناممکن ہے۔ مثلاً ان دنوں ڈیجیٹل تبدیلی تیزی سے رونما ہوئی، اب ٹیکنالوجی روزمرہ کی زندگی کا ایک لازمی حصہ بن چکی ہے خاص طور پر اس کے اثرات دفتری اور تعلیمی نظام پر تاحال پائے جاتے ہیں۔

قدرتی آفات ہوں، المناک حادثات ہوں یا عالمی سطح پر متاثر کن واقعات، پاکستانی معاشرے میں بدلتی ہوئی اقدار کے پس پردہ ان محرکات کی عکاسی افسانوں میں کی گئی ہے۔ ان حادثات و واقعات نے معاشرے کے انفراسٹرکچر پر دیرپا نقوش مرتب کیے ہیں۔

ہ۔ معاصر افسانے میں تغیر پذیر اقدار کے پس پردہ معاشرتی تحریکیں (بلخصوص تحریکِ نسواں)

اکیسویں صدی مختلف تحریکوں اور رجحانات سے وابستہ ہے۔ دیگر ممالک کی طرح پاکستان میں بھی سماجی نقطہ نظر کے حوالے سے ایک بڑی تبدیلی نے متاثر کن معاشرتی تحریکوں کو فروغ دیا جنھوں نے سماجی اقدار کے ارتقا اور تبدیلی میں اہم کردار ادا کیا اور مختلف اداروں میں نمایاں تبدیلیاں پیدا کیں۔ یہ تحریکیں پاکستانی معاشرے کے اندر بدلتے ہوئے نظام کی عکاسی کرتی ہیں جو صنفی مساوات، انسانی حقوق اور ثقافتی پابندیوں جیسے مسائل کو حل کرنے میں معاون ثابت ہوتی ہیں۔ خاص طور پر خواتین کو بااختیار بنانے کے مقصد کو عالمی سطح پر پروان چڑھایا گیا۔ نسائی مسائل اور عورتوں کے خلاف ظلم و ستم پر احتجاج ابھر کر سامنے آیا۔ افسانے کے بیانیے میں بھی نئے اور فوری طور پر پیدا ہونے والے محرکات کو تخلیق کیا گیا۔ یہ بیانیے اس وقت کے بدلتے ہوئے رویوں اور جدوجہد کے آئینہ دار ہیں۔ موجودہ صدی میں معاشرے کی صورت حال کے پیش نظر افسانے میں جن محرکات کو اجاگر کیا گیا ہے اس حوالے سے ڈاکٹر مہناز انور لکھتی ہیں:

> " سیاسی معاشرتی مسائل تو اب بھی افسانوں کے موضوعات تھے لیکن اب ان کی نوعیت بدل گئی تھی۔ عورت، جنس، عشق و محبت ہمیشہ کی طرح اس دور میں بھی

افسانے کا موضوع بنا رہا۔ لیکن اب ان کی طرف بدلا ہوا رویہ نظر آنے لگا اس کی وجہ معاشرے میں پیدا ہونے والی تبدیلیاں تھیں۔ عورت گھر کی چار دیواری سے آ کر زندگی کی جدوجہد میں شریک ہونے لگی تھی۔ سماج میں عورت کو مرد کے برابر رتبہ دیئے جانے کا مطالبہ ہونے لگا اور اس پر مذہب اور رواج کے نام پر ڈھائے جانے والے مظالم کے خلاف احتجاج ہونے لگا۔"(۵۵)

ادیب یا فن کار کے خیالات اپنے ماحول، وقت اور تقاضوں کا نتیجہ ہوتے ہیں یہی وجہ ہے کہ بعض حقائق جو معاشرے، خاندان اور مذہب سے جڑے تھے انہیں مختلف زاویوں سے پیش کیا جانے لگا۔ یہاں کچھ بنیادی معاشرتی تحریکیں جو پاکستان میں معاشرتی اقدار میں تبدیلی کا باعث بنی اکیسویں صدی کے پاکستانی افسانے کے مطالعے کی روشنی میں بیان کی جا رہی ہیں۔ ان تحریکوں میں سب سے اہم خواتین کو بااختیار بنانے کے حوالے سے ہے۔

خواتین کو بااختیار بنانے اور برابری کے حقوق کی فراہمی کے حوالے سے ۸ مارچ ۲۰۱۸ء میں پاکستان کے مختلف شہروں میں عورت مارچ کا آغاز کیا گیا۔ یہ مارچ خواتین کے لیے تولیدی حقوق سے لے کر صنفی بنیاد پر تشدد تک کے مسائل پر اپنے تحفظات کے اظہار کا ایک پلیٹ فارم بن گیا جہاں خواتین صنفی بنیاد پر تشدد اور معاشی عدم مساوات جیسے مسائل پر اپنی آواز بلند کرنے کے لیے جمع ہونے لگیں۔ ان جلسوں کے دوران جس اجتماعی طاقت کا مظاہرہ کیا گیا اس نے معاشرتی اصولوں اور پالیسیوں کی تشکیل میں خواتین کی آواز اور ان کی انفرادیت اور اہمیت کو اجاگر کیا۔ یہ مارچ اب ایک سالانہ تقریب بن گیا ہے ہر سال ۸ مارچ خواتین کے عالمی دن کے نام سے منایا جاتا ہے۔ اس مارچ میں خواتین کی طرف سے جس طرح کے پوسٹرز کو پیش کیا گیا اس پر بڑی سطح پر تنقید بھی ہوئی۔ عہد حاضر میں عورت مرد سے سبقت حاصل کرنے کی تگ و دو میں جس طرح اپنی انفرادیت، عفت و عصمت کو متاثر کرنے لگی اس حوالے سے ڈاکٹر شفیق انجم نے "کھپت۔۔۔ بیانیہ ہے" میں ان تحریکوں کے پس منظر میں اس صورت حال کو پیش کیا ہے۔

"میرا جسم، میری مرضی کی طرف ایسی ان دیکھی دھکیل ہے کہ اچھے اچھوں نے نسلوں نسل سنبھالے عفت و عصمت کے لبادے اتار پھینکے ہیں۔ عورتیں، عورتوں سے اور مرد، مردوں سے منسلک ہونا باعثِ فخر سمجھنے لگے ہیں اور اس کے لیے کانوں کان تلقین ایسی ہے کہ گویا لذت کا کوئی خزانہ ہاتھ آ لگا ہے۔"(۵۶)

اس وقت خواتین زندگی کے مختلف پہلوؤں میں مردوں کے ساتھ برابری کے حصول کے لیے کثیر جہتی جدوجہد جاری رکھے ہوئے ہیں۔ خواتین فعال طور پر معاشرتی اصولوں کو چیلنج کر رہی ہیں اور رکاوٹوں کو توڑ رہی ہیں، مساوی حقوق کے حصول کے لیے جدوجہد کر رہی ہیں۔ ان کا موقف ہے یہ جدوجہد مردوں سے آگے نکلنے کے لیے نہیں کی جارہی بلکہ اس کا مقصد رکاوٹوں کو ختم کر کے ایک ایسے ماحول کو فروغ دینا ہے جہاں دونوں صنفیں برابری کی بنیاد پر ترقی کر سکیں۔ ان تحریکوں نے خواتین میں اپنے حقوق کے لیے آواز اٹھانے کا جذبہ پیدا کیا۔ انہی مقاصد کے پیش نظر خواتین کے حقوق کے حوالے سے مختلف تنظیموں کا قیام عمل میں آیا اور خواتین کو باقاعدہ اس کے لیے تیار کیا جانے لگا۔ خواتین کی اس حوالے سے باقاعدہ تربیت کی جارہی ہے۔ حمیرا اشفاق کا افسانہ "راؤنڈ اباؤٹ" ان تنظیموں کی جانب سے خواتین کی تربیت سازی، خواتین کے حقوق اور ان کو بااختیار بنانے کے عزم کی نشاندہی کرتا ہے۔

> "یہ ٹریننگ تیسری دنیا کے ممالک کی عورتوں کو بااختیار اور ہنر مند بنانے کے لیے کروائی جارہی تھی۔ میرا نام بھی کمپنی نے تجویز کیا تو میں نے بھی پرواز کے لیے پر کھول دیے۔۔۔ میرے شوہر اور بچوں کی دیکھ بھال کے لیے میری امی نے ذمہ داری اٹھائی اور کہا جاؤ۔۔۔ شاید انہوں نے اپنے خواب میری آنکھوں میں رکھ دیے تھے۔"(۵۷)

افسانے کا سیاق نہ صرف تیسری دنیا کی خواتین کو بااختیار اور ہنر مند بنانے کی شعوری کوشش کو نمایاں کرتا ہے بلکہ یہ بیانیہ تفاوت کو دور کرنے اور خواتین کے لیے جامع اور بااختیار کردار کو فروغ دینے کے لیے ایک فعال مؤقف کو اجاگر کرتا ہے جو کہ تیسری دنیا میں خواتین کی ترقی اور ان کی صلاحیتوں کو اجاگر کرنے کے لیے وسیع تر عالمی اقدامات کے ساتھ ہم آہنگ ہے۔ خاص طور پر ان خطوں کی خواتین کے لیے جن کو سماجی و اقتصادی چیلنجز کا سامنا ہے۔ افسانے سے پیش کردہ اقتباس میں یہ بیان کہ "شاید انہوں نے اپنے خواب میری آنکھوں میں رکھ دیے تھے" ماں کے ان جذبات کا عکاس ہے جو اپنی بیٹی کو ملنے والے موقع پر اپنی خواہشات کی تکمیل ہوتے ہوئے دیکھتی ہے۔ یہ بے بس اور لاچار خواتین کے روایتی کرداروں کے مقابلے جدید عہد میں خواتین کو اپنے خوابوں کو پورا کرنے کے قابل بنانے کے لیے کیے جانے والے اقدامات کو اجاگر کرتا ہے۔ خواتین خود بھی ان تنظیموں میں شمولیت اختیار کرنے لگی ہیں۔ افسانہ "خاموش جدائی" سے اقتباس ملاحظہ ہو:

"اس کی بیوی نے کچھ عرصہ پہلے کافی بحث بلکہ لڑائی کے بعد اس سے عورتوں کے حقوق کے لیے کام کرنے والی ایک تنظیم میں شمولیت کی اجازت لی تھی۔اس کی بیوی اکثر ایسے ہی موضوعات پر باتیں کرتی۔ پسند کی شادی پر تو وہ کچھ زیادہ ہی زور دیتی۔"(۵۸)

افسانہ نگاروں نے اپنے گردو پیش میں پھیلی ہوئی دنیا اور اس میں بسنے والوں کی زندگی کی باریکیوں کو جس گہرائی کے ساتھ بیان کیا ہے وہ معاشرے میں فرد کے احساسات اور رشتوں کی نفسیاتی پیچیدگیوں کو اجاگر کرنے میں بھی معاون ہے۔ مسعود مفتی کا افسانہ "طعنہ" کی کہانی کا مرکزی کردار بھی خواتین کے حقوق کے لیے کام کرنے والی نسائی زندگی کی نمائندگی کرتا ہے جو دو مرتبہ طلاق لے چکی تھی دوسری طرف وہ ایک ایسے مرد کو پسند کرنے لگتی ہے جس کی بیوی اس سے علیحدہ ہو چکی تھی۔ ان دونوں کرداروں کے مابین ہونے والی گفتگو سے اقتباس ملاحظہ ہو جو عصری تناظر میں اقدار کی تغیر پذیری کے پس پردہ محرک کے طور پر نمایاں ہوتا ہے۔

"آج کل تو خواتین اس سطح کی برابری کا دعویٰ کرتی ہیں۔
آپ بھی تو Women's LIB کی بہت بڑی چیمپئن ہیں۔
"ضرور ہوں۔۔۔ اور ڈٹ کر ہمیشہ رہوں گی" وہ رکی۔۔۔ پھر بے چارگی سے سر ہلایا
"مگر چھوڑیے ان باتوں کو۔۔۔ مردوں کی سمجھ میں یہ بات کم ہی آتی ہے۔۔۔"(۵۹)

یہ اقتباس صنفی مساوات کے لیے مسلسل جدوجہد اور اس مقصد کی اہمیت کو بیان کرنے میں خواتین کو درپیش چیلنجوں کے بارے میں مکالمے کی ایک جھلک پیش کرتا ہے۔ خواتین نہ صرف اپنے حقوق سے آگاہ ہو رہی ہیں بلکہ اپنی ذہانت، قابلیت اور صلاحیتوں سے دنیا کو مسخر کر رہی ہیں۔ جو خاتون اب بھی اپنے حقوق سے آگاہ نہیں اس میں یہ جذبہ پیدا کرنے کی کوشش کی جارہی کہ بااختیار عورت کے ہاتھ میں ہی معاشرے کی ڈور ہے ورنہ وہ معاشرے میں پستی چلی جائے گی۔ افسانوں میں ان مسائل کا بھی احاطہ کیا گیا ہے جو پاکستانی معاشرے کی لاچار خواتین کو درپیش ہیں، یہ تحریکیں اور تنظیمیں ان کو ان کے جائز حقوق سے آگاہ کرنے کے لیے کوشاں ہیں۔ بین الاقوامی تنظیموں اور حکومتوں نے پائیدار ترقی کے حصول میں خواتین کو بااختیار بنانے کی اہمیت کو تسلیم کیا ہے۔ صنفی مساوات کو اقوام متحدہ کے پائیدار ترقیاتی اہداف (SDG:5) میں سے ایک ہدف کے طور پر شامل

کرنا خواتین کے لیے تعلیم، صحت اور معاشی مواقع جیسے مسائل سے نمٹنے کے لیے عالمی عزم کی عکاسی کرتا ہے۔

افسانہ نگاروں کے ہاں خواتین کے خلاف تشدد سے متعلق مسائل کو پہچاننے اور ان سے نمٹنے کے لیے ان کا بیانیہ سیاق تبدیلی کی نشاندہی کرتا ہے۔ ان کے کردار جبر کے خلاف آواز بلند کرنے اور بیڑیوں کو توڑنے پر اکساتے ہیں۔ ابن مسافر کے بیشتر افسانے نسائی حقوق کو ضبط کرنے والے رویوں اور جبر کے خلاف سراپا احتجاج بنتے ہیں۔ مثلاً ابنِ مسافر کے افسانوں میں "نیک پروین" اپنے حقیقی خدا کی خوشنودی حاصل کرنے کے لیے اپنے مجازی خدا کے ہر حکم پر سر تسلیم خم ہے۔ "بری نظر" افسانے میں عورت جس کو معاشرہ نفسیاتی مریضہ کہہ رہا ہے وہ اپنے شوہر کی گندی نظر سے دوچار ہے۔ "عورت خدا مرد خدا" میں عورت کی بے بسی کی داستان ہے جہاں وہ اپنے مرد خدا کی پکار کو مقدس جانتی ہے جب کہ اس کے اپنے وجود سے اٹھنے والی گھٹی، سہمی، آدھی، ادھوری اور پوری چیخیں سننے والا کوئی نہیں ہے حتیٰ کہ اپنی جائز آواز وہ اپنے مجازی خدا کے تقدس میں دبا دیتی ہے۔ لڑکیوں کو ان کی مرضی کے خلاف کسی ایسے لڑکے سے بیاہ دیا جائے جسے وہ ناپسند کرتی ہوں ابنِ مسافر کا افسانہ "ریپ" اسی صورت حال کے مصادق علامت ہے۔ جہاں ہمارے معاشرے میں پائے جانے والے بے شمار نسوانی کردار ریحانہ جیسے ہیں۔ اسی طرح ابن مسافر کے افسانے "گٹر" میں ثنا کا کردار ہے۔ ثنا کا سرمد سے فیس بک پر رابطہ ہوتا ہے۔ کہانی میں دونوں کردار سلجھے ہوئے اور تخلیقی صلاحیتوں کے مالک ہیں۔ دونوں کا دن بھر باتیں کرنا معمول بن گیا تھا۔ لیکن ثنا اتنی قابل اور تخلیقی صلاحیتوں کی مالک ہوتے ہوئے بھی اپنے ہنر کو پروان چڑھتے نہیں دیکھ سکتی کیوں کہ اپنے حق کے لیے اسے اپنوں سے ہی جنگ کرنی پڑے گی، باغی ہونا پڑے گا۔ اس کے لیے سرمد ثنا کو عورتوں کے حقوق سے متعلق لیکچر بھی دیتا رہتا ہے اور اسے بغاوت پر اکساتا ہے کہ وہ کوئی چیز نہیں ہے کہ اسے جیسے چاہا جائے استعمال کیا جائے اس کی ایک اپنی الگ شناخت ہے۔ مگر اس پر ثنا کا ایک میسج جو اس طرح سے تھا:

> "اگر میں وہ کرتی جو کرنا چاہتی تھی تو ایسا کرنے کے ایک ہفتے کے اندر اندر میری لاش کسی گٹر میں پڑی ملتی"(۶۰)

ثنا کا یہ ایک میسج اس جیسی لاکھوں کروڑوں مایوس اور اذیت سے دوچار خواتین کی آواز بن جاتا ہے۔ یہی معاشرے کا المیہ ہے جس کے خلاف اب ہر طرف سے آوازیں اٹھائی جا رہی ہیں جیسا کہ ۲۰۱۶ء میں فوجداری قانون کے تحت غیرت کے نام پر قتل کو جرم قرار دیا گیا اور مجرموں کے لیے سخت سزائیں عائد کی

گئیں، اس طرح کی قانونی اصلاحات خواتین کے حقوق اور ان کے تحفظ کے لیے بدلتے ہوئے رویوں کی عکاسی کرتی ہیں۔ صنفی مساوات کی طرف حالیہ برسوں میں نمایاں پیش رفت کے باوجود بھی مختلف شعبوں میں تفاوت موجودہ ہے لیکن معاشرے میں سرمد جیسے مردانہ کردار بھی موجود ہیں جو عورتوں کو ان کے جائز حقوق کی فراہمی کے لیے جنگ کر رہے ہیں۔ ان کرداروں کی سوچ میں تبدیلی ہی اس عہد کا خاصہ ہے۔ خواتین میں بیداری کا یہ تھیم اکیسویں صدی کے افسانوں میں مختلف صورتوں میں جلوہ گر ہے۔ پاکستان میں خواجہ سراؤں کے حقوق کی تحریک نے بھی زور پکڑا جس کے نتیجے میں خواجہ سراؤں کے حقوق اور ان کی شناخت کے حوالے سے ان کو قانونی سطح پر تحفظ فراہم کیا گیا۔ مختلف سماجی اور سیاسی مسائل میں نوجوانوں کی فعال شمولیت نے پاکستان میں نئے تناظر اور توانائی پیدا کرنے میں کلیدی کردار ادا کیا۔ میڈیا کے ذریعے ممنوعہ موضوعات پر بات چیت کے لیے ایک پلیٹ فارم فراہم کیا گیا۔ جنسی ہراسانی اور ایسے واقعات کے خلاف عالمی سطح پر مباحث کا آغاز ہوا۔ طاہرہ اقبال کے افسانے جنگل سکرین سے اقتباس ملاحظہ ہو:

> "اب سیٹلائٹ سسٹم نے پوری دنیا کو گلوبل ولیج بنا دیا ہے۔۔۔ آخر یہ جدید مہذب عہد ہے، جہاں سکس تک فری ہے، جہاں جانوروں اور پرندوں تک کے حقوق محفوظ ہیں۔۔۔ اسی لیے تو انسانی حقوق کی ساری تنظیمیں اس کی فطری نمو کو بٹ بٹ دیکھتی ہیں۔۔۔"(۶۱)

طاہرہ اقبال کا افسانہ "جنگل سکرین" عصری تناظر میں جدید ٹیکنالوجی کے اثرات کو "جدید مہذب دور" سے تعبیر کرتے ہوئے اس عہد میں انسانی حقوق کے ساتھ ساتھ جانوروں کے حقوق کے حوالے سے کام کرنے والی تنظیموں کے کردار کو اجاگر کرتا ہے۔ "سکس تک فری ہے" کی مثال جنسی آزادی اور ایک بدلتے ہوئے منظر نامے کا عکاس ہے جہاں جنسیت کے تئیں رویے تبدیل ہو گئے ہیں۔ جدید معاشروں میں جنس سے متعلق روایتی ممنوعات کے برعکس اس کی قبولیت میں اضافہ ہوا ہے۔ ان تنظیموں کی کوششوں سے فرد کو اپنی جنس تک خود انتخاب کرنے کا حق حاصل ہوا۔ اگرچہ جنسی آزادی کے خیال نے توجہ حاصل کر لی ہے، لیکن جنسی تعلقات کے بارے میں مختلف عقائد اور معاشرتی نقطہ نظر متحرک اور کثیر جہتی ہیں۔ اس بات میں کوئی دورائے نہیں کہ پاکستان میں بھی اس لہر نے معاشرتی اقدار اور رویوں میں تبدیلی برپا کی ہے۔ عرفان احمد عرفی کے بیشتر افسانوں کا موضوع جنسی ناآسودگی ہے جو اسلوب کی تازہ کاری کے ساتھ کرداروں کے لاشعور میں چھپ کر شعور میں سرگوشیاں کرتا ہے۔ اس حوالے سے ان کے افسانوں میں "ایک رات یوں بھی ہوا" کا

نسوانی کردار بی بی ایک رات جس سائے سے ملتی ہے وہ دن بھر اس کی بے نام کسک کو تازہ دم کیے رکھتی ہے۔ افسانہ "بھاپ"، "بن بڈھا" میں کرداروں کی نا آسودہ خواہشات کو معاشرے کی حد بندیوں کی پناہوں میں اس طرح اجاگر کیا ہے جیسے آزادی کے لیے ایک نا آسودہ کسک سرگوشیاں کرتی ہوئی باہر نکلتی ہے۔ یہی کیفیت عرفان احمد عرفی کے دیگر افسانوں میں کسی نہ کسی طور پر فن کے تنوع اور رنگارنگی کے ساتھ ابھرتی ہے۔ اسی اثنا میں ان کے افسانے اپنے آپ میں ان نظریات کا پرچار کرتے ہوئے نظر آتے ہیں جس سے آج کا معاشرہ دوچار ہے۔

پاکستانی اردو افسانہ ان معاشرتی تحریکوں کے اثرات کو اجاگر کرنے، دقیانوسی تصورات کو چیلنج کرنے، تعصب کو دور کرنے، صنفی بنیادوں پر عدم مساوات کو ختم کرنے کے اجتماعی عزم کی عکاسی کرتا ہے۔ یہ معاشرتی تحریکیں اجتماعی طور پر پاکستان میں بدلتے سماجی تانے بانے میں حصہ ڈالتے ہوئے روایتی اقدار اور اصولوں کو چیلنج کرتی ہیں۔ افسانوں میں خواتین کو بااختیار بنانے اور معاشرے میں ان کے کردار کی بڑھتی ہوئی اہمیت اجاگر کی گئی ہے۔ خاص طور پر خواتین کے روایتی کرداروں کے برعکس مضبوط اور آزاد خیال کرداروں کو پیش کیا گیا ہے۔ خواتین کی حقوق کے لیے جس طرح کی تحریکیں شدت سے اس عہد میں سرگرم عمل ہیں پہلے ایسا نہیں تھا۔ حالاں کہ کسی حد تک خواتین بیسویں صدی میں بھی بے باک نظر آتی ہیں۔ اگرچہ ترقی ہو رہی ہے لیکن ابھی بھی چیلنجز موجود ہیں اور مزید جامع اور مساوی معاشرے کی تعمیر کے لیے مسلسل کوششوں کی ضرورت ہے۔

مجموعی طور پر دیکھا جائے تو یہی محرکات پاکستانی معاشرے میں معاشرتی اقدار میں تغیر کا سبب بنے جنہیں عصری منظر نامے میں نہ صرف کرداروں اور بیانیوں کی تبدیلی کا مشاہدہ کرتے ہوئے دیکھا جا سکتا ہے بلکہ عصری معاشرے کی کثیر جہتی ساخت کا بھی گہرا ادراک کیا جا سکتا ہے۔ یہاں کی سڑکیں، گلی کوچے، شہر ہو یا گاؤں اس پر تبدیلی کی حیرت انگیز چھاپ دیکھنے کو ملتی ہے۔ نئے معاشرتی حقائق کی افہام و تفہیم میں افسانہ نگاروں کی انفرادی فکر و نظر نے ان حالات کو سمجھنے میں معاونت کی ہے۔ نئی قدروں کی تلاش و تعبیر میں ان عناصر کا مطالعہ موجودہ حالات اور نئے امکانات کو سمجھنے میں معاون ہے۔

حوالہ جات

۱۔ Emile durkheim,The Rules of Sociological Methods, translated by W.D.Halls, The free press, New York, 1982, P.186

۲۔ سلیم آغا قزلباش، آخر آخر میں!(افسانہ)مشمولہ: اعلانوں بھرا شہر، ص۱۱۷

۳۔ ایضاً، ص۱۱۷

۴۔ خالد فتح محمد، تارک میرک (افسانہ) مشمولہ: میں، ص۱۶۱

۵۔ گل زیب عباسی، اناپرست (افسانہ) مشمولہ: پھول چہرے، ظفر اکیڈمی، کراچی، ۲۰۱۴ء، ص۱۸۲

۶۔ رشید امجد، دست گزیدہ (افسانہ) مشمولہ: دکھ ایک چڑیا ہے، ص۱۴

۷۔ محمد حامد سراج، ایک اور داؤ (افسانہ) مشمولہ: بخیہ گری، ص۳۷

۸۔ حمیرا اشفاق، ڈاکٹر، گھگو گھوڑے (افسانہ) مشمولہ: کتبوں کے درمیان، ص۲۹

۹۔ زبیر شاہ، سید، محمد خطِ تنسیخ کی زد میں (افسانہ) مشمولہ، یخ بستہ دہلیز، اعراف پرنٹرز محلّہ جنگی، پشاور، ۲۰۱۷ء، ص۱۲۳

۱۰۔ ایضاً، ص۱۲۳

۱۱۔ ایضاً، ص۱۲۶

۱۲۔ خالد فتح محمد، دل کو دل سے راہ (افسانہ) مشمولہ: میں، ص۹۸

۱۳۔ حمیرا اشفاق، مسٹر چرچل (افسانہ) مشمولہ: کتبوں کے درمیان، ص۱۸

۱۴۔ ایضاً، ص۱۹

۱۵۔ حمیرا اشفاق، کتبوں کے درمیان (افسانہ) مشمولہ: کتبوں کے درمیان، ص۶۸

۱۶۔ آصف فرخی، بونسائی، (افسانہ) مشمولہ: میرے دن گزر رہے ہیں، ص۲۲

۱۷۔ ایضاً، ص۲۴

۱۸۔ شفیق انجم، ڈاکٹر، خدا مصروف ہے، (افسانہ) مشمولہ: روشنی آواز دیتی ہے، ص۶۶

۱۹۔ شفیق انجم، ڈاکٹر، کھپت۔۔بیانیہ ہے، (افسانہ) مشمولہ: روشنی آواز دیتی ہے، ص۴۴

۲۰۔ ایضاً، ص۴۷

۲۱۔ منشایاد، نظر آلباسِ مجاز میں، (افسانہ) مشمولہ: خواب سرائے، ص۳۵

۲۲۔ ناصر عباس نیر، ڈاکٹر، عالمگیریت اور اردو کا مستقبل: لسانی تناظر (مضمون) مشمولہ: عالمگیریت اور اردو اور دیگر مضامین، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۱۵ء، ص ۱۲
۲۳۔ انوار احمد، ڈاکٹر، کفن سے انکاری (افسانہ) مشمولہ: آخری خط، مثال پبلشرز، فیصل آباد، ۲۰۱۰ء، ص ۱۰۳
۲۴۔ زبیر شاہ، سید، بین کرتی مَیّا (افسانہ) مشمولہ: خوف کے کتبے، ص ۲۰
۲۵۔ محمد حامد سراج، اندراج (افسانہ) مشمولہ: برادہ، پبلشنگ ہاؤس یونیورسٹی آف مینجمنٹ اینڈ ٹیکنالوجی، لاہور، ۲۰۱۸ء، ص ۲۰و
۲۶۔ رشید امجد، مٹی کی مہک (افسانہ) مشمولہ: دکھ ایک چڑیا ہے، ص ۱۳۰
۲۷۔ طاہرہ اقبال، اوکاں والا سکول (افسانہ) مشمولہ: زمیں رنگ، ص ۵۲
۲۸۔ محمد حامد سراج، ہونٹ کنارے (افسانہ) مشمولہ: بخیہ گری، ص ۴۳
۲۹۔ محمد حمید شاہد، کوئٹہ میں کچلاک، (افسانہ) مشمولہ: سانس لینے میں درد ہوتا ہے، ص ۲۰
۳۰۔ سلیم آغا قزلباش، زمینیں اور زمانے (قرطاسِ اعزاز) مشمولہ: چہار سو، جلد ۳۰، شمارہ: جنوری ، فروری، ۲۰۲۱ء، ص ۴۶
۳۱۔ نجیبہ عارف، ۹/۱۱ اور پاکستانی اردو افسانہ (منتخب افسانے، انتخاب اور تجزیہ)، پورپ اکادمی، اسلام آباد، ۲۰۱۱ء، ص ۲۶
۳۲۔ محمد حمید شاہد، کوئٹہ میں کچلاک، (افسانہ) مشمولہ: سانس لینے میں درد ہوتا ہے، ص ۲۱
۳۳۔ منظور احمد، محمد حمید شاہد کی ادبی خدمات، مقالہ برائے ایم۔فل، علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی، اسلام آباد، ۲۰۱۵ء (غیر مطبوعہ)، ص
۳۴۔ محمد حمید شاہد، جنگ میں محبت کی تصویر نہیں بنتی!، (افسانہ) مشمولہ: سانس لینے میں درد ہوتا ہے، ص ۱۶۷
۳۵۔ رشید امجد، شہر گریہ (افسانہ) مشمولہ: دکھ ایک چڑیا ہے، ص ۲۰
۳۶۔ ایضاً، ص ۲۰
۳۷۔ خالد فتح محمد، جو چلے تو۔۔۔ (افسانہ) مشمولہ: میں، ص ۱۱۱
۳۸۔ اسد محمد خان، دھماکے میں چلا ہوا بزرگ (افسانہ)، اک ٹکڑا دھوپ کا اور دوسری کہانیاں، القاء پبلشرز، لاہور، ۲۰۱۰ء، ص ۱۰۳
۳۹۔ زبیر شاہ، سید، ہجوم مرگ میں زندگی (افسانہ) مشمولہ: یخ بستہ دہلیز، ص ۱۰۵
۴۰۔ رشید امجد، غالب خستہ کے بغیر (افسانہ) مشمولہ، دکھ ایک چڑیا ہے، ص ۷۹

۴۱۔ رشید امجد، اپنی اپنی بلی (افسانہ) مشمولہ: دکھ ایک چڑیا ہے، ص ۲۴۸

۴۲۔ زبیر شاہ، سید، ابنِ آدم (افسانہ) مشمولہ: خوف کے کتبے، ص ۷۹

۴۳۔ منشایاد، جہاد (افسانہ) مشمولہ: خواب سرائے، ص ۲۰۶

۴۴۔ ابنِ مسافر، ٹریننگ، (افسانہ) مشمولہ: سفر ناتمام (فکشن)، پورب اکادمی، اسلام آباد، ۲۰۱۷ء ص ۸۳

۴۵۔ زاہدہ حنا، جاگے ہیں خواب میں (افسانہ) مشمولہ: رقصِ بسمل ہے، ص ۱۶۹

۴۶۔ محمد ناظم ندوی، مولانا، (تمہید) مشمولہ: کورونا وائرس-عالمی وبا اور مسلمان، صفہ اکیڈمی، مانک مقسہار نپور، ۲۰۲۰ء، ص ۷

۴۷۔ محمد حمید شاہد، طلسم کہن پر گفتگو، مشمولہ: طلسم کہن، خاور چودھری، مثال پبلشرز، فیصل آباد، ۲۰۲۰ء، ص ۱۰

۴۸۔ عامر سہیل، نیا کرونائی معاشرہ اور آج کی کہانی، مشمولہ: طلسم کہن، خاور چودھری، ص ۱۲

۴۹۔ خاور چودھری، ادھوری تصویر، (افسانہ) مشمولہ: طلسم کہن، ص ۱۸

۵۰۔ خاور چودھری، چراہ گاہ، (افسانہ) مشمولہ: طلسم کہن، ص ۲۸

۵۱۔ خاور چودھری، کِرودھ، (افسانہ) مشمولہ: طلسم کہن، ص ۳۳

۵۲۔ خاور چودھری، کونپل کا قتل، (افسانہ) مشمولہ: طلسم کہن، ص ۴۴

۵۳۔ خاور چودھری، وبا، (افسانہ) مشمولہ: طلسم کہن، مثال پبلشرز، فیصل آباد، ۲۰۲۰ء، ص ۹۲

۵۴۔ ایضاً، ص ۹۳

۵۵۔ مہناز انور، ڈاکٹر، اردو افسانے کا تنقیدی مطالعہ، نصرت پبلشرز حیدری مارکیٹ امین آباد، لکھنؤ، ۱۹۸۵ء، ص ۲۸

۵۶۔ شفیق انجم، ڈاکٹر، کھپت۔۔ بیانیہ ہے، (افسانہ) مشمولہ: روشنی آواز دیتی ہے، ص ۴۸

۵۷۔ حمیرا اشفاق، ڈاکٹر، راؤنڈ اباؤٹ (افسانہ) مشمولہ: کتبوں کے درمیان، ص ۱۳۶

۵۸۔ ابنِ مسافر، خاموش جدائی، (افسانہ) مشمولہ: سفر ناتمام، ص ۴۷

۵۹۔ مسعود مفتی، طعنہ، (افسانہ) مشمولہ: وقت کی قاش، ص ۶۸

۶۰۔ ابنِ مسافر، گٹر، (افسانہ) مشمولہ: سفر ناتمام ص ۶۶

۶۱۔ طاہرہ اقبال، جنگل سکرین (افسانہ) مشمولہ: ریخت، ص ۱۹۳

باب چہارم:

اکیسویں صدی میں تغیر پذیر اقدار کے سماجی مضمرات

گزشتہ ابواب میں تغیر پذیر معاشرتی اقدار کے تناظر میں اداروں میں رونما ہونے والی تبدیلیوں اور ان تبدیلیوں کے پس پردہ محرکات جن کی عکاسی منتخب کردہ اکیسویں صدی کے افسانوں میں کی گئی تھی اس کا تحقیقی و تنقیدی جائزہ پیش کیا گیا ہے۔ لہٰذا اس باب میں ان اثرات کا جائزہ پیش کیا جارہا ہے جن سے تبدیلیوں کی بدولت معاشرے پر مثبت اور منفی اثرات مرتب ہوئے کیوں کہ معاشرتی تبدیلی معاشرے پر مثبت اور منفی دونوں طرح کے اثرات مرتب کرتے ہوئے جلوہ گر ہے۔

معاشرتی ہم آہنگی کو فروغ دینے اور تنازعات کو کم کرنے کے لیے معاشرہ تغیرات قبول کرتا ہے۔ اس نظر سے جب ہم اکیسویں صدی کے افسانوی جہاں پر نظر دوڑاتے ہیں تو اندازہ ہوتا ہے کہ دنیا کے دوسرے معاشروں کی طرح پاکستانی معاشرہ بھی تبدیلی کی جانب گامزن ہے۔ معاشرے کو منظم رکھنے کے لیے روایات، اختراعات و تغیرات کی متنوع جہات کو متوازن رکھنے کی ضرورت ہوتی ہے۔ اگر یہ عوامل تعمیری نوعیت کے ہوں گے اور فرد کی انفرادی اور اجتماعی تسکین کا موجب ہوں گے تو لامحالہ معاشرے میں اقدار کی تغیر پذیری مثبت ہو گی اور معاشرہ بتدریج ترقی کی منازل طے کرے گا، لیکن اگر یہی عوامل تخریبی ہوں گے تو معاشرہ غلط سمت میں رواں ہو گا اور اس کا نتیجہ معاشرے کے افراد میں بے سکونی، اضطراب، تنہائی اور خود شکستگی جیسے احساسات کے جنم لینے کی صورت میں عیاں ہو گا۔

الف۔ معاصر افسانے میں پیش کردہ مثبت معاشرتی تبدیلیوں کا جائزہ

اکیسویں صدی میں بدلتی ہوئی اقدار متعدد مثبت پہلوؤں کو جنم دیتی ہیں۔ یہ پہلے سے زیادہ مربوط معاشرے اور عالمی بیداری میں اپنا حصہ ڈالتی ہیں۔ معاشرتی اداروں میں آنے والی تبدیلیوں نے افراد کو نت نئے مواقع مہیا کیے جس سے وہ جدت کی سیڑھی کو عبور کرنے کے قابل ہوئے۔ ٹیکنالوجی نے فرد کی تخلیقی صلاحیتوں کو نکھار کر مساوات کو فروغ دینے میں اہم کردار ادا کیا۔ اس کی مدد سے لوگوں نے اپنے کاروبار میں منافع دیکھا۔ دنیا ایک دوسرے کے اتنا قریب آ گئی کے عالمی گاؤں کا درجہ پا گئی۔ میلوں دوریاں بے مثال عالمی رابطے کی سہولت سے طے ہونے لگیں، خیالات، ثقافتوں، اور جدید اختراعات کو وسیع پیمانے پر فروغ حاصل

ہوا جو اس سے پہلے کبھی نہیں دیکھا گیا تھا۔ ماحولیاتی مسائل کے بارے میں بڑھتی ہوئی بیداری نے پائیدار طریقوں کے لیے اجتماعی عزم کو جنم دیا ہے۔ افراد ایک ذمہ دار انسان ہونے کا ثبوت دینے کے قابل ہو سکے۔ مزید برآں، ابھرتی ہوئی اقدار سماجی انصاف، مساوی حقوق، اور سیاسی ہتھکنڈوں سے آگاہی جیسی سرگرمیوں کو بھی فروغ دینے لگی ہیں، جو مثبت تبدیلی اور ایک زیادہ بہتر اور اصول پرست معاشرے کی تخلیق کے لیے راستے ہموار کرتی ہیں۔ میڈیا کے بڑھتے ہوئے اثر ورسوخ نے فرد کو معاشرے کی ہر دو طرح کی صورتوں سے آگاہی دی۔ یہ آگاہی اور مثبت اثرات اجتماعی طور پر زندگی کے ہر پہلو کو متاثر کرتے ہیں۔ معاشرے کا ہر فرد بااختیار ہونے کی منازل طے کرنے لگا ہے۔ تعلیمی سطح پر نئے علوم اور جدید تقاضوں کی طرف رجحان بڑھا، مذہبی سطح پر روشن خیال معاشرے کو فروغ دینے کی کوششیں کی جانے لگی ہیں۔ معاشرے میں فرد اپنے حقوق کے لیے آواز اٹھانے کے قابل ہوا۔ خواتین کے حقوق کے لیے اقدامات کیے گئے، خواتین یکساں طور پر معاشرتی سرگرمیوں میں حصہ لینے لگیں، لوگ کمانے کے آن لائن ذرائع کی طرف متوجہ ہوئے۔ معاشرے پر ان تبدیلیوں کے مثبت اثرات کو کسی حد تک پچھلے دو ابواب میں افسانوں کی روشنی میں بیان کیا گیا ہے۔

ان مثبت تبدیلیوں کے باوجود بھی چوں کہ پاکستانی معاشرہ ترقی کی منازل طے کرنے کے بجائے معاشرتی انتشار اور انحطاط کی طرف گامزن ہے لہٰذا معاشرتی اثرات کے تناظر میں اس باب میں ان مسائل کا احاطہ کیا گیا ہے جو معاشرے میں ترقی کی راہ میں رکاوٹ بن رہے ہیں نیز اس سے فرد کی نفسیاتی اور معاشرتی زندگی پر کیا اثرات مرتب ہو رہے ہیں اس کا جائزہ بھی لیا گیا ہے۔ اَیلون ٹوفلر "مستقبل کا صدمہ میں" تیز رفتار تبدیلی کے معاشرے پر نتائج کے ضمن میں لکھتے ہیں کہ:

> "تبدیلی کی اتنی ایک طاقت ور طوفانی لہر ہے، جو اداروں کو درہم برہم، اقدار کو تبدیل اور ہماری جڑوں کو ناکارہ کر دیتی ہے۔۔۔ ہمارے عہد میں تبدیلی کی شرح، رفتار کے بجائے خود ایک عنصری قوت ہے۔ اس تیز رفتار دھچکے کے، ذاتی اور نفسیاتی اثرات کے ساتھ ساتھ عمرانیاتی اثرات بھی ہوتے ہیں۔"(۱)

ایک طرف ٹیکنالوجی اور عالمگیریت کا اثر رسوخ تو دوسری طرف پاکستانی معاشرے میں تقسیم کے بعد سے اب تک آنے والے اتار چڑھاؤ اور مجموعی صورت حال کی وجہ سے خاصی تبدیلیاں رونما ہوئی ہیں۔ علاقائی تنازعات، فوجی بغاوتوں اور سیاسی چپقلش سے تشکیل پانے والی ہنگامہ خیز تاریخ نے پاکستانی معاشرے کے تانے بانے پر انمٹ نقوش چھوڑے ہیں۔ اس پس منظر میں، اہم تبدیلیاں رونما ہوئی ہیں، جو قوم کے

ثقافتی، آبادیاتی اور اقتصادی منظر نامے کو متاثر کر رہی ہیں۔ ان تاریخی واقعات کے کثیر جہتی نتائج کی روشنی میں پاکستانی افسانہ نگاروں نے پاکستانی معاشرے کی شناخت اور کردار کا محاسبہ کیا ہے۔ اس تبدیلی کے محرکات کا جائزہ ڈاکٹر مبارک علی نے اپنی کتاب پاکستانی معاشرہ میں پیش کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

> "پاکستان کا معاشرہ وقت کے ساتھ تبدیل ہو رہا ہے مگر اس تبدیلی کی تہہ میں جو نظریات ہیں وہ اس تبدیلی کو مثبت بنانے کے بجائے، اس کو اور زیادہ پس ماندگی کی جانب لے جا رہے ہیں، اگر ہم خرابی کی جڑوں سے واقف ہو جائیں تو اس صورت میں اس کا علاج ممکن ہے۔"(۲)

افسانے کے مطالعے سے عیاں ہوتا ہے کہ پاکستانی معاشرے میں اس وقت ہمیں دو طرح کے رجحانات دیکھنے کو ملتے ہیں؛ جیسے معاشرہ دو یا دو سے زیادہ حصوں میں تقسیم ہو گیا ہو۔ ہم عصر افسانوی ادب کا مطالعہ سماج کی آج کی سچائیوں سے روشناس کروانے میں معاون ہے۔ ادیب معاشرے کی ان سچائیوں کو دیدہ و دل کے ساتھ فنی قالب میں ڈھالتے ہوئے سمیٹ کر فرد کو ادراک و عرفان کی بلندی تک لے جانے میں اہم کردار ادا کر رہا ہے۔

ب۔ معاصر افسانے میں پیش کردہ منفی رجحانات کا جائزہ

اکیسویں صدی میں بدلتے ہوئے حالات اور اقدار کے کچھ منفی پہلو بھی سامنے آئے ہیں جن پر غور کرنے کی ضرورت ہے۔ معاشرے میں عائلی زندگی کے مسائل پیدا ہوئے۔ جن میں بڑھتے ہوئے خلع و طلاق کے مسائل، رشتوں میں دراڑیں، کشیدہ تعلقات اور لڑکیوں کے رشتوں کے مسائل شامل ہیں۔ اسی طرح معاشرتی اور اقتصادی مسائل میں بے روزگاری، مہنگائی اور جرائم بڑھ گئے جس کی وجہ رشوت خوری اور لاقانونیت جیسے افعال ہیں۔ سادگی کی جگہ نمود و نمائش نے لے لی، انسان کی زندگی مشینی ہو گئی، بہت سے نفسیاتی مسائل پیدا ہوئے جن میں تنہائی، بے یقینی اور مایوسی کی کیفیات شامل ہیں، اس کے علاوہ جدیدیت کی ریل پیل میں معاشرہ اخلاقی انحطاط کا شکار ہونے لگا۔

ٹیکنالوجی کے وسیع اثر و رسوخ، خاص طور پر سوشل میڈیا کے ہر سطح پر استعمال کے ذریعے بہت سے چیلنجز سامنے آئے ہیں جو عصری معاشرے کو نمایاں طور پر متاثر کر رہے ہیں۔ اس کا منفی استعمال دن بدن بڑھتا جا رہا ہے۔ سب سے زیادہ پریشان کن مسائل میں سے ایک آن لائن ہراساں کرنا ہے۔ گل زیب عباسی کا

افسانہ "فیس بک " ٹیکنالوجی کی المناک جہتوں کی نشاندہی کرتا ہے جس میں سب سے بڑا سوشل میڈیا پلیٹ فارم فیس بک ہے جس پر دھوکا دہی اور ہیرا پھیری کے متعدد واقعات سامنے آچکے ہیں۔ گل زیب عباسی نے انہی واقعات میں سے ایک کو فکری وسعتوں کے ساتھ بیان کرتے ہوئے ٹیکنالوجی کے سنگین نتائج سے آگاہی فراہم کی ہے جو ٹیکنالوجی کے غلط استعمال سے پیدا ہونے والے سماجی اثرات کو اجاگر کرتا ہے۔ کہانی میں نوجوان لڑکی جو کہانی کا مرکزی کردار ہے، فیس بک پر محبت کے جانسے میں آجاتی ہے اور اپنے والدین کا گھر چھوڑ کر بھاگ جاتی ہے۔ اس کے بعد وہ جن لوگوں کے ہاتھ لگتی ہے وہ اسے بتاتے ہیں کہ اسے دھوکے سے بیچ دیا گیا ہے۔ انسانی سمگلنگ کی یہ صورت ایسی ہے جس میں معصوم لڑکیاں اپنے آپ پھنستی چلی جاتی ہیں اور ان کے پاس واپسی کا کوئی راستہ نہیں رہتا۔

> "وہ بڑا بے غیرت اور چال باز آدمی ہے۔ فیس بک پر لڑکیوں سے دوستی کر کے، محبت کا جھانسہ دے کر برباد کر دیتا ہے۔ تم سے پہلے دو لڑکیاں بیچ چکا ہے۔ وہ ادھر رہتا ہی نہیں، کوئی نہیں جانتا کہاں کا ہے۔ فیس بک پر رابطے کرتا ہے۔۔۔ میں بھی تیری پچیس ہزار روپے قیمت دے چکا ہوں۔ "(۳)

بڑی سطح پر اس حوالے سے ہونے والے فراڈز کو لے کر لوگوں میں شعور آرہا ہے لیکن پھر بھی بہت سی معصوم بچیاں نادانستہ طور پر اس گرداب میں پھنستی جارہی ہیں۔ جہاں ایک طرف سوشل میڈیا نے لوگوں کو باشعور بنانے میں اہم کردار ادا کیا ہے، لوگوں کے رویوں میں تبدیلی آئی، ایک دوسرے کے لیے ہمدردی کے جذبات پیدا ہوئے وہیں ہماری ان قدروں کو زوال پہنچا جس میں دھوکا دہی اور فریب سنگین جرائم سمجھے جاتے تھے۔ سوشل میڈیا پر اب فیک آئی ڈی یا اکاؤنٹ بنانا، اپنی اصلی شناخت کو چھپا کر رکھنا، لڑکی کا لڑکا بن کر اور لڑکوں کا لڑکی بن کر بات کرنا ایک عام سی بات سمجھی جانے لگی ہے۔ صرف لڑکے ہی نہیں بلکہ لڑکیاں بھی ان ذرائع پر لڑکوں سے دوستی کرتی ہیں اور پھر ان کو لوٹتی ہیں۔ جرائم کی صورتیں بدل گئی ہیں لیکن معاشرے سے جرائم ختم نہیں ہوئے۔ منشایاد نے " نظر آلباسِ مجاز میں " بیانیہ انداز میں تحریر کردہ افسانے کی کہانی کے پس منظر میں انٹرنیٹ اور اس کے ذریعے دیے جانے والے دھوکے اور فریب کو موضوع بنایا ہے کہ کیسے دورِ حاضر میں جعل سازیوں کے نئے نئے طریقے متعارف ہوئے ہیں۔ کون اپنا ہے کون بیگانہ اس نے سب کی پہچان مسخ کر دی ہے۔ افسانے میں تین مرکزی کردار ہیں نوید کہانی کا راوی ہے، عالیہ نوید کی نہ صرف محبوبہ ہے بلکہ گھر والوں کی مرضی کے خلاف دونوں کورٹ میرج کرنے کی خواہش رکھتے ہیں لیکن اسی دوران عالیہ کی موت

ہو جاتی ہے۔ رحیلہ عالیہ کی چھوٹی بہن ہے۔ فیس بک کی دنیا میں دونوں نسوانی کردار فرضی ہیں۔ نوید عالیہ کی موت کے غم میں اپنی الگ دنیا بنالیتا ہے اور عالیہ کے نام سے آئی ڈی اور ویب گاہ تشکیل دے کر اس پر عالیہ کی شاعری محفوظ کرتا رہتا ہے جس پر بہت سے سچے جھوٹے لوگ اسے عالیہ سمجھتے ہوئے اس پر فریفتہ ہو جاتے ہیں یوں نوید جانے انجانے میں بہت سے لوگوں کو دھوکا دینے کا مرتکب ٹھہرتا ہے۔ مگر نوید خود بھی اس چکرویو میں رحیلہ کے ہاتھوں دھوکا کھا جاتا ہے۔ رحیلہ عالیہ بن کر اسے دھوکا دیتی ہے۔ مختصر یہ کہ افسانے کی کہانی معاشرے کے ان کرداروں کا چلتا پھرتا نمونہ ہے جو آپ کے بہت قریبی ہونے کے باوجود آپ کے اعتبار کو روندتے ہوئے ایسے دھوکا دے جاتے ہیں کہ آپ اس کا گمان بھی نہیں کر سکتے۔ انٹرنیٹ کے اس پہلو کو قلم بند کرتے ہوئے منشایاد تحریر کرتے ہیں کہ:

> "دنیا اگر توہم کا کارخانہ ہے تو انٹرنیٹ جھوٹ اور جعل سازیوں کی فیکٹری۔ کہتے ہیں جہاں لالچ وہاں ٹھگ۔ انعامات، تحائف اور لاٹریاں۔ چند ڈالروں کے عوض کروڑپتی بننے کے نسخے ہوس کو ہے نشاطِ کار کیا کیا، ٹھگوں کو ٹھگنے والے ٹھگ۔ ویب کے سمندر میں ہر طرف مچھلیاں پکڑنے کی کنڈیاں۔۔۔ خلوص سے تہی دوستیاں اور وفا سے خالی محبتیں۔ بوڑھے نوجوان بن کر اور لڑکے لڑکیاں جنس بدل کر اور جعلی کوائف بتا کر ایک دوسرے کو دھوکا دیتے"(۴)

انسان جذبات سے عاری مشینی زندگی میں کھو گیا ہے۔ سوشل میڈیا پلیٹ فارمز جس نے لوگوں کو جوڑنے کا کام تو کیا لیکن یہ غلط معلومات کی افزائش کی بنیاد بھی بن چکے ہیں۔ جھوٹی یا گمراہ کن معلومات جس آسانی سے آن لائن پھیلتی ہیں ان کے سچے یا جھوٹے ہونے کی خبر لگانا مشکل ہو گیا ہے۔ اسی طرح ان ذرائع کی مدد سے جرائم پیشہ افراد نے فراڈ کے نت نئے طریقے متعارف کروائے ہیں۔ لائکس، شیئر اور کمنٹس پر زور حقیقی انسانی تعامل کا ایک مسخ شدہ تاثر پیدا کرتا ہے اس نے جہاں جغرافیائی خلا کو پر کیا جس سے دور بیٹھے شخص سے تو رابطہ آسان ہو گیا مگر وہیں قریبی رشتوں میں دوریاں آ گئیں۔ لوگوں کے ایک دوسرے سے جذباتی تعلقات ختم ہو گے۔ سوشل میڈیا سے پھیلنے والی افراتفری سے انسان کی زندگی میں بے سکونی کا بھونچال آ گیا ہے۔ محمد حامد سراج نے افسانہ "نصف مکمل" کے ذریعے ترقی یافتہ عہد میں انسان کی زندگی میں پائے جانے والے خلا کو موضوع بنایا ہے۔ فرد کی نئی ہیجانی کیفیت، سوشل میڈیا کے مثبت اور منفی اثرات کو اجاگر کرتا ہوا افسانے کا منتخب متن ملاحظہ ہو:

"اس موبائل نے بھی جان عذاب میں ڈال دی ہے۔ سہولت اپنی جگہ، پل پل رابطہ بھی مان لیا لیکن عذاب بھی تو کم نہیں۔۔۔ کیسا رابطہ، رابطہ ہوتے ہوئے بھی انسان رابطے میں نہیں۔ گھر سے گھر جڑے ہیں۔ آواز، آواز میں پیوست ہے لیکن دل صدیوں کی دوری پر کھڑے اس چند فٹ کے انسان کو حیرت سے دیکھ رہے ہیں کہ یہ کیا کر رہا ہے اور کرنے کے ارادے کیا رکھتا ہے۔"(۵)

یہاں نمود و نمائش نے زور پکڑا تو دوسری طرف لوگوں میں حسد کی ہوا بھی تیزی سے پھیلنے لگی۔ ٹیکنالوجی کے مثبت پہلوؤں کو بروئے کار لاتے ہوئے اس کے منفی نتائج کو کم کرنے کے لیے اہم اقدامات کیے جاسکتے ہیں۔ جرائم کی روک تھام اور اس سے بچاؤ کے لیے حکومتی سطح پر اقدامات کی ضرورت ہے۔ سائنس اور ٹیکنالوجی کی ترقی نے بلاشبہ جسمانی تندرستی اور مادی آسودگی میں نمایاں بہتری لانے میں اہم کردار ادا کیا ہے۔ طب، مواصلات، نقل و حمل اور دیگر مختلف شعبوں میں ایجادات نے زندگی کے روزمرہ کاموں کو زیادہ آسان اور بہتر بنا دیا ہے۔ فرمان فتح پوری نے ٹیکنالوجی کی اس حقیقت کو تسلیم کرتے ہوئے اس سے پیدا ہونے والی ذہنی الجھنوں کی بھی نشان دہی کی ہے۔ وہ لکھتے ہیں: سائنس اور ٹیکنالوجی کی ترقی نے جسمانی اور مادی آسائشوں کے ساتھ ساتھ ذہنی الجھنوں میں بھی اضافہ کیا۔(۶) تبدیلی کی یہ تیز رفتار لہر ذہنی تناؤ اور الجھنوں کا باعث بنتی ہے۔ عصر حاضر میں ٹیکنالوجی کے منفی اثرات خطرناک حد تک ازدواجی زندگی پر اثر انداز ہو رہے ہیں۔ سید زبیر شاہ نے افسانہ "مرگِ آرزو" میں معاشرے کے دو ایسے کرداروں کی کہانی بیان کی ہے جن کی شادی کو ابھی صرف پانچ سال گزرے ہیں ان کی زندگی موبائل کی وجہ سے کن مسائل سے دوچار ہے اس کی عکس بندی کرتے ہوئے انسانی نفسیات اور جبلّت کو موضوع بنایا ہے۔ رابعہ اور اس کے شوہر میں ہونے والے جھگڑوں کے پیچھے بھی موبائل پر موجود حسین و جمیل لڑکیاں ہیں۔ رابعہ کا شوہر رابعہ میں وہی حسن تلاش کرتا رہتا ہے لیکن اس کی تفریح طبع کے لیے وہ رومانویت اور حسن جو اس کے شوہر کو درکار ہے رابعہ اس کا مقابلہ کرنے میں ناکام ہو جاتی ہے۔ یہ ان نفسیاتی مسائل کو اجاگر کرنے میں معاون ہے جس کی بنیاد پر آج ہر گھر میں پیچیدگیاں پیدا ہو رہی ہیں۔ رابعہ کے شوہر نے اپنی جذباتی تسکین کے لیے جو رویہ اختیار کیا اس کو کہانی میں یوں پیش کیا گیا ہے:

"اس کے لیے اس نے موبائل میں دنیا بھر کی حسین و جمیل لڑکیوں کی ایسی ایسی تصویریں جمع کر رکھی تھیں جن کے جسمانی خدوخال سے خود بخود غزل کے مصرعے اور

نظموں کے مضامین نکل رہے تھے۔ ہر اپسرا کی کوئی نہ کوئی خوبی ایسی تھی جس پر لازوال شعر کہے جاسکتے تھے لیکن جب وہ دیکھتا کہ خواب و خیال سے باہر اس کی حقیقی زندگی پر رابعہ جیسی معمولی شکل و صورت اور غیر رومانوی لڑکی کا قبضہ ہے تو اس کے اندر کا شاعر احتجاجاً چپ سادھ لیتا۔ موبائل میں موجود دوشیزاؤں کو دیکھنے کے بعد جب اس نے رابعہ کے گول چہرے پر نظر ڈالی تو اس کی موٹی سی ناک یوں دکھائی دے رہی تھی جیسے کسی نے کوئی مصنوعی گولہ وہاں پر رکھ دیا ہو۔"(۷)

اسی طرح دفتر کی تھکاوٹ کو دور کرنے کے لیے وہ گھر کا رخ کرنے کے بجائے سینما ہال کی طرف چلا گیا جہاں بڑی سکرین پر ہوش ربا رقص کے جلوے دیکھنے کے بعد بھی وہ گھر جانے کو ترجیح نہیں دیتا بلکہ دیر تک سڑکوں پر آوارہ گردی کرتا رہا۔ اس کہانی کے ذریعے زبیر شاہ نے انسان کی ناختم ہونے والی آرزؤں کا حال تو بیان کیا ہی لیکن سوشل میڈیا پلیٹ فارمز پر موجود حسن نے معاشرے میں کس طرح کے چیلنجز پیدا کیے ہیں ان کو بھی پیش کیا ہے۔ رشتوں کا تقدس پامال ہونے لگا ہے۔ ایک وہ دور تھا جس میں لوگوں کے درمیان محبت اور امن کی فضا تھی رابطے محدود تھے لیکن تعلقات وسیع تھے جس کو عصر حاضر کی مشینی زندگی نے چھین لیا ہے۔ اب دولت کے کے پیچھے بھاگتے انسانوں کی بے اعتنائی کو افسانہ نگاروں نے موضوع بنایا ہے۔ جدید معاشرتی ترقی اور مالی استحکام نے سادگی کے بجائے تکلف اور تصنع کو فروغ دیا۔ مشینی ترقی کی وجہ سے مصنوعات میں اضافہ ہوا۔ ترقی یافتہ ممالک نے اپنی مصنوعات کو فروغ دینے کے لیے اور لوگوں کو ان کی طرف متوجہ کرنے کے لیے طرح طرح کے طریقے نکالے جس سے برینڈ کلچر کو فروغ ملا اور معاشرتی زندگی رشتوں کے بجائے برانڈ کلچر کی مرہون منت ہو کر رہ گئی۔ پیسے کی چکا چوند اور زندگی کی مصنوعی قدروں نے رشتوں کو پامال کر دیا یوں رشتوں میں بھی ہوس اور لالچ کو فروغ ملا۔ محمد حامد سراج افسانہ سیاہ کار میں اس بدلتی ہوئی صورت حال کے منفی اثرات کو ان الفاظ میں سمیٹتے ہیں:

"ہر شخص کی امارت کا اندازہ کار کے ماڈل سے آسانی سے لگایا جا سکتا ہے۔ اس آبادی کے مکینوں کو ایک دوسرے کی کوئی خبر نہیں۔ ہمسایہ ہمسائے سے بے خبر ہے۔ سورج کب نکلتا اور کب غروب ہوتا ہے کسی کو خبر نہیں۔ یہاں صرف امارت کی چمک میں زندگی گزارنے کا چلن ہے۔"(۸)

سیاہ کار افسانے میں بظاہر تو سیاہ رنگ کی گاڑی کی بات ہے لیکن اس کے سیاق میں جس بیانیہ کو تشکیل دیا گیا ہے وہ اس عنوان کے علامتی مفہوم کو اجاگر کرتا ہے۔ افسانے کی کہانی میاں بیوی کے کردار سے آگے بڑھتی ہے یہ دونوں ملازمت پیشہ ہیں، دونوں کے ادارے جن میں یہ کام کرتے ہیں مخالف سمت میں ہیں یوں دونوں ایک دوسرے کی سرگرمیوں سے انجان رہتے ہیں۔ دن بھر کی مصروفیت کے چلتے کام سے تھکے آتے ہیں تو بستر تک جاتے ہی سو جاتے ہیں کیوں کہ اگلے دن پھر ملازمت پر جانا ہے۔ یہی ان کا معمول بن گیا ہے۔ جو دونوں میں دوری بڑھتی ہوئی دوریوں کا سبب ہے۔ دونوں ہی یکسانیت اور بوریت کی زندگی میں کچھ منفرد کرنے کو ترجیح دیتے ہیں۔ دونوں کی ایک دوسرے میں دلچسپی ختم ہو جاتی ہے۔ بیوی کسی دوسرے مرد اور مرد کسی دوسری خاتون کے ساتھ وقت گزاری میں مشغول نظر آتے ہیں۔ افسانہ نگار نے بڑی مہارت سے زندگی کی اس ستم ظریفی کو بیان کیا جو رشتوں میں اترتی خزاں کا سبب بن رہی ہے۔ دونوں کردار اپنی اپنی جگہ غیر محرم رشتوں میں راحت محسوس کر رہے تھے۔ کہانی کے اختتام تک آتے آتے قاری کو پتا چلتا ہے کہ جن غیر محرم مخالف سمت رشتوں کے ساتھ دونوں میاں بیوی مشغول ہو چکے ہیں وہ بھی آپس میں اسی رشتے میں منسلک ہیں اور ان کی ذاتی زندگی بھی اسی طرح بے رنگ تھی۔ یوں یہ کہانی رشتہ ازدواج میں منسلک دو کرداروں کی کہانی سے نکل کر معاشرے کی اجتماعی کہانی ہونے کی چغلی کھا رہی ہے۔ افسانہ نگار نے ملازمت پیشہ مرد اور خواتین کی نجی زندگی کس ڈگر پر چلنے لگی ہے، اس میں سرایت کرتی دوریوں کے مہلک نتائج کو بھی اس افسانے کا موضوع بنایا ہے۔ بدلتے حالات کے تناظر میں ازدواجی تعلقات میں ایک دوسرے سے بیگانگی کا عنصر ازدواجی زندگی پر غالب آتا جا رہا ہے۔ حمید شاہد کے افسانوی مجموعے مرگ زار میں شامل افسانہ "رکی ہوئی زندگی" ایک ایسے ہی جوڑے کی کہانی ہے جن کا ازدواجی تعلق وقت اور حالات کے ساتھ مضبوط ہونے کے بجائے جذباتی سطح پر دوری کی طرف بڑھ رہا ہے۔ افسانے میں عاطف (میاں) اور شائستہ (بیوی) کا کردار عصر حاضر کے انسانی رشتوں کے تضاد، رشتوں کی بے توقیری اور بے حسی کے غماز ہیں۔ عاطف ایک خاتون روبی پر اپنے جذبات نچھاور کر رہا ہے اور شائستہ اپنی زندگی کی ناآسودگی اپنے شوہر کے بچپن کے دوست میں تلاش کر لیتی ہے۔ حمید شاہد کے افسانوی مجموعے "آدمی" میں شامل افسانہ "کیس ہسٹری سے باہر قتل" بھی ازدواجی زندگی میں پیدا ہونے والے خلا اور اس کے محرکات کو اجاگر کرتا ہے۔ افسانے کے آغاز سے ہی وہ وجوہات آشکار ہو جاتی ہیں جو رشتوں کی بے اعتنائی کا سبب بنی۔ اس کہانی میں ڈاکٹر نوشین اور ڈاکٹر نعمان جو رشتہ ازدواج سے منسلک ہیں عہد حاضر کے نمائندہ کرداروں کے طور پر اجتماعی صورت حال کے عکاس ہیں۔

انہوں نے باہمی مشقت سے زندگی کی آسائشیں تو حاصل کر لی لیکن اس دوڑتی زندگی میں یہ دونوں کردار اس قدر مشغول نظر آتے ہیں کہ جو سفر ایک دوسرے کی زندگی میں خوشحالی کے خواب سے شروع ہوا تھا اس کا اختتام ایک دوسرے سے بے پرواہی کی صورت میں ہوتا ہوا نظر آتا ہے۔

انسان کا مادیت کی طرف رجحان بڑھتا جا رہا ہے۔ بلند معیار زندگی اور بہتر سے بہتر کی تلاش میں انسان سرگرداں رہتا ہے۔ رشید امجد کے افسانے "آخری چھلانگ" کا یہ حصہ کہ "ابو ڈیفنس میں گھر تو نہیں بنا سکے لیکن اس کے قبرستان میں ضرور پہنچ گئے۔"(۹) معاشرے میں مادیت پرستی کی طرف بڑھتے ہوئے رجحان پر غور طلب بیانیہ ہے کہ اب انسان کے پاس سب کچھ ہے لیکن پھر بھی وہ خوش نہیں ہے۔ ڈیفنس ایک پوش متمول علاقے کی علامت ہے جو مادی دولت اور سماجی حیثیت سے منسلک ہے، یہ مادی کامیابی کی خواہش اور ایک مخصوص طرز زندگی کو ظاہر کرتا ہے۔ جہاں گھر بنانے کی تگ و دو جس کے لیے اس کے والد نے ساری زندگی وقف کر دی اور آخر وہاں گھر تو نہ بنا سکے مگر وہاں کے قبرستان تک ضرور پہنچ گئے۔ مادی کامیابی حاصل کرنے کی خواہشات اور کوششوں کے باوجود بالآخر موت میں سب کا ایک ہی انجام ہوتا ہے اس کی علامت بن جاتا ہے کہ مادی املاک اور معاشرتی حیثیت موت کے سامنے عارضی اور غیر اہم ہے۔ یہ مادی حصول کو ترجیح دینے کے انسانی رجحان کی عکاسی کرتا ہے۔ انسان کی مادی کامیابی کے لیے انتھک جستجو رشید امجد کے افسانے "دشت تمنا" میں بھی دیکھنے کو ملتی ہے جس کا مرکزی کردار ایک بہترین گھر کا مالک ہونے کے باوجود اس بات کی خواہش کرتا ہے کہ کاش کنال جگہ ہوتی تو دس مرلے لان کے لیے چھوڑتا اور دس مرلے میں گھر تعمیر کرتا۔ فرد کے طرز عمل اور اس کے رد عمل کے حوالے سے اسی طرح کی فکر انگیز صورت حال پر ایک اور اقتباس ملاحظہ ہو:

> "گھر کے خرچے میں سے پیسہ پیسہ جوڑ کر اور نئی کمیٹی ڈال کر اتنی رقم جمع کر لی کہ پرانی کار بیچ کر نئی گاڑی لی جا سکے۔ پہلے دن نئی گاڑی چلاتے ہوئے اور ہی مزہ آیا۔ واہ کیا بات ہے۔ لیکن اسی لمحے خیال آیا اور پیسے ہوتے تو بڑی گاڑی لیتے۔ سڑک پر قریب سے گاڑیاں گزرتیں تو اسے عجب بے بسی اور بے وقعتی کا احساس ہوتا۔"(۱۰)

دشت تمنا کا یہ بیانیہ بدلتے ہوئی سماجی اقدار کے اثرات کا تجزیہ کرنے میں بنیاد فراہم کرتا ہے۔ نئی کار ہونے کے باوجود اسے اپ گریڈ کرنے کی خواہش اور دوسروں کی طرف دیکھتے ہوئے مایوسی وسیع تر سماجی رجحان جس میں کردار کا رد عمل دولت کی وجہ سے فرد کی حیثیت کا اندازہ لگانے اور اس کے معیارات متعین کرنے کے لیے سماجی دباؤ کو ظاہر کرتا ہے۔ انفرادی خواہشات کی طرف توجہ مرکوز کرنے والے اس تبدیلی

کے عنصر کو سماجی اقدار میں وسیع تر تبدیلیوں کی عکاسی کے طور پر دیکھا جا سکتا ہے، جو اقتصادی تبدیلیوں، عالمگیریت اور صارفی ثقافت کے پھیلاؤ جیسے عوامل سے متاثر ہے۔ یہ افسانہ اس بات پر غور کرنے کی طرف آمادہ کرتا ہے کہ کس طرح معاشرے پر برانڈ کلچر (Brand) کے ابھرنے اور پھیلنے کے منفی نفسیاتی اثرات مرتب ہوئے ہیں جو سماجی اقدار، لوگوں کی کامیابی، خود کی قدر اور خوشی کے حصول کے تصورات کو متاثر کرتے ہیں۔ برانڈ کلچر کا بڑھتا ہوا اثر مادیت پسندانہ ذہنیت کو فروغ دے رہا ہے، جہاں افراد برانڈڈ اشیا سے اپنی عزت نفس اور سماجی حیثیت کو جوڑتے ہیں۔ منشا یاد کے افسانے "معاف کرو" کا مرکزی کردار بھی انہی خواہشات کے گرداب میں ہے۔ اس افسانے میں عید کی اجتماعی دعا میں مانگی جانے والی دعائیں دورِ جدید کے فرد کی حاجتوں، ضروریات اور خواہشات کی عکاس ہیں۔ اس کے برعکس اگر انسان کو کسی غریب کو دینا پڑے تو اس وقت اس کے رویے کو بھی آشکار کیا گیا ہے۔ دعا کے وقت مرکزی کردار کی جن خواہشات کا اظہار کیا گیا ہے وہ افسانے کے اس منتخب حصے میں ملاحظہ ہوں:

> "آنکھوں کے سامنے نئے ماڈل کی وہ کار گھوم گئی جو اس نے کچھ روز پہلے اپنے ایک رشتے دار کے ہاں دیکھی تھی۔ پھر اسے پلازما ٹیلی ویژن کا خیال آیا جس کا اشتہار آج کے اخبار میں نمایاں جگہ چھپا ہوا تھا اور عید کی خوشی میں اس کی قیمت میں خاص رعایت کا اعلان کیا گیا تھا۔"(۱۱)

عوام کی زندگی میں یہ حالات اس وقت پریشانی کا باعث بنتے ہیں جب لوگ بدلتے ہوئے رجحانات اور ایک مخصوص طرز زندگی کو برقرار رکھنے کے لیے دباؤ محسوس کرتے ہیں۔ اکثر لوگ اپنے مالی وسائل سے باہر دوسروں لوگوں کے پاس موجود اشیا کی بنیاد پر ان سے متاثر ہوتے ہیں اور ان کی زندگی سے موازنہ کرتے ہیں۔ اس مسلسل موازنہ کے نتیجے میں خود اعتمادی میں کمی، احساس کمتری اور زندگی معاشرتی معیارات کے مطابق نہ ہونے کا احساس فرد پر نفسیاتی اثرات مرتب کرتا ہے۔ حسن منظر کے افسانے "بکھیڑا" کا مرکزی کردار محمد احمد، عرف مما متوسط طبقے سے تعلق رکھنے والا کاریگر ہے۔ جو معاشرتی دباؤ اور بہترین زندگی گزارنے کی تگ و دو میں اپنی روایتی اقدار کو پس پشت ڈال دیتا ہے یہ وہ اقدار تھیں جو اسے غریبوں کا کام سستے داموں کرنے اور اپنے لوگوں کو خوشی پہنچا کر سکون کی صورت حاصل ہوتی تھی لیکن نفسا نفسی کے اس دور میں جب وہ غیروں کے لیے کام کرنے لگتا ہے تو اسے احساس ہوتا ہے کہ اس میں اسے پیسہ تو مل رہا ہے لیکن وہ خوشی جو اپنوں کے کام آ کر حاصل ہوتی تھی اب نہیں ہو رہی اسی لیے وہ دولت کے پیچھے بھاگتے معاشرے کے ان

عناصر کو بکھیرا قرار دیتا ہے۔ حسن منظر نے افسانے کے ذریعے معاشرے کے ان تلخ حقائق کی تصویر کشی کی ہے جو فرد کو دولت کے حصول کی طرف راغب کرتے ہیں۔ سرمایہ دار طبقہ معاشرے میں اپنی حیثیت، مقام اور رُتبہ برقرار رکھنے کے لیے نئے برانڈز اور رجحانات سے باخبر رہنے کی کوشش کرتے ہیں۔ لوگوں کا برانڈ کلچر کے ذریعہ وضع کردہ ایک مخصوص طرز زندگی کا تعاقب ضرورت سے زیادہ اشیا پر خرچ کرنے کا باعث بنتا ہے۔ حمیرا اشفاق نے افسانے "راؤنڈ اباؤٹ" میں ایک ایسی لڑکی کے مسائل بیان کیے ہیں جو جدید دور میں جہاں عورت کے تحفظ کے لیے مختلف ویلفیئرز سرگرم عمل ہیں ان پر طنز کرتی ہے کہ وہ ان کو تحفظ دینے کے لیے اس صورت میں تیار ہیں جب وہ اپنے کلیجے کے ٹکڑوں بچوں سے جدا ہو جائیں۔ اسی سیاق میں برانڈز کے اثر رسوخ کو بھی اجاگر کیا گیا ہے۔ لڑکی اپنی بیٹی کے لیے ان شوروم کی طرف دیکھتی جن سے خریداری اس کے اختیار میں نہیں تو اس پر راوی اور لڑکی کے مابین ہونے والا مکالمہ اس اسراف سے متاثر ہونے والے غریب طبقے کی خواہشات کی اس طرح سے عکاسی کرتا ہے۔

> "میں نے اسے کہا مہنگے شوروم میں مت جھانکا کرو۔ یہاں وہاں کئی سستے بازار بھی لگتے ہیں۔ اس نے مجھے پلٹ کر جواب دیا: "ماں ہوں نا! اس لیے ہر مہنگی اور اچھی شے ہی بیٹی کے لیے اچھی لگتی ہے۔ سستے بازار کی طرف تو تن ڈھکنے کی ضرورت دھکیلتی ہے۔"(۱۲)

اس پُرجوش مکالمے میں معاشرتی توقعات سے پردہ اٹھایا گیا ہے جو معاشرتی اصولوں اور برانڈ کلچر کے اثر کو واضح کرتا ہے۔ ان منفی نفسیاتی اثرات سے معاشرے کو نکالنے کے لیے توازن قائم کرنے اور سادگی کو اپنانے پر زور دینے کی ضرورت ہے۔ تقریباً ہر افسانہ نگار کے ہاں ہمیں برانڈ کا ٹیگ نظر آتا ہے۔ مثلاً طاہرہ اقبال کے افسانے "کارنامہ" سے اقتباس دیکھیے:

> "امپورٹڈ ہونڈا کار کے طاقت ور اے سی نے جب کام کرنا چھوڑ دیا۔ لسلسی ٹانگوں والے پسینے کے کیڑے برینڈڈ شرٹ کے کالر میں گھس کر ڈنک مارنے لگے، تو اسے احساس ہو گیا کہ وہ چک چوالیس کے قریب پہنچ چکا ہے۔"(۱۳)

معاشرے کے عصری تقاضوں کے مطابق اعلیٰ ڈگریاں، تمغے کچھ معنی نہیں رکھتے۔ آج کل لوگ انسان کی حیثیت کا اندازہ اس کے رکھ رکھاؤ گھر بار سے لگاتے ہیں۔ ڈاکٹر شفیق انجم کا افسانہ "دنیا دکھ ہے" اسی سیاق کو پیش کرتا ہے۔ اس کہانی کا مرکزی کردار جب سکول کے زمانے میں اعلیٰ نمبروں سے کامیابی حاصل کرتا تھا تو لوگ رشک کرتے دن بھر وہ محنت کرتا کھیتوں پر کام بھی کرتا پڑھتا لکھتا، لوگ تالیاں بجاتے۔ ماں کو

لگتا اس کے بیٹے کے لیے پورا گاؤں اپنی بیٹی دینے کو تیار ہو گا۔ جب کہ بیٹا جانتا تھا زمانہ بدل چکا ہے اس کی ماں سادہ لوح ہے وہ کیا جانے کہ لوگوں کو چمکتی لشکتی زندگی کے سامنے یہ سب کچھ نظر نہیں آتا۔ آج کل لوگ مادی آسائش زندگی کو ترجیح دیتے ہیں۔ اس کی ماں بھول جاتی ہے کہ وہ کوئی جاگیر دار طبقے سے تعلق نہیں رکھتی بلکہ مزارعے کی بیوی ہے۔ اس طرح تعلیم یافتہ ہونے اچھی شکل و صورت اور ملازمت کے باوجود اس کی زندگی ایک نیا اور تکلیف دہ موڑ لیتی ہے۔

"پڑوسن خالہ تو جب بھی ملتی ہے ہر دفعہ یہی کہتی ہے کہ بیٹا! اب بہت پڑھ لکھ لیا، خیر سے ملازمت بھی اچھی مل گئی، اب ذرا گھر گھاٹ کا سوچو۔ "گھر گھاٹ تو بن ہی جائے گا خالہ، مگر شادی!!" وہ آپ ہی آپ بڑبڑاتا۔ "فضل دین مزارع کے بیٹے کو اپنی بیٹی کون دے گا؟۔"(۱۴)

فضل دین مزارع کا بیٹا معاشرے میں اپنی حیثیت منوانے کے لیے مسلسل جدوجہد کرتا ہے لیکن ان مراحل سے گزرنے کا تشویشناک عمل اس کی زندگی کا ایک تلخ تجربہ بن جاتا ہے یوں معاشرتی دباؤ اسے موت کے گھاٹ اتار دیتا ہے۔ یہ ایک متوازن زندگی گزارنا چاہتا تھا لیکن مستحکم اقدار کے فقدان اور طبقاتی حیثیت میں عدم توازن اس کا مقدر بن گئے۔ پاکستان کو متعدد سماجی مسائل کا سامنا ہے جو اس کی آبادی کی فلاح و بہبود کو متاثر کر کے اس کی مجموعی ترقی کی راہ میں رکاوٹ پیدا کرتے ہیں۔ معاشرے میں پیدا ہونے والے برانڈ کلچر کا نتیجہ خود غرضی اور مادیت پرستی کی صورت میں نکلا ہے جس کی وجہ سے معاشرتی مسائل پیدا ہو رہے ہیں۔ طاہرہ اقبال کا افسانہ بزنس مین صوفیہ کی کہانی ہے کہ کیسے وہ ایک معمولی کسان کے بیٹے سکندر نواز کو اس کے بزنس میں شامل کرتی ہے اور اس کے برق رفتار کمپیوٹر دماغ، ذہانت اور پرسنیلٹی سے متاثر ہو کر اس کو ترقی کی بلندیوں تک لے جاتی ہے اور سکندر نواز بھی اپنی تمام تر توانائیاں اسی بزنس میں لگا دیتا ہے۔ اقتباس ملاحظہ ہو:

"جوان خون کی ساری حرارتیں، تر و تازہ دماغ کی ساری تازگیاں، چست و توانا جسم کی ساری پھرتیاں، اعلیٰ تعلیم کی ساری روشنیاں، چار برس تک صوفیہ انڈسٹریز کا ایندھن بنی رہی تھی، اس ایندھن کی تیز ہوتی لاٹ ہی اسے معمولی اکاؤنٹنٹ سے GM کے عہدہ تک لانے کا ذریعہ تھی اور اب ایک اور پروموشن جس میں مندرجہ بالا اہلیتوں کے علاوہ اس کی Dashing پرسنیلٹی اس لاٹ پر تیل کی بھڑک تھی۔۔۔"(۱۵)

صرف پر موشن تک ہی نہیں صوفیہ اس سے شادی کر لیتی ہے یوں سکندر نواز کی بجائے اس کا نام صوفیہ نواز ہو گیا۔ فطرت کے خلاف عمل پر وہ اپنی وقعت کھو دیتا ہے یہ شادی صرف وہ اپنے مفاد اور ترقی کے لیے کرتا ہے۔ آخر شادی کے بعد بھی صوفیہ اس کو ملازموں کی طرح ڈیل کرتی ہے۔ ان حالات میں وہ آہستہ آہستہ بیمار ہونے لگتا ہے اور آخر میں اس سب سے سکندر نواز دور بھاگ جاتا ہے۔

مادی اشیا کی خواہش فرد کو جرائم تک کا ارتکاب کرنے پر آمادہ کرنے لگی دوسروں کی حق تلفی، رشوت خوری، کرپشن اور دیگر جرائم میں اضافہ ہونے لگا ہے۔ افراد اور اداروں کے درمیان عدم اعتماد ہونے سے سماجی ہم آہنگی ختم ہو گئی ہے۔ لمحہ بہ لمحہ بدلتی ہوئی برق رفتار عصری زندگی کی حقیقت پسندانہ تصویر کشی کا کام، زندگی کے نشیب و فراز، انفرادی اور اجتماعی زندگی کے مسائل ان بیانیوں میں ملتے ہیں۔ رشید امجد کے افسانے "حسرت چشیدہ" میں کرپشن اور رشوت خوری سے پیدا ہونے والے مسائل کو پیش کیا گیا ہے کہ کس طرح معاشرہ ایک دیانت دار شخص کو بد دیانتی سے کام لینے پر مجبور کر دیتا ہے۔ اس افسانے کا مرکزی کردار ایک ایمان دار شخص ہے جو ایمان داری سے کام کرنا چاہتا ہے لیکن اس کی نوکری دن بدن اس طرح مشکل ہوتی جا رہی ہے کہ اسے بہت سے دفتری کام مرضی کے خلاف غیر اصولی طریقے سے کرنے پر اس کے ساتھی مجبور کرتے ہیں اور اس کو یہ بھی کہتے رہتے ہیں کہ یہاں تو روز ایسا ہوتا ہے اتنے دیانتدار نہ بنو۔ اسی طرح اس کی بیوی بھی اسے کہتی ہے تم اکیلے تو سارے نظام کو ٹھیک نہیں کر سکتے یہاں تک کہ اس کا باس خود اسے ان الفاظ میں سمجھاتا ہے:

> "میں تمہیں جانتا ہوں بھائی ہم ایک سسٹم کے پرزے ہیں، اس کے مطابق نہیں چلیں گے تو ٹکڑے ٹکڑے ہو جائیں گے۔ جاؤ لیٹر جاری کر دو۔"(۱۶)

افسانے میں ہمارے موجودہ سسٹم کی حقیقت پسندانہ تصویر کشی کی گئی ہے۔ جو اس سسٹم کا حصہ بننے سے انکار کر دیتے ہیں ان کی ظاہری حالت کی بدتری اور خوابوں کی شکست کی آواز بھی شامل ہے۔ معاشی مفادات اور شان و شوکت ان کا مقدر بننے لگی ہے جو سسٹم کے جدید تقاضوں کو سمجھ کر ان کے سانچے میں ڈھلنے لگ جائیں۔

> "ساتھیوں کی گاڑیوں کے ماڈل بدل رہے تھے، نئے نئے پلاٹ خریدنے کی باتیں ہو رہی تھی۔ کبھی کبھی بیوی سے کوئی بات کر دیتا تو وہ کہتی، "ہماری تو یہی حالت رہے گی، اس پرانی گاڑی سے مرتے دم تک جان نہیں چھوٹے گی، گھر کو پینٹ ہوئے بھی دس برس بیت گئے، اب تو پلستر بھی اکھڑنے لگا ہے۔"(۱۷)

یہی وہ عناصر اور معاشرتی دباؤ ہے جو معاشرے میں جدید تقاضوں کے مطابق چلنے کے لیے فرد کو مجبور کر دیتے ہیں۔ کہانی کا اختتام اس حقیقت کو آشکار کرتا ہے کہ یا تو اس سب کے بعد انسان معاشرے کا لبادہ اوڑھ لیتا ہے یا پھر ضمیر سے جنگ کرتے کرتے اس دنیا کو الوداع کر دیتا ہے۔ رشید امجد کے افسانے "مسکراتے لمحے سے نکلتی ایک افسردہ کہانی" میں میاں بیوی کے کردار کے ذریعے معاشرتی رہن سہن اقدار کی تغیر پذیری اور عہد بہ عہد رونما ہونے والی تبدیلیوں، حال اور مستقبل کا موازنہ کیا ہے کہ کیسے اب انسان کے پاس سب کچھ ہے اچھے سے اچھی گاڑی بنگلہ مگر انسان اتنا سب کچھ حاصل کرنے کے بعد بھی خسارے میں ہے۔ اس افسانے کی کہانی اس لحاظ سے بھی اہم ہے کہ اس میں ماضی اور حال کا بڑی مہارت سے تقابل پیش کرتے ہوئے تغیر پذیر معاشرے کی عکاسی کی گئی ہے۔ "خواب کے پیچھے پیچھے" افسانے کا مرکزی کردار دن بھر دفتر میں ہونے والی کرپشن پر سوچتا رہتا ہے۔ اس کی یہ سوچ کہ چھوٹے سیٹ اپ میں بھی انسان کس قدر مطمئن تھا لوگ ایک دوسرے کی مدد کرتے تھے مگر اب سب اقدار بدل گئی ہیں نہ تو انسان اپنے سیٹ اپ سے مطمئن ہے اور نہ ہی اب لوگوں میں ہمدردی کا جذبہ رہا ہے۔ اس طرح کے خیالات اسے ایک نفسیاتی مریض بنا دیتے ہیں جو اسے کسی انجانے راستے پر لے جاتے ہیں۔ رشید امجد کا افسانہ "شام کہانی" عصری سماجی ڈھانچے میں پائے جانے والے مسائل کو اجاگر کرنے میں معاون ہے۔ پاکستان میں ایک طرف تو عوام زندگی کی لذتوں، رعنائیوں اور عیاشیوں سے محظوظ ہوتے ہیں تو دوسری طرف تنگ دستی کی ہولناک تاریکی میں مبتلا ہیں۔ ایک طرف ملازمت کے لیے باہر جانے والے افراد پر بھی تنقید ملتی ہے تو دوسری طرف پاکستان کے موجودہ حالات میں زندگی کی بنیادی ضروریات سے محرومیوں کا نوحہ ہے۔ وطن سے محبت عوام کی اولین اقدار میں سے ہے لیکن اب عوام کو اپنی مٹی سے محبت سے زیادہ مال و دولت عزیز ہو گئی ہے۔

"یہاں نہ عزت، نہ زندگی، نہ مال۔ مٹی کی محبت کے معنی ڈکشنریوں میں رہ گئے ہیں"(۱۸)

افسانہ "ہنوز خواب میں" بھی جدید معاشرتی زندگی کئی سوالوں کو جنم دیتی ہوئی جلوہ گر ہے۔ اس میں کہانی کار نے انسانی جانوں اور مادی املاک میں آنے والی بڑی تبدیلی کی گواہی دی ہے کہ ایک دور تھا جب مال موجود تھا، لیکن جیبیں خالی تھیں۔ اس کے برعکس، عصری حالات قسمت کے پلٹ جانے کو ظاہر کرتے ہیں۔ جیبیں اب دولت سے بھری ہوئی ہیں، پھر بھی زندگی کے ٹھوس عناصر مضحکہ خیز اور غائب نظر آتے ہیں۔ "جاتی رت کے خواب" افسانے میں ایک ایسے شخص کی ناکامیوں کا بیان ہے جو دوسروں کے کام آتا، نیکیاں کرتا، کوئی سازش اور کچھ نہیں مگر اسے ناکامی کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ اس افسانے میں افراد کے تئیں مایوسی کا اظہار کیا گیا ہے جو

اپنے تکبر میں غیر اخلاقی اور غلط کاموں میں ملوث ہوتے ہیں لیکن پھر بھی ترقی پاتے ہیں اور خوشحال رہتے ہیں۔

"اس کے آس پاس کتنے ہی لوگ ایسے تھے، ہیں جو اپنے تکبر میں آدمی کو آدمی نہیں سمجھتے ہر غلط کام کرتے ہیں لیکن ایسے پھلتے پھولتے ہیں کہ لگتا ہے ان کے لیے خزاں ہے ہی نہیں۔"(۱۹)

یہ کامیابی کی نوعیت، ذاتی اور سماجی ترقی میں سالمیت کے کردار، طاقت اور اثر ورسوخ کی وسیع تر قوتوں پر غور و فکر کرنے کی طرف توجہ مبذول کرواتا ہے۔ جدید دور میں زندگی کی پیچیدگیوں، بڑھتے ہوئے معاشرتی مسائل اور ان میں ڈوبا ہوا انسان، اس کے نتیجے میں پیدا ہونے والے احساس تنہائی، محبتوں اور رفاقتوں سے محرومی کے پس منظر میں یہ بیانیے تشکیل دیے گئے ہیں۔ عصری زندگی کے یہی وہ تقاضے ہیں جن کو رشید امجد نے اپنے مختلف افسانوں میں بیان کیا ہے۔ اس صورت حال کو "دست گزیدہ" میں بھی علامتی پیرائے میں بیان کیا ہے۔ جس میں کہانی کا مرکزی کردار اپنے ہاتھوں پر سفید نشان محسوس کرتا ہے جو بظاہر اس بات کی علامت بن جاتے ہیں کہ یہ نشان رشوت خوری کے ہیں جن کو وہ اپنی ملازمت کے آغاز میں تو شدت سے محسوس کرتا ہے لیکن آہستہ آہستہ اس کا یہ احساس زائل ہوتا جاتا ہے۔ دفتروں میں معمولی سے معمولی جائز کاموں کے لیے بھی عوام کو ان لوگوں کو کچھ نہ کچھ دینا دلانا پڑتا ہے جن سے ان کا کام ہو سکے۔

"پچھلے دنوں ایک شخص اپنی فائل نکلوانے کے لیے میری دراز میں نوٹوں کی ایک گڈی رکھ گیا تھا، میں نے ساری کی ساری اس کے حوالے کر دی۔۔۔"(۲۰)

ایک فائل نکلوانے کی خاطر نوٹوں کی گڈی اور اس افسر کی بیوی کی خوشی اور شاپنگ اس بات کی چغلی کھا رہی ہے کہ جس گڈی کو وہ واپس کر دینے کا بتاتا ہے وہ دراصل اس کی بیوی کی شاپنگ میں جا رہی ہے۔ جو لوگ متوازن انداز میں زندگی گزارنا چاہتے ہیں وہی اپنے اعمال کا محاسبہ کرتے رہتے ہیں اور اپنے پیشے کے ساتھ مخلص رہتے ہیں لیکن آج کل ہر سطح پر کرپشن اس قدر بڑھ چکی ہے کہ لگتا ہے معاشرہ اسی کرپشن سے قائم ہے۔ انسان کا ذہن آس پاس کے حالات سے بے خبر نہیں رہ سکتا یہی وجہ ہے کہ رشید امجد نے افسانہ "معلوم کا دکھ" عنوان سے تخلیق کر کے معاشرتی تضاد کو قلم بند کیا ہے۔ جس میں پرانے حالات کے مقابلے میں تشکیل پاتے نئے حالات، بدلتے رویوں کا تصادم اور اس کے نتیجے میں اقدار کی ٹوٹ پھوٹ کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"سکول میں استادوں کا خوف، اچھے نمبر حاصل نہ کرنے کا خوف، پچھتاوں، اداسیوں اور خوف میں بار بار دم گھٹنے کے احساس کے ساتھ تعلیم کی منزل طے ہوتی تو ملازمت کا مرحلہ آ گیا۔ اچھے دن تھے، ابھی سفارشوں اور رشوتوں کا دور شروع نہیں ہوا تھا، ملازمت مل گئی، اچھا محکمہ تھا۔ چند ہی دنوں میں دفتر کے ساتھیوں نے سائلوں کی جیبوں میں ہاتھ ڈالنے کے گر سکھا دیے۔ شروع میں مشکل لگنے والا یہ کام اس کی توقع سے بھی جلدی آسان ہو گیا۔"(۲۱)

بدعنوانی پاکستان میں زندگی کے مختلف شعبوں میں بڑے پیمانے پر بہت سے چیلنجز لے کر آئی ہے۔ اس نے ملک کی معاشرتی، اقتصادی اور سیاسی ساخت کو متاثر کیا ہے۔ بدعنوانی کی سنگین صورت حال بدلتی ہوئی اقدار کے ساتھ جڑی ہوئی ہے۔ پبلک سیکٹر سے لے کر پرائیویٹ اداروں تک، حتیٰ کہ تعلیمی اداروں کے اندر بھی بدعنوانی کے گھناؤنے اثرات نے جڑ پکڑ لی ہے یوں انصاف، شفافیت اور احتساب کی بنیادیں کمزور ہو گئی ہیں۔ جیسے جیسے معاشرتی اقدار تبدیلی سے گزر رہی ہیں، غیر اخلاقی طریقوں کے بڑھتے ہوئے معمول پر آنے سے بدعنوانی کے پھیلاؤ کو مزید تقویت ملی ہے، جس سے ترقی اور ترقی کی راہ میں رکاوٹیں پیدا ہو رہی ہے۔ اس صورت حال سے نمٹنے کے لیے تغیر پذیر اقدار اور بدعنوانی کے درمیان باہمی تعامل کی جامع تفہیم کے ساتھ ساتھ دیانتداری اور احتساب کے کلچر کو فروغ دینے کے لیے اجتماعی عزم کی ضرورت ہے تاکہ مثبت تبدیلی کی راہ ہموار کی جاسکے۔ معیشت کسی بھی معاشرے کے لیے ریڑھ کی ہڈی کی حیثیت رکھتی ہے۔ معاشرے کی ترقی و تنزلی کا انحصار بڑی حد تک ملکی معیشت پر بھی ہوتا ہے۔ معاشی لحاظ سے خوشحال معاشرے اعلیٰ اخلاقی اقدار، عدل و انصاف، مضبوط سیاسی و سماجی پس منظر کے حامل ہوتے ہیں جب کہ معیشت کی کمزوری معاشرتی و اخلاقی تنزلی کو جنم دیتی ہے۔ ایسے معاشروں میں عدل و انصاف کا نظام کمزور پڑ جاتا ہے۔ بدعنوانی اور رشوت ستانی کو فروغ ملتا ہے۔ ملکی اداروں کی جڑیں کھوکھلی ہونا شروع ہو جاتی ہیں اور مہنگائی زور پکڑ لیتی ہے۔ طاہرہ اقبال نے ملک کی گرتی ہوئی معیشت کے حوالے سے افسانہ "اوکاں والا سکول" میں اس طرح عکاسی کی ہے۔

"ملک کی گرتی ہوئی معیشت نے جو کساد بازاری پیدا کی تھی اس کی زد میں "ناز و ادا" ٹولی بھی آ گئی۔ ان کے کسٹمر نئے نئے جوان ہوتے اور نئے ذائقوں کے تجربات میں بدکتے جیب خرچ کے محتاج طالب علم، گھروں سے دور چھوٹے موٹے ملازم، ٹرک ڈرائیور چوکیدار اور مزدور بے روزگار ہونے لگے تھے۔"(۲۲)

ملک کی گرتی ہوئی معیشت سے ایک ایسی لہر پیدا ہوئی جس کی لپیٹ میں پورا معاشرہ آ گیا۔ تاہم، جیسے جیسے معاشی بدحالی بڑھتی گئی لوگوں کی بڑی تعداد بے روزگار ہونے لگی۔ بے روزگار ہونے والی عوام میں سب سے زیادہ اثر چھوٹے پیمانے پر کام کرنے والے، ٹرک ڈرائیور، چوکیدار اور مزدوروں پر ہوا۔ جب اعلیٰ سطح پر انحطاط شروع ہوتا ہے تو عوامی سطح پر بھی قانون کی دھجیاں بکھیر دی جاتی ہیں۔ لوگ بھوک، فاقوں کے ڈر اور مہنگائی کے ہاتھوں مجبور ہو کر اخلاقی اقدار کو خیر باد کہہ دیتے ہیں۔ دوسری طرف قانون میں لچک ہونے کی صورت میں رشوت بدعنوانی اور سفارش کا کلچر جنم لیتا ہے اور عدل و انصاف کو خیر باد کہہ دیا جاتا ہے۔ ایسے معاشروں میں سماجی و اخلاقی سطح پر ہر طرح کی برائیاں جڑ پکڑنے لگتی ہیں اور لوگ اخلاقی قدروں کو پس پشت ڈالنے لگتے ہیں یوں معیشت کی کمزوری رفتہ رفتہ ملکی جڑوں کو کھوکھلا کرتی جاتی ہے۔ علی اکبر ناطق نے افسانہ "سویٹر" میں ایسی قوتوں کی تصویر کشی کی ہے جس نے فرد کو درپیش وسیع تر اقتصادی چیلنجوں سے نبرد آزما کیا۔ کہانی کا مرکزی کردار آمدنی کا کوئی ذریعہ نہ ہونے پر مسلسل مسافت سے گزرتا ہے یہاں تک کہ اس کے پاس پہننے کو سویٹر بھی نہیں تھا جو اسے کوئی دوسرا دے دیتا ہے۔ زندگی کی اس بے سمتی پر وہ سوچنے پر مجبور ہو جاتا ہے کہ

> "کاش ڈکیتی ہی کر لیتا۔ اس سے مردانگی پر تو حرف نہ آتا۔ پھر کچھ سوچ کر ٹھٹھک گیا، اگر ڈکیتی سے پکڑا جاتا تو زندگی تباہ ہو جاتی۔ تھانے والوں کے جوتے الگ پڑتے۔"(۲۳)

غریب شخص کو معاشرے میں پائی جانے والی بے روزگاری انتہائی غلط قدم اٹھانے پر میں مجبور کرتی ہے لیکن ساتھ ہی اس کو یہ بھی احساس ہے کہ غریب عوام پر جب قانون کا ہاتھ پڑتا ہے تو ان کا کیا حال ہوتا ہے۔ افسانہ "وار" میں عمیر نامی لڑکا بی اے پاس ہے والد کی وفات کے بعد ایک بہن اور والدہ کی ذمے داری اس کے سر پر آ جاتی ہے۔ لیکن ملازمت نہیں ملتی اور وہ برائی کے دلدل میں اترتا چلا جاتا ہے۔

> "اسے ترغیب ملی کہ جائز طریقے سے اگر کچھ حاصل نہیں ہو سکتا تو پھر کیوں نہ کوئی ناجائز طریقہ استعمال کیا جائے! اس خیال کے آتے ہی ایک رات وہ تیز دھار چھری لے کر گھر سے نکلا۔۔۔"(۲۴)

یوں یہ کردار جرائم کا راستہ اختیار کرتا ہے۔ یہاں تک کہ چند پیسوں کے عوض ایک لڑکی کے چہرے پر تیزاب ڈال دیتا ہے۔ افسانہ نگار نے اس افسانے کے ذریعے اس حقیقت کو تسلیم کیا ہے کہ معاشی مشکلات جیسے کہ ملازمتوں کی کمی یا بے روزگاری کی بلند شرح درحقیقت مجرمانہ سرگرمیوں میں اضافے کا باعث بنتی

ہے۔ جب افراد کو مالی عدم استحکام کا سامنا کرنا پڑتا ہے اور انہیں روزگار حاصل کرنا مشکل ہو جاتا ہے تو وہ اپنی بنیادی ضروریات کو پورا کرنے یا معیار زندگی کو برقرار رکھنے کے لیے مایوس کن غیر قانونی اقدامات کا سہارا لیتے ہیں۔ ایسا ہی ایک افسانہ "سفید پردہ" مبین مرزا نے تخلیق کیا ہے جس کا مرکزی کردار خالد ایک ذہین نوجوان ہے لیکن ملازمت کے لیے در در کی ٹھوکریں کھانے پر مجبور ہے کیوں کہ جہاں بھی جاتا ہے وہاں سفارش اس کی قابلیت پر حاوی ہو جاتی ہے۔ اس کے والد ایک آئیڈیلسٹ ہیں سفارش کر سکتے ہیں لیکن اس راستے کو اختیار نہیں کرتے حالانکہ خاندان کے دیگر افراد اور معاشرہ انہیں سفارش کرنے پر مجبور کرتے ہیں لیکن وہ اپنی اخلاقی اقدار پر معاشرے کو حاوی نہیں ہونے دیتے جس کی وجہ سے انہیں سنگین نتائج کا سامنا بھی کرنا پڑتا ہے۔ خالد خود اس صورت حال سے مجبور ہو کر دہشت گردی کا راستا اختیار کرتا ہے۔ اگرچہ فرد کے معاشی حالات فرد کو جرائم کی راہ اختیار کرنے پر مجبور کر دیتے ہیں لیکن بے روزگاری کا سامنا کرنے والا ہر شخص مجرمانہ سرگرمیوں کا رخ نہیں کرتا۔ منشایاد کا افسانہ "پنجرے میں بسیرا" پاکستان کے معاشرتی، معاشی اور سیاسی بحران کا عکاس افسانہ ہے۔ نائن الیون کے بعد ملک کس طرح سے ہر سطح پر مسائل سے دوچار ہوا اس حوالے سے لکھتے ہیں:

> "فرقہ وارانہ فسادات، لسانی تعّصبات اور سیاسی اختلافات کے عفریت ابھی پیدا نہ ہوئے تھے اور نہ ہی اسلام اور جہاد کو بدنام کرنے والی پاکیزہ ناموں اور کالے کرتوتوں والی دہشت گرد تنظیمیں بھی وجود میں آئی تھیں۔ لیکن ائیر پورٹ پر ہی کیا ان دنوں شہر میں بھی ناک میں دم کرنے والی ایسی ناکہ بندیاں نہیں ہوا کرتیں تھیں جیسی اب ہیں۔"(۲۵)

اب آئے روز ڈکیتی کی وارداتیں اور کھلے عام اسلحے کا استعمال عام ہو چکا تھا۔ پاکستان کی اس لاقانونیت پر عالمی میڈیا پر بھی آئے روز اسی طرح کی خبروں کا چلن ہو گیا ہے۔ ہر خبر بریکنگ نیوز بنا دی گئی ہے اس سے کاروبار چل نکلے ہیں۔ جہاں ایک طرف میڈیا کا کردار حق سچ کے لیے آواز اٹھانا ہے وہیں "تازہ خبر" افسانے کے ذریعے اس کے منفی پہلوؤں کو بھی اجاگر کیا گیا ہے۔

> "معاشرے کو گند میں مسلنے والا تمہارے جیسے لوگوں کا یہ بے حیا میڈیا ہی ہے۔ جو لوگوں کو سینہ زوری پر چیخ چیخ کر زبردستی بتاتا ہے کہ جرائم یوں بھی ممکن ہیں، ایسے بھی

کیے جاسکتے ہیں، کچے نوخیز بچوں کے ذہن اکھیڑنے میں اکسانے میں اس بے ہودہ، بے
لگام، آزاد میڈیا کا ہی ہاتھ ہے جو خبروں کو نمک مرچ کے ساتھ پیش کرتا ہے۔"(۲۶)

خبروں کی رپورٹنگ اور جرائم کی شرح کے درمیان تعلق ایک پیچیدہ اور زیر بحث موضوع ہے۔ "تازہ خبر" افسانے میں جرائم کے بڑھتے ہوئے واقعات کے پیچھے کارفرما میڈیا کے کردار کو اجاگر کیا گیا ہے کہ کیسے بریکنگ نیوز بننے والی خبریں جرائم کو ہوا دیتی ہیں۔ میڈیا مجرمانہ سرگرمیوں سمیت کئی ایسے واقعات کے بارے میں عوام کو آگاہ کرنے میں اہم کردار ادا کرتا ہے جس سے عوامی تاثر پر گہرے اثرات مرتب ہوتے ہیں خاص طور پر کچے ذہنوں کو مجرمانہ سرگرمیاں انجام دینے کے نئے نئے طریقوں سے بھی واقفیت ملتی ہے۔ گل زیب عباسی کے افسانے "انصاف والی عید" میں وقاص نامی لڑکے کا قتل اس کے دفتر والے اس کی ترقی اور عزت کے حسد میں آکر کر دیتے ہیں۔

پاکستان کا قیام پاک وہند کے مسلمانوں کے لیے ایک روشن مستقبل کی نوید لے کر آیا تھا۔ لوگ اب حالات حاضرہ، بے روزگاری بھوک اور افلاس سے تنگ آکر مرنے کو ترجیح دیتے ہیں۔ معاشرے کا ہر فرد دائرے میں مقید ہے اور اسی دائرے میں گھومتا رہتا ہے اور اپنی منزل مقصود تک پہنچنے میں ناکام رہتا ہے۔ "دائرہ نہیں ٹوٹتا" افسانے کی کہانی منفرد انداز میں بیان کردہ پاکستان کے معاشرتی حالات کا نوحہ ہے۔ قیام پاکستان سے اب تک زندگی کے سفر میں یہاں کی عوام اچھے دنوں کے انتظار میں دائرے کی صورت چلتے جا رہے ہیں لیکن ان کی کہانی آج بھی وہیں ہے جہاں کچھ برس پہلے تھی۔ اچھے دنوں کے انتظار میں حالات اس قدر تنزلی کی جانب جارہے ہیں کہ اب نہ تو واپسی کا کوئی راستہ ہے نہ کسی کو اپنا مستقبل روشن نظر آتا ہے۔ لوگ اپنی اور اپنے ساتھیوں کی بے بسی پر روتے ہیں، افسردہ ہو کر بھی سفر جاری رکھے ہوئے اور کچھ حالات کے ہاتھوں مجبور ہو کر نہ صرف اپنی زندگی بلکہ اپنے بیوی بچوں کی زندگی بھی ختم کر دیتے ہیں:

"میں اپنے بچوں کو فاقوں سے ایڑیاں رگڑتے اور اپنی بیوی کو سسک سسک روتے اور دوسروں کے سامنے بے آبرو ہوتے نہیں دیکھ سکتا۔ سو ہو سب یکبارگی چلے، ہم چلے، ہمیں معاف کر دینا۔ یہ کہہ کر اس نے اپنے بیوی بچوں اور اپنے آپ کو آگ لگائی اور جل مرا۔۔۔ کوئی کسی کو مرنے سے کیوں روکتا کہ اب جیتے رہنا مرنے سے کہیں زیادہ ابتر ہو چلا تھا۔"(۲۷)

پاکستان میں بھوک اور غربت اہم چیلنجز ہیں جن سے آبادی کا ایک بڑا حصہ اس سے متاثر ہو رہا ہے۔ جہاں ایک طبقہ برانڈ کی ریل پیل میں زندگی بسر کر رہا ہے وہیں پست طبقے کے مسائل بھوک و افلاس سے جنم لیتے ہیں۔ افسانہ "مندری" میں مندری اور سونے کی زندگی کی کہانی کے ذریعے ان جیسے پست طبقے سے تعلق رکھنے والے افراد کی زندگی کا نوحہ بیان کیا گیا ہے۔ کہانی میں مندری اور سونا مرکزی کردار ہیں ماجھا مندری کو پال پوس کر بڑا کرتا ہے اور مندری اور سونے کی رضامندی دیکھتے ہوئے ان کی شادی کروا دیتا ہے۔ بیماری کے باعث ماجھا مر جاتا ہے لیکن جب اس کے کفن دفن کا انتظام مُندری اور سونا نہیں کر سکے تو اندھیرے میں گڑھا کھود کر دفنا دیتے ہیں۔ وقتی طور پر دونوں پریشان ہوتے ہیں اور اپنی غربت کو کوستے ہوئے محنت کرنے کا عہد کرتے ہیں۔ اس عہد کے چلتے دونوں سڑک سے کوڑا چن چن کے جمع کرتے اور اس کو بیچنے کا کام کرنے لگتے ہیں۔ ایک دن مندری کی اچانک سڑک پر طبعیت خراب ہوتی ہے جس کے بعد آٹھ ماہ کی بچت شدہ رقم اس کی دواؤں میں استعمال ہو جاتی ہیں اور مندری مر جاتی ہے لیکن اب اس کے کفن دفن کے انتظام کے لیے سونا بہت زیادہ پریشان ہوتا ہے کہ کیا کروں اس کے بعد جو اس نے کیا وہ متن کے اس حصے میں ملاحظہ ہو:

> "وہ اٹھا اور ایک پرانے بورے میں مُندری کی لاش ڈال کر اوپر سے گرہ لگا دی ۔۔۔ صبح ہفتے بھر کے جمع شدہ کوڑے کا وزن ہونا تھا۔۔۔ وہ سوچنے لگا۔۔۔ بہت کم ہوئی تب بھی دو من تو ہو گی۔"(۲۸)

اس بیانیہ میں بھوک اور غربت جو انسان کو کچھ بھی کرنے پر مجبور کر دیتی ہے اس کی عکاسی کی گئی ہے۔ بھوک اور غربت ایک دوسرے سے جڑے ہوئے سماجی مسائل ہیں جو افراد اور برادریوں پر اہم اور اکثر تباہ کن اثرات مرتب کرتے ہیں۔ کہیں بھوک و افلاس نے فرد کو جرائم کرنے پر مجبور کر دیا تو کہیں عورت طوائف بننے پر مجبور ہو گئی جس کی مثال افسانہ "وچولن"، "پانچ روپے کا متروک نوٹ" اور ایسے متعدد افسانے ہیں۔ بھوک ہی ہے جو افسانہ "امیر زادی" میں امیرو کو امیر زادی بنا دیتی ہے۔

> "یہ تو میرا پنڈا ہے۔ پیسے تو کاکت کے ہوتے ہیں یا پھر چاندی کے۔" لیکن تیرے پاس تو سارا ہی مال ہے۔۔۔ بے وقوف تجھے پتا ہی نہیں تو امیرو نہیں امیر زادی ہے۔"(۲۹)

معاشرتی مسائل اور حالات کو اجاگر کرنے والے افسانہ نگار گل زیب عباسی نے افسانہ "تیسری موت" کی کہانی کے ذریعے زندگی کی ان ناہمواریوں کو اجاگر کیا ہے جس سے انسان جیتے جی موت سے بدتر زندگی گزار رہا ہے۔ اس افسانے کے مرکزی کردار کی پہلی موت تو کرنٹ لگنے سے واقع ہوئی تھی لیکن باقی دو

اموات تو اس سے اس کی زندگی کی تمام تر رعنائیاں لے اڑی۔ اس کی ماں چاہتی تھی کہ کسی طرح اسے سرکاری نوکری مل جائے مگر ملازمت کے حصول کے لیے رشوت خوری کے چلتے اس نے سب کچھ لٹا دیا اور ہاتھ پھر بھی کچھ نہیں آیا وہ الٹا ہر طرح سے حالات نے بے بس اور مجبور کر دیا۔ اس صورت حال کا اندازہ افسانے کے اس اقتباس سے لگایا جا سکتا ہے:

> "خدا معلوم، اماں کو کس نے کہہ دیا، پورے پانچ لاکھ روپے ہوں گے تو نوکری مل جائے گی۔ بھولی اماں تو مجھے سرکاری ملازم دیکھنا چاہتی تھی اور بس۔ گھر میں جو کچھ تھا۔ بیچ بٹا کر گتھلی بھر دی۔۔۔ یہ معاشرہ کوئی کچی گولیاں کھیلا تھا۔۔۔ نوکری کے پروانے کی بجائے، اماں اور اس مردے کی زندگی ہی چھین لی گئی۔ صاف مکر گئے کہ ہم نے کبھی کوئی پیسے دیے تھے۔"(۳۰)

اس کی تیسری موت اس وقت ہوئی جب اس کی بیوی اس کی غربت سے تنگ آ کر پالنے میں موجود بیٹی چھوڑ کر اس سے طلاق لے کر دوسری شادی کر لیتی ہے۔ افسانہ نگاروں نے اس صورت حال کو اپنے مختلف بیانیوں میں سمویا ہے۔ افسانہ "دوسرا خاوند" میں بھی عورت مرد کی سفید پوشی سے تنگ آ کر اس پر نامردی کا الزام لگا کر اس سے طلاق لے لیتی ہے اور ایک ایسے شخص کے چنگل میں پھنس جاتی ہے جو بظاہر تو بہت امیر ہوتا ہے لیکن مختلف جرائم میں ملوث ہے۔ یوں غربت ازدواجی مسائل میں اضافے کا باعث بنی۔ افسانہ "بھلے مانس" میں شرف الدین عرف شرفو بھلا انسان ہے لیکن بیوی اور بیٹیوں کے ہاتھوں رسوا ہوتا ہے۔ آج کل طلاق لینا دینا اتنا عام ہو گیا ہے کہ لڑکیاں یا تو فوری طلاق کا مطالبہ کر دیتی ہیں یا پھر ایسے ہتھکنڈے اپناتی ہیں۔ زیتون جو تین بچوں کی ماں ہے وہ بھی مسلسل ایسے ہتھکنڈے اپناتی ہوئی نظر آتی ہے۔ کبھی زہر پی لینے کا ناٹک کرتی ہے تو کبھی کوئی دوسرا حربہ استعمال کرتی ہے۔ اپنے والد کو صاف صاف کہہ دیتی ہے کہ یہ میرے پاس سوتا نہیں اس لیے مجھے اس سے طلاق چاہیے۔ آخر میں معاشرے کے طعنے شرفو کو خودکشی پر مجبور کر دیتے ہیں۔ جذبات کا خالص پن نئی صورت حال میں کھو گیا ہے۔ معاشرے میں عدم برداشت اس قدر بڑھ چکا ہے کہ اب طلاق کی شرح میں بھی اضافہ ہونے لگا ہے۔ افسانہ "حلالہ" بھی اسی حقیقت کا عکاس ہے۔

> "طلاق دے دو، ابھی چلی جاتی ہوں، ماں باپ کے گھر روٹی تو مل جائے گی، مجھے بھی۔" اچھا تو لے پھر تیرا یہ شوق بھی پورا کر دیتا ہوں۔ اور پھر اویس نے وہیں کھڑے کھڑے تین بار زور زور سے کہا۔ "طلاق۔ طلاق۔ طلاق"(۳۱)

پاکستانی معاشرے میں طلاق کی بڑھتی ہوئی شرح دیکھنے میں آ رہی ہے جب کہ کچھ عرصہ پہلے تک طلاق کو بہت برا سمجھا جاتا تھا۔ معاشرتی اقدار اور صنفی کردار میں بدلتے رجحان کے پیش نظر طلاق کی زیادہ تر خواہاں خواتین نظر آتی ہیں۔ روایتی طور پر، پاکستانی معاشرہ قدامت پسند اصولوں اور پدرانہ ڈھانچے کی خصوصیت رکھتا تھا جو خواتین کو شادی نبھانے پر زور ڈالتا تھا۔ تاہم جیسے جیسے معاشرتی اقدار بدل رہی ہیں خواتین خود مختار ہو رہی ہیں اور آزادی حاصل کر رہی ہیں تو روایتی صنفی کرداروں کو چیلنج کرتی ہوئی نظر آتی ہیں۔ یہ تبدیلی خواتین کو بااختیار بنانے کے ساتھ ساتھ ذاتی فلاح و بہبود اور اپنی خوشی کو ترجیح دینے کا درس دے رہی ہے چاہے خوشی کے لیے طلاق کا انتخاب ہی کیوں نہ ہو۔ پاکستانی معاشرے میں بڑھتی ہوئی طلاق کی شرح اس کی ثقافتی تبدیلی کے چیلنجز اور پیچیدگیوں کو بھی اجاگر کرتی ہے۔ معاشی آزادی، تعلیمی مواقع اور صنفی مساوات کے بدلتے ہوئے تاثرات جیسے عوامل پر غور کرنا ضروری ہے جو ان تبدیلیوں میں معاون ہیں۔ اگرچہ خواتین کو بااختیار بنانا ایک مثبت عمل ہے لیکن معاشرے کے لیے یہ ضروری ہے کہ وہ توازن برقرار رکھے۔ طلاق کی وجوہات میں سے ایک وجہ مرد اور عورت کا ایک ہی جگہ ملازمت کرنا بھی ہے۔ خاور چودھری نے افسانہ "ادھوری تصویر" میں اس حقیقت سے پردہ اٹھایا ہے۔

> "اسے اپنی تیسری بیوی سے بھی الگ ہونا پڑا تھا۔ دو بچوں کی ماں کسی طرح بھی یہ برداشت نہیں کر پاتی تھی کہ اس کا شوہر اپنے دفتر میں کئی کئی لڑکیاں رکھے۔ وہ یہ بات بھول رہی تھی، شادی سے پہلے وہ اسی دفتر کی ادنیٰ سی کارکن تھی۔ اب مگر وہ علاحدگی چاہتی تھی۔ بچوں کو لے گئی اور مقدمہ چل رہا تھا۔"(۳۲)

افسانہ "اکتوبر کے آخری دن" میں حماد اور صباحت جو کزنز ہیں ایک دوسرے کو پسند کرتے ہیں لیکن والدین نے صباحت کا رشتہ بریگیڈیر کے گھر طے کر دیا ہے اس کا منگیتر بھی خوبصورت، دراز قد اور فرانس میں میرین انجینئر تھا جس کے ساتھ صباحت کو بھی فرانس چلے جانا تھا لیکن حالات اور ماحول کی تبدیلی نے جہاں صباحت اور حماد کو یہ سہولیات فراہم کی کہ وہ ایک ہی یونیورسٹی میں ساتھ ساتھ تعلیم حاصل کر سکتے تھے اور ساتھ ساتھ جہاں دل چاہے گھومنے کے لیے جا سکتے، ساتھ اچھا وقت گزار سکتے ہیں وہیں کچھ ذہن ابھی اس تغیر کو قبول نہیں کر پائے کہ وہ بچوں سے ان کی پسند ناپسند جان لیں گو کہ صباحت کے والدین نے اس کے لیے دور حاضر کی ہر آسائش کو مد نظر رکھتے ہوئے ہی اس کے لیے لڑکا تلاش کیا مگر وہ شادی ہو جانے اور فرانس چلے جانے کے بعد بھی حماد کو ہی اپنا شوہر مانتی ہے۔ یہ صورت حال معاشرتی بگاڑ کا سبب بنتی ہے۔

"تم ایک بار فرانس آ جاؤ۔۔۔ میں جی بھر کے تمہارے ہونٹ چوم لوں۔۔۔
حماد کیا تمہیں معلوم ہے میں نے شادی نہیں کی!
ہاں معلوم ہے۔۔۔
کیسے۔۔۔؟
تم نے کہا تھا ارینا کہ میں نے شادی نہیں سمجھوتہ کیا ہے!"(۳۳)

افسانے کے اس بیانیے کے ذریعے بیک وقت دوہرے حالات کو موضوع بنایا گیا ہے ایک وہ جو فرد کو مادیت پرست ظاہر کرتے ہیں دوسرا رشتوں کی پامالی، توڑ پھوڑ اور ہاتھوں سے پھسلتی زندگی کا موجب ہے۔ بیشتر افسانوں میں افسانہ نگار مقدس رشتوں کی کمزور ہوتی گرفت کو بیان کرنے کی سعی کرتے ہیں۔ "مس فٹ" افسانہ عائلی رشتوں میں دوری کے حوالے سے ایک ایسا بیانیہ ہے جس میں ایسے شادی شدہ جوڑے کی کہانی کے ذریعے زندگی کی دوہری حقیقت سے پردہ اٹھایا گیا ہے ایک طرف تو افضل وکیل نے پاکستان میں غربت اور بے روزگاری کی زندگی بسر کی ہے۔ ان کے تین بچوں میں دو بیٹے اور ایک بیٹی ہے جن کو آسائش زندگی فراہم کرنے اور غربت سے تنگ آ کر افضل وکیل آسٹریلیا چلا جاتا ہے جس کی غیر موجودگی میں اس کی بیوی طرح طرح کی مشکلات کا سامنا کرتی ہے مگر جلد ہی ان کے حالات بہتر ہو جاتے ہیں یوں افضل وکیل اپنے بیوی بچوں کی خواہشات پوری کرنے لگتا ہے کہ دوسری طرف اپنی بیگم کو یہ بھی اطلاع دے دیتا ہے کہ آسٹریلیا میں مجبوراً اسے عارضی طور پر ایک آسٹریلین خاتون سے شادی کرنا پڑ گئی۔ ان دوریوں میں اس کی بیوی کے لیے اچھی بات یہ تھی اس کے معاشی حالات تبدیل ہو چکے تھے اب وہ معاشرے کا ایک بااعتماد رکن بن چکی تھی۔ اس کی خواہشات اسے سنار کی دہلیز تک لے جاتی ہیں یوں افسانے کی کہانی کے ذریعے نہ صرف رشتوں کی ڈور کو الجھتے اور ٹوٹتے ہوئے عیاں کیا گیا ہے بلکہ اس میں دولت، حاکمیت، جبر اور زوال کے عناصر بیک وقت عیاں ہوتے ہیں۔ اکیلی عورت جو باہر نکلے تو بری نظروں سے محفوظ نہیں گھر میں کہیں باپ سے کہیں شوہر اور پھر اولاد سے ڈری سہمی ہے۔ وہ عناصر جو بعد میں بیوی کو بھی باغی بنا دیتے ہیں ان کی عکاسی افسانے میں اس طرح سے کی گئی ہے۔

"یوں مت چلو، یوں مت بولو، یوں مت کہو، یوں مت بیٹھو۔ روک ٹوک کے ڈنڈے
میں سارے سجل احساس لپٹ گئے تھے۔۔۔ اکھڑ مزاج وکیل جو دن بھر فارغ بیٹھا

دوسرے وکیلوں کے کلائنٹس کو حسرت سے گھورتا رہتا اور پھر خالی جیب گھر آکر روپے
روپے کے لیے چیختا چلاتا، دنوں بول چال بند رہتی"(۳۴)

ان حالات کے مقابلے میں اب جب کہ شوہر بھی پردیس میں ہے اور وہاں شادی کر چکا ہے تو یہاں بیوی کی زندگی میں پیسے نے جو غیر معمولی اہمیت اختیار کی اور اس وقت اس کی زندگی میں اس کو بہار محسوس ہوئی جب سنار تحفے کے طور پر اس کی تیسری انگلی میں لال نگینے والی انگوٹھی پہنا دیتا ہے۔ حالات کے پیش نظر نہ صرف میاں بیوی کا رشتہ بلکہ بچوں کی زندگی بھی متاثر ہو رہی ہے افسانے کا اختتام امتداد زمانہ کے ساتھ رشتوں میں در آنے والے فاصلوں کا امتزاج ہے۔ افسانہ "ایک عجب چال چل گیا وہ شخص" میں مسز مظہر اور ان جیسی ہزاروں خواتین کی کہانی ہے جو ایسی آزادی کی متلاشی اور خواں ہیں جہاں وہ اپنے شوہر کے بغیر الگ شناخت رکھتی ہوں۔ آزادی کی چکا چوند میں خواتین اپنے پاس موجود جس ہیرے کی قدر نہیں کر پاتی اس خمیر سے طاہرہ اقبال نے اس افسانے کو قلم بند کیا ہے۔ مسز مظہر کے خول کے پیچھے چھپا چہرہ سارہ کا ہے جسے شادی کے بعد اس بات کا شدت سے احساس ہوتا ہے کہ اس نے اپنی خود کی شناخت کھو دی ہے اور اس کا شوہر حاکم اور وہ محکوم ہے۔ جب کہ مظہر کوشش کرتا ہے کہ سارہ کو کوئی تکلیف نہ پہنچے۔ ایک مثالی شوہر بننے کی کوشش میں رہتا ہے جس سے اس کی بیوی خوش ہو سکے لیکن اس بات کا احساس اسے اس وقت ہوتا ہے جب اس کا شوہر کچھ دنوں کے لیے بیرون ملک چلا جاتا ہے۔ بیوی کی سہولت کے لیے ملازم، ڈرائیور، گن مین غرض اپنے فیکٹری کے مینجر تک کو الرٹ کر دیتا ہے کہ ضرورت کے وقت وہ اس کی بیوی کی کال کے منتظر رہیں۔ اس دوران مسز مظہر کو ہر طرف صرف آزادی کے لوازم نظر آرہے تھے۔ مگر شوہر کے جاتے ہی بہت جلد ہر ہر قدم پر سارہ نے جب جب آزادی کو محسوس کرنا چاہا اسے مایوسی کا سامنا کرنا پڑا اور اسے احساس ہو گیا کہ اس کا شوہر تو ہر وقت اس کے لیے حاضر اور موجود ہوتا تھا۔

"گنبد کے معدوم سے شگاف سے جھانکتی آزادی کی چکا چوند ماند پڑنے لگی تھی۔۔۔ مظہر پلیز واپس آجاؤ۔۔۔ اس نے جیسے اقبال جرم کر کے سل اتار پھینکی۔"(۳۵)

آزادی نسواں کے حوالے سے چلائی جانے والی تحریکوں کا معاشرے پر یہی ایک منفی اثر ابھرنے لگا کہ عورت کو آزادی کی چکا چوند مرد کی اہمیت سے غافل کرنے لگی اور وہ خود کو قید، مظلوم و محکوم سمجھنے لگی۔ خواتین کی بااختیار سازی اور ملازمت پیشہ عورت کے مسائل پر بھی کئی افسانے لکھے گئے ہیں۔ ڈاکٹر حمیرا اشفاق کا افسانہ

"راؤنڈ اباؤٹ" اس حوالے سے اہم ہے۔ عہد حاضر میں عورت کو با اختیار بنانے کے لیے بہت سے اقدامات کیے گئے ہیں لیکن پھر بھی خواتین بہت سے مسائل سے دو چار ہیں ۔افسانے میں ملازمت پیشہ عورت کے مسائل اس وقت کھل کر سامنے آتے ہیں جب مل مالک صاف کہہ دیتا ہے کہ بچے کو ساتھ نہیں لا سکتی۔ بچے سنبھالو یا کام کرو مگر دونوں کام ہی اب اس کی ضرورت بن چکے ہیں۔[۳۶] بر سر روزگار عورتیں اپنی انفرادیت تسلیم کروانے کی کوشش کرتی ہیں لیکن اب اس پر دوہری ذمے داری آگئی ہے۔ پیشہ ورانہ ذمہ داریاں نبھانے کے ساتھ ساتھ گھریلو کام بھی کرنے پڑتے ہیں۔ پاکستان میں روایتی اصول گھر کے اندر خواتین کی ذمہ داریوں پر بہت زیادہ زور دیتے ہیں اور اگر وہ ملازمت پیشہ ہوں تو یہ توقع برقرار رہتی ہے کہ خواتین اپنے کیریئر پر خاندانی فرائض کو ترجیح دیں۔ افسانہ "راؤنڈ دی کلاک" جس کو طاہرہ اقبال نے زندگی کے گھومتے پہیے اور مشینی زندگی کی استعارے کے طور پیش کیا ہے، عصر حاضر کی جدید عورت جو مرد کے شانہ بشانہ کھڑی نظر آتی ہے اس کی دوہری ذمے داری کا عکاس ہے۔ افسانے کے آغاز سے ہی ملازمت پیشہ خاتون کی دوہری ذمے داریاں اس وقت عیاں ہونا شروع ہو جاتی ہیں جب وہ بچوں کو سکول سے لینے جاتی ہے۔ سلیم اور مسز سلیم کا کردار جذبات سے عاری مشینی زندگی کی دوڑ دھوپ اور ایک گھڑی کی مانند زندگی گزارتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ افسانہ "گلاب" کے نسوانی کرداروں کی اسی حوالے سے گفتگو معاشرے میں عورت کے لیے پیدا ہونے والے نئے مسائل سے روشناس کروانے میں معاون ہے۔ افسانے کا کردار مس عطرت دل میں ایک حسرت لیے ہوئے گویا ہے "دیکھو ناں مردوں کے کتنے مزے ہیں بس نہا دھو کر نکل لیے، لیکن عورت بیچاری گھر بھی نوکری کرے اور باہر بھی۔"[۳۷] خواتین نے اعلیٰ تعلیم حاصل کی اور وہ اس قابل ہو گئی کہ اپنے پیروں پر کھڑی ہو سکے تو ساتھ ہی تعلیم یافتہ لڑکی کے لیے رشتوں کے مسائل بھی پیدا ہو گئے جس سے معاشرے میں بڑی سطح پر لڑکیوں کے لیے مناسب رشتے نہ ملنے کی صورت میں انہوں نے شادی کو ایک جھنجٹ سمجھتے ہوئے اس سے دوری برتی ان مسائل پر بات کرتے ہوئے طاہرہ اقبال نے افسانہ "لڑکیاں" میں اس صورت حال کو سمویا ہے۔ یہ کہانی چھوٹے سے قصبے کے کالج سٹاف ہوسٹل کی کہانی ہے۔ جہاں مختلف شہروں سے بھرتی ہو کر آنے والی اپنے اپنے مضمون کی ماہر لیکچرار ہیں۔ مس روبینہ، مس فوزیہ اور مس راشدہ ہمارے معاشرے کے وہ کردار ہیں جو اچھے رشتے کے انتظار میں رہ جاتی ہیں اور تنہا زندگی گزار دیتی ہیں۔ مس راشدہ مس فوزیہ سے پوچھتی ہیں:

"تم بتاؤ اس روز جو خواتین تمہیں ملنے کالج سٹاف روم میں آئی تھیں اور بعد میں تمہارے گھر بھی گئیں تو پھر۔۔۔ تو پھر۔۔۔ مس راشدہ جی! وہی سٹیٹس پرابلم۔ مس میچ تو ڈریس بھی برا لگتا ہے۔ یہ تو پھر ذات کا، اذہان کا، اجسام کا میچ ہے۔ بات تو یہی ہے کہ رائٹ میچ رائٹ ٹائم کو نگل جاتا ہے اور پھر رائٹ مین رانگ ٹائم کے اوجھلے میں گم ہو جاتا ہے"(۳۸)

جہاں اس افسانے کا سیاق لڑکیوں کی تعلیم و ملازمت اور سٹیٹس کے مطابق رشتے نہ ملنے کے مسائل کو اجاگر کرتا ہیں وہیں حمید شاہد نے افسانہ "ایک مسلسل زر گزشت" کے ذریعے اس صورت حال کو بھی اجاگر کیا ہے جہاں لڑکی کی ماں اپنا گھر بار سیٹ کرنے پر سارا پیسہ لگا دیتی ہے کیوں کہ اب لڑکی کا رشتہ دیکھتے ہوئے اس کی سیرت سے زیادہ شکل وصورت، تعلیم اور اس کے گھر بار کو اہمیت دی جانے لگی ہے۔

"بیٹی گھر بیٹھی، بوڑھی ہو رہی تھی، اسے بوڑھی ہونے دیتی۔ زمانہ بدل گیا ہے نذیر۔ بیٹی کا باپ بن کر سوچ اس پکے گھر کو دیکھ کر ہی تو یہ رشتہ آیا ہے۔"(۳۹)

یہ بیان معاشرتی اقدار اور توقعات میں تبدیلی کی عکاسی کرتا ہے۔ پکے گھر کو دیکھ کر بننے والے رشتے کا حوالہ مادی اور خارجی معیارات کی طرف بڑھتی ہوئی تبدیلی کا عکاس ہے۔ اس طرح کی بدلتی ہوئی اقدار باہمی پائیدار تعلق کے بجائے سطحی عوامل پر مبنی تعلقات کے بارے میں خدشات کو جنم دیتی ہیں۔ جدید عہد میں رشتوں کا مسائل کے حوالے سے عالمگیر صورت حال کے نتیجے میں ایک نئی صورت حال بھی جنم لے رہی ہے جس کو مبین مرزا نے افسانہ "اجنبی موسم" میں سمویا ہے۔ افسانے سے اقتباس ملاحظہ ہو:

"آدمی شادی کے بغیر زیادہ اچھی اور پر لطف زندگی گزار سکتا ہے۔ امریکا میں بلکہ یورپ میں بھی اب ایسے لوگ خاصی تعداد میں ہیں جو ایڈہاک ازم میں believe کرتے ہیں۔ ایڈہاک ازم-وقتی ضرورت کا نظریہ۔ بھئی واقعی زندگی کے جبر میں مستقل اضافہ کرنے کی کیا ضرورت ہے؟ سب کچھ کنٹریکٹ پر available ہے۔ No life long responsibility کھاؤ پیو، موج اڑاؤ۔"(۴۰)

پاکستانی معاشرے کی اقدار میں ازدواجی زندگی کے آغاز میں نکاح ہی کو وہ واحد مقام حاصل ہے جو دو نا محرم لوگوں کو محرم بنا سکتا ہے۔ لیکن عالمگیریت کے زیر اثر مستقبل میں کرداروں کی خواہشات کس طرف رخ کر رہی ہیں اس کو افسانہ نگار نے فرخندہ اور منور کے مکالمے کے ذریعے اجاگر کیا ہے۔ جس میں فرخندہ منور سے

شادی کی خواہش رکھتی ہے لیکن منور کی مغربی سوچ کے زیر اثر نکلتے الفاظ فرخندہ کو ہی صرف جھنجھوڑنے کے لیے کافی نہیں بلکہ قاری پر بھی مستقبل کے المیے کو وارد ہوتے محسوس کیا جاسکتا ہے۔

افسانہ نگاروں نے جہاں اس عہد کے بدلتے ہوئے حالات کے مطابق بدلتی ہوئی اقدار کو اجاگر کیا ہے وہیں ان افسانوں میں عہد کے مسائل کا گہرا ادراک بھی موجود ہے۔ "پانیوں پر بہتی پناہ" افسانے میں زاہد حنا نے معاشرے میں موجود دقیانوسی تصورات کو پیش کیا ہے جو خواتین کے لیے مسلسل مسائل کا باعث بن رہے ہیں۔

> "ہم دونوں چاہتے ہیں کہ مولویوں کے چنگل سے بچ کر تم یورپ یا امریکہ نکل جاؤ جہاں کی حکومتیں تم سے ہمدردی رکھتی ہیں، جہاں کے اخباروں نے تم پر بہت کچھ لکھا ہے۔"(۴۱)

مغربی معاشرے میں عورت کو ہر طرح سے آزادی حاصل ہے اس کے مقابلے پاکستان میں روایت پسند مذہبی علما عورت کی بے لگام آزادی پر جو فتوے لگاتے ہیں اور یہاں خواتین کو جن مسائل کا سامنا ہے ان سے تنگ آ کر روشن خیال لکھنے والی خاتون کو ملک چھوڑنا پڑ رہا ہے کہ یہاں اسے وہ تحفظ حاصل نہیں ہے۔ ایسے مسائل سے پیدا ہونے والی مایوسی اور تنہائی کے کرب کو زاہد حنا نے اس طرح افسانوں میں بیان کیا کہ بقول شاہدہ حسن:

> "زاہدہ حنا اپنے عہد کے بھرپور شعور کے ساتھ، متضاد اقدار کے تصادم سے پیدا ہونے والی اس نئی صورت حال کو گرفت میں لیتی ہے۔ یہ تصادم جو ماضی اور حال کی سماجی اقدار کے ایک دوسرے سے بالکل برعکس ہونے کی وجہ سے ظہور پذیر ہوا ہے اور جس کے نتیجے میں، ایک گھمبیر اور غیر یقینی صورت حال کا سامنا کرنے والی موجودہ نسلوں میں پژمردگی، اداسی اور حزن و ملال کی کیفیات پیدا ہو گئی ہیں۔"(۴۲)

پاکستان میں جہاں لوگوں کا شہری زندگی کی طرف رجحان بڑھا ہے اور کچھ لوگ جو دیار غیر میں جا بسنے کو ترجیح دیتے ہیں ان کو پیش آنے والے مسائل کی تصویر کشی بھی افسانہ نگاروں نے کی ہے۔ شام کہانی، تصویریں اور دیواریں، مٹی کی مہک، آواز اور عکس کے درمیان اور گمان کے رشتے رشید امجد کے ایسے افسانے ہیں جن میں ملک سے باہر جانے والے خاندانوں کو وہاں پیش آنے والے مسائل اور خاص طور پر جب والدین کو یہاں تنہا چھوڑ کر بچے غیر ممالک میں جا بستے ہیں ان بوڑھے والدین کے احساسِ تنہائی اور دوری کے کرب کو احساس

جذبات کے ساتھ مہمیز کیا گیا ہے۔ اسی طرح پاکستان کی شہری زندگی اور اس میں اقدار کی شکست وریخت کو بھی افسانوں میں سمویا ہے۔ رشید امجد لکھتے ہیں:

"شہر کے باسی بے خبر اپنی ہوہاؤ میں مصروف تھے، فضا پر ایک عجیب اداسی سی تیر رہی تھی، بظاہر سکون میں افراتفری بھی نیچے کہیں موجود تھی لیکن بظاہر سب ٹھیک تھا۔"(۴۳)

عصری فکشن سائنس، ٹیکنالوجی اور مادی آسائشوں کی تیز رفتار ترقی سے متاثر شہری زندگی معاشرتی اقدار کے زوال اور غیر انسانی پن کو اجاگر کرتے ہوئے افسانہ نگاروں نے جدید ادب میں انسانی تجربات، روایات اور سماجی روابط کی گہرائی کو اجاگر کیا ہے۔ فرمان فتح پوری جدید عہد کے افسانوں پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"سائنس اور ٹیکنالوجی کی بڑھتی ہوئی ترقی اور مہیا کردہ مادی آسائشوں کے زیر اثر زندگی خصوصاً شہری زندگی کے تہذیبی دیوالیہ پن اور آدمیّت کے احساسِ محرومی کا کرب آج کے افسانے پر حاوی ہے۔"(۴۴)

افسانہ نگاروں نے شہری ماحول کے ایسے افراد کی تصویر کشی کی ہے جو محض مادیت پر مبنی خوبصورت شہری مکھوٹے کو ہی سب کچھ سمجھ بیٹھے ہیں۔ انسانی وجود کی پیچیدگیوں کو تلاش کرتے ہوئے افسانہ نگاروں نے اقدار کی شکست وریخت سے پیدا ہونے والے معاشرتی بحران کی جو تصویریں پیش کی ہیں ذیل میں ان کا احاطہ کیا جارہا ہے۔ گاؤں کے گاؤں شہر کا لبادہ اوڑھتے چلے جارہے ہیں اور جھونپڑیوں میں رہنے والے شہری زندگی کی آرزو میں اس کے نقائص کے گرداب میں پھنستے چلے جارہے ہیں۔ عالی شان بنگلوں اور عمارتوں کی چکاچوند نے سب کی آنکھوں کو خیرہ کر دیا ہے۔ مادیت پرستی بڑھنے سے مختلف نقائص نے جنم لیا ہے جسے گل زیب عباسی نے "شہر تمنا اور جال" میں اس طرح سے بیان کیا ہے:

"شہر تمنا میں ہر سو مادہ پرستی کے انبار لگ گئے۔ چمکتی دمکتی بلند وبالا عمارات تو مسکرانے لگیں لیکن لوگ آتش دان کے ارد گرد بیٹھنے کی سانجھ بھول گئے۔ ہوس، طمع، بے حسی کے پر لگا کر ہواؤں میں تیرنے لگے مگر دلکش، خوب صورت معصوم پرندے معدوم ہو گئے۔ آبشاروں کے صاف شفاف نغمے بے ہنگم غوغائے بدتمیزی میں بدل گئے۔ بے ضمیری اور بے رحمی کی آگ بھڑکی تو قتل وغارت اور زنا جائز ہو گئے۔"(۴۵)

شہری زندگی نے کیسے نظام زندگی بدل دیا ہے اس کے ساتھ ساتھ انسان اپنی ظاہری اور باطنی ہیئت کیسے بدلتا جا رہا ہے اس کو بھی افسانے میں موضوع بنایا گیا ہے۔ افراد اقدار کی تشکیک اور کشمکش میں مبتلا ہیں۔ قدروں کی از سر نو تعمیر اور موجودہ اخلاقیات پر ایسے سوال اٹھایا گیا ہے کہ جیسے ہمیشہ سے ہی یہ ہماری قدریں تھیں۔ بقول وارث علوی پورا نظام جو سائنسی ایجادات کا مرہونِ منت ہے، اقدار کو تہس نہس کرتا ہے لیکن اپنی اقدار پیدا نہیں کرتا۔[۴۶] گل زیب عباسی افسانہ "امیر شہر کی قیمت" میں شہری تہذیب کے زوال کی عکاسی کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> "یہ اندھی تہذیب خود بخود تم میں رچ بس جائے گی۔ مکر کا لبادہ، منافقت بھری شیریں گفتگو، بات بات پہ جھوٹی قسمیں، بد اخلاقی، بے ادبی کے رنگ، تمہارا اوڑھنا بچھونا ہوں گے۔ دوسروں کا خون بھی شوق اور فخر سے پیو گے۔ دوسروں کا حق چھین لینا، بد عنوانی تمہاری اولین ترجیح ہو گی۔"[۴۷]

یہ افسانہ علامتی طور پر ملک کے سیاسی اور سماجی حالات کو بیان کرتا ہے۔ گاؤں سے دو لوگ کہیں غلطی سے شہر کو نکل آتے ہیں۔ جس پر خضر کا کردار انہیں اس شہر کے حالات اور برائیوں سے آگاہ کرتا ہے کہ بہت جلد اس بدبو میں تم لوگ رنگ جاؤ گے اور دیکھو گے کہ تم لوگوں کو بدبو آنا بھی بند ہو جائے گی ہر غلط چیز درست معلوم ہو گی۔

> "قانون ونون سب کچھ ہے۔ لیکن کوئی بندہ بشر مانتا ہی نہیں، نتیجہ شہر کا شہر اندھا ہو گیا، ہر برائی سرکاری طور پر سختی سے منع ہے۔۔۔۔ لیکن لوگوں نے دھرنے دینے، سڑکیں توڑنے، جلاؤ گھیراؤ، مار دھاڑ کی راہ پکڑ لی ہے۔۔۔"[۴۸]

بصیرت افروز اور معنی خیز یہ افسانے معاشرے کی حقیقی عکس بندی کرتے ہیں۔ زندگی کے بہت سے ایسے مظاہر جن کا تعلق انسانی فطرت اور انسانی وجود کے المیوں سے ہے ان کو معاشرے کے نباض کی طرح پیش کرنے میں افسانہ نگاروں نے معاشرے میں آنے والے تغیرات اور زبوں حالی کو اپنے بیانیوں میں سمویا ہے۔ افسانہ نگاروں نے مہارت کے ساتھ ثقافتی شناخت کی پیچیدہ تہوں، معاشرتی مسائل بشمول صنفی عدم مساوات اور طبقاتی تفاوت پر کہانیاں تخلیق کی ہیں۔ یہ بیانیے روایت اور جدیدیت کے سنگم پر مکالمہ ہیں جو عالمگیریت اور ٹیکنالوجی کی ترقی پر پاکستانی معاشرے کی ابھرتی ہوئی صورت حال پر روشنی ڈالتے ہیں۔ "آج کا مرنا" افسانے میں مصنف نے دو ادوار کا تقابل کیا ہے کہ بچپن میں سکھائے گئے آداب، بزرگوں کا احترام اور

اس وقت کیسے خوش حال شہر تھا لیکن نائن الیون اور سیاسی اجارہ داری بعد کس طرح تیزی سے نہ صرف حالات بدل گئے بلکہ معاشرتی قدریں بھی اس قدر زوال کا شکار ہو گئی ہیں کہ کوئی مر بھی جائے تو کوئی کسی کے لیے نہ کوئی رکتا ہے نہ یاد کرتا ہے اور اپنی موت سے غافل شہر کے لوگ شہر کے چکرویو میں گول گول گھوم رہے ہیں۔

"نیلی اور سرخ پٹیوں والے نشان اور باوردی آدمیوں کے ہر وقت بیٹھے رہنے سے مجھے معلوم تھا کہ یہ پولیس اسٹیشن ہے۔۔۔"وہ مر گئی ہے؟" آپ کے تھانے کی دیوار کے ساتھ۔۔۔میں نے اسے باوف کرانا چاہا۔" آپ نے پڑھا ہوتا۔ یہ تھانہ نہیں ہے۔۔۔" اس کے چہرے پر تمسخر بھری ہلکی سی مسکراہٹ ابھر آئی۔"یہ جرائم کی تفتیش کا دفتر ہے۔ سارے لوگ جانتے ہیں، یہ صدر کے علاقے کا سی آئی اے سینٹر ہے۔۔۔ آپ کو تھانے میں جا کر رپورٹ درج کرانی چاہیے تھی۔۔۔"(۴۹)

جدید شہری زندگی کے ابھرنے سے پرندے شہروں سے رخصت ہو گئے ہیں۔ کسی کو کسی کی پرواہ نہیں اور جدید انسان پنجرے میں قید پرندے کی طرح ہو گیا ہے۔ جدید طرز زندگی کا قیدی ایک سی روٹین میں لگا بندھا، حالات و واقعات سے بے خبر، دنیا کمانے کی فکر میں مصروف ہے۔ آصف فرخی کا افسانہ "پرندے کی فریاد" کی فریاد اسی علامتی پیرائے میں لکھا گیا ہے۔ ابن مسافر کے "مددگار" افسانے میں جب ایک شخص لڑکی کو ہسپتال پہنچانے کے لیے گاڑیوں کو روکنے کی کوشش کرتا ہے مگر کوئی نہیں رکتی۔

"شاید کوئی گاڑی نہیں رکے گی، اس نے سوچا۔ مدد کرنے سے ہر کوئی گھبراتا ہے، کوئی رک بھی جائے گا تو لڑکی کا سن کر شاید گھبرا جائے گا۔"(۵۰)

جدید دور کے بدلتے ہوئے تقاضوں نے ہماری بہت سی اخلاقی قدروں کو پامال کیا۔ بے ہنگم آزادی کی لہر نے خاندانی روایات کو بری طرح متاثر کیا۔ خواتین اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے بعد جب ملازمت میں آئیں تو اس چیز نے عورت اور مرد کی روایتی حیثیت کو بدل ڈالا عورت باشعور ہونے کے ساتھ ساتھ با اختیار بھی ہو گئی اور کسی حد تک بے لگام بھی۔ ایک طرف جدیدت نے دقیانوس روایت سے بغاوت کی تو دوسری طرف روشن خیال ذہنوں میں رشتوں کی خوبصورتی کا احساس بھی کسی حد تک معدوم ہونے لگا۔ سماج خوش حال ہو یا مفلوک الحال انسان کے دوسرے انسان کے ساتھ تعلقات کی مثبت نوعیت ہی معاشرے میں اعلیٰ اخلاقی اقدار کو فروغ دے سکتی ہے۔ معاشرے میں آنے والے تغیرات نے جہاں انسان کی ترجیحات میں تبدیلی کی لہر پیدا کی وہیں تشکیل پاتے ہوئے نئے معاشرے نے انسان کو انسان سے اخلاقی سطح پر دور کر دیا۔ ان حالات سے

انسانیت تک خطرے میں پڑ گئی۔ منتخب کردہ افسانوں کے مطالعے سے عیاں ہوتا ہے کہ عصری منظر نامے کے تناظر میں افسانہ نگاروں نے اپنی تخلیقات میں دردمندانہ رویہ اپنایا ہے۔ معاشرے کے افراد نہایت ہی پیچیدہ اور پر اسرار جذباتی قوتوں کی کشمکش میں الجھے ہوئے ہیں۔ خارجی آزمائشیں انسان کو اندرونی طور پر اس قدر متاثر کر رہی ہیں کہ انسان اپنے کردار کو روشن خیال، پر اعتماد، مستقل مزاج سمجھنے کی غلطی کر بیٹھا ہے۔ افسانہ نگاروں نے اپنے تخلیقی جوہر سے انسانی وجود کی ان اخلاقی پیچیدگیوں کی آگہی پیدا کرنے کے لیے انسانی جبلتوں، جذبات و احساسات کو گہرائی سے بیان کیا ہے۔ معاشرتی زندگی کے چند اصلاح طلب پہلو کرداروں کی زندگی، مکالموں کی صورت میں اسلوب کی چاشنی اور سب سے بڑھ کر تجربات کا نچوڑ ان ادیبوں کی تحریروں میں نظر آتا ہے۔ خالد فتح محمد افسانہ "طارق میرک" میں دو نسلوں کے تضاد کا حال اور ماضی کے ضمن میں موازنہ کرتا ہیں۔ پرانے وقتوں میں دادا دادی یا بزرگوں کا ایک مقام رعب اور دبدبہ ہوتا تھا اور ان کے سامنے کسی کو پلٹ کر جواب دینے کی ہمت نہیں ہوتی تھی۔ نئی نسل اور پرانی نسل کے درمیان ذہنی و جذباتی و نظریاتی فرق کو واضح کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

> "دادا ابو! میں جاہل نہیں ہوں۔" مجھے اس کا یہ طریقہ پسند نہیں آیا اور یہ بھی خیال آیا کہ شاید مذاق کر رہا ہو۔ ایسے مذاق بھی اس کے مزاج کا حصہ تھے۔ میں دلچسپی کے ساتھ ہنسا: سوہرا جاہل نہ کہوں تو کیا کہوں؟"" میں آپ سے کہہ چکا ہوں کہ میں جاہل نہیں ہوں۔ جہالت تو آپ کی نسل کا حصہ تھی۔ بے چارے زمانۂ جاہلیت کے لوگ!"(۵۱)

ہمارے ہاں سب سے اہم مسئلہ مختلف نسلوں کے درمیان بڑھتی ہوئی دوری ہے۔ پہلے وقتوں میں گھر کے بزرگ گھر کے سربراہ کی حیثیت رکھتے تھے ان کی اولاد، پوتے پوتیاں، بہویں، بیٹے سب گھر کے سربراہ کے فرمانبردار ہوتے تھے۔ گھر کے سربراہ کا فیصلہ خواہ کتنا ہی طبع پر گراں ہو حتمی ہوا کرتا تھا۔ افراد خانہ گھر کے سربراہ کی عزت کرتے تھے۔ لوگ باپ دادا کے نام سے پہچانے جاتے تھے اور باپ دادا کا نام فخر سے لیا کرتے تھے لیکن جدید دور کا المیہ یہ ہے نوجوان دادا چھوڑ باپ کا نام بھی یاد رکھنے سے قاصر ہیں۔ وہ اپنے ان بزرگوں کو عزت یا وہ مقام دینے کے لیے تیار نہیں بلکہ یہ رشتے ان کے لیے بوجھ کی مانند ہیں۔

> "اس زمانے میں نوجوان نسل تو اپنے دادا کا نام یاد رکھنے کی بھی روادار نہیں"(۵۲)

اقتباس نوجوان نسل اور ان کی آبائی جڑوں کے درمیان منقطع ہونے والے تعلق کو اجاگر کرتا ہے۔ روایتی اقدار اور طرز عمل جو کبھی بہت زیادہ اہم تھے جدید اثرات کے سامنے اہمیت کھو رہے ہیں نوجوان نسلیں کی ترجیحات میں تبدیلی اپنے پیش روؤں کے مقابلے زندگی کے مختلف پہلوؤں جس میں ان کا کیریئر اور ذاتی ترقی شامل ہے اس کو ترجیح حاصل ہے۔ ہماری نئی نسلیں پرانی نسل سے بہت زیادہ فاصلے پر ہیں۔ پچھلی نسلوں میں ضروری خیال کیے جانے والے اقدار اور اصولوں کو نئی نسل مختلف طریقے سے معاشرتی منظر نامے کے مطابق دیکھتی ہے ان کے نزدیک خاندان کے افراد کے ساتھ گہرے روابط کو ترجیح دینا ضروری نہیں۔ معاشی چیلنجز اور سماجی دباؤ افراد کی توجہ مستحکم کیریئر اور مالی آزادی حاصل کرنے پر مرکوز کرتی جارہی ہے جس سے ان کے پاس خاندانی تعلقات کے لیے محدود وقت اور توانائی باقی رہ جاتی ہے۔ ذاتی خواہشات اور اہداف اکثر اجتماعی خاندانی مفادات پر فوقیت اختیار کرتی جارہی ہیں۔ تبدیلی کی اس تیز لہر کو محسوس کرتے ہوئے رشید امجد کے بیشتر افسانوں میں اس کی عکاسی کی گئی ہے۔ مثلاً افسانہ "پرانی آنکھوں سے دیکھنے کا آخری دن" واحد متکلم مرکزی کردار کے اپنے دور کے تیزی سے بدلتے تقاضوں میں پیچھے رہ جانے کے احساس سے پھوٹتی کہانی ہے۔ بیٹے کا باپ سے کہنا کہ "ابو آپ نہیں سمجھتے، چیزیں اب بدل گئی ہیں۔"(۵۳) اور فلیش بیک میں باپ کا سوچنا کہ وہ اپنے بچپن میں کبھی اپنے والد کو ایسا کہنے کے بارے میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔ بدلتے عہد کی بدلتی زندگی کی دیگر سفاکیوں کو بھی افسانے میں اجاگر کیا گیا ہے جیسے ایک دوسرے کو دھکا دے کر آگے نکلنے کی دوڑ، بے ہنگم بے قابو ٹریفک، قانون شکنی، دھتکارے رویے وغیرہ۔ عصری ماحول میں بچوں کی تربیت پر زیادہ توجہ نہ ہونے کی وجہ سے بہت سی برائیاں جنم لے رہی ہیں۔ بچے ملک و قوم کے مستقبل کا اثاثہ ہوتے ہیں۔ بچوں پر توجہ مرکوز نہ کی گئی تو نئی نسل تباہی کی جانب گامزن ہو جائے گی۔ "کہانی کی رات" افسانے میں باپ بیٹے کے درمیان ہونے والی گفتگو جس میں بیٹے کا باپ کو بے وقوف اور نالائق سمجھتے ہوئے ہم کلام ہونا ملاحظہ ہو:

> "اس نے ایسی خفگی سے مجھے دیکھا جیسے باپ نالائق بیٹے کو دیکھتا ہے۔۔۔ "ابو جی آپ کو معلوم تو ہے نت نئے وائرس ایجاد ہوتے رہتے ہیں" اب اس کے لہجے میں خفگی آتی جا رہی تھی۔ میں نے مزید سوال جواب کا سلسلہ روک دینا مناسب سمجھا"(۵۴)

داخلی کشمکش اور خارجی جدوجہد کے ذریعے نصب العین پانے کی کوشش میں سرگرداں نوجوان نسل جہان نو کو تسخیر کرتے ہوئے بھول رہی ہے کہ معاشرے میں بڑوں اور خاص طور پر والدین سے ہم کلام ہونے کے ادب و آداب کیا تھے۔ یہاں تک کہ رشتوں کا احترام بھی ختم ہو گیا ہے:

"لو اور سنو باجی! چھوٹا دیور جو بیاہی آئی کی گود میں ساس نے بٹھایا تھا، کل وہ بازو پکڑنے اور ڈھارے میں رگیدنے لگا، لو میں نے بھی خوب ہی دھپے لگائے، حرامی بولا تیرے دھپوں میں بھی مزا ہے جانم۔۔۔"

"انڈین فلموں سے سیکھتے ہیں نا یہ ساری بکواس۔۔۔ برے کہیں کے۔"(۵۵)

اقدار میں تغیر مضبوط خاندانی روابط کو برقرار رکھنے اور اپنے آباؤ اجداد کو یاد رکھنے کی اہمیت کو متاثر کر رہا ہے۔ مضبوط خاندانی رشتوں کو فروغ دینے اور معاشرے کو جدید رجحانات کے مطابق ڈھالنے کے لیے ان تبدیلیوں کو سمجھنا اور ان سے نمٹنا بہت ضروری ہے۔ آصف فرخی کا افسانہ "نانو ہاؤس" پرانی اور جدید اقدار کا خوبصورت تقابل ہے۔ اس پورے افسانے کی کہانی پرانے زمانے کی روایات اور جدید اقدار کے مابین فرق کو اجاگر کرتی ہے۔ جدید زندگی کی ابھرتی ہوئی حرکیات نے روایتی خاندانی ڈھانچے میں ایک قابل ذکر تبدیلی پیدا کی ہے جس میں بوڑھے والدین زیادہ متاثر ہو رہے ہیں۔ عمر رسیدہ والدین کی دیکھ بھال اور مدد جدید نسل کے لیے ایک پیچیدہ مسئلہ بن گیا ہے۔ اس افسانے میں بھی بچوں کا کردار ماں کی خدمت کو مصیبت سمجھ رہا ہے۔

"میری تو عقل جواب دے گئی ہے کہ اب ان کا کیا کریں۔ کہیں چھوڑ کر بھی تو نہیں آ سکتے۔ کوڑے کے ڈھیر پر نہیں ڈال سکتے۔ ایدھی والوں سے نہیں کہہ سکتے کہ انہیں لے جائیں۔ ان کا ٹھکانا کہاں ہو گا۔"(۵۶)

اقدار معاشرے کے اخلاقی تانے بانے کی تشکیل میں بنیادی کردار ادا کرتی ہیں۔ اقدار وہ اصول اور عقائد ہیں جو صحیح یا غلط، اچھے یا برے کا تعین کرنے میں افراد کی رہنمائی کرتے ہیں۔ وہ اخلاقی فیصلہ سازی کی بنیاد بناتے ہیں اور معاشرے کے مجموعی اخلاقی کردار میں حصہ ڈالتے ہیں۔ ایک ایسے معاشرے میں جہاں اقدار کا فقدان ہو یا انہیں نظر انداز کیا جائے، وہاں اخلاقیات کی کمی محسوس کی جا سکتی ہے۔ اخلاقیات اکثر مشترکہ اقدار میں جڑی ہوتی ہیں جو قابل قبول رویے کی وضاحت اور اجتماعی ذمہ داری کا احساس پیدا کرنے میں مدد کرتی ہیں۔ ان رہنما اصولوں کے بغیر معاشرہ اخلاقی زوال کا شکار ہو سکتا ہے۔

"ابا کا باغچہ" افسانے کی کہانی جدید معاشرے کی عکاس ہے ایک تعلیم یافتہ معاشرہ کیسے اخلاقی سطح پر پسماندگی کی جانب جا رہا ہے۔ معاشرے میں بے ایمانی، خود غرضی اور اخلاقیات کی بڑھتی ہوئی کمی دیکھنے میں آئی ہے۔ کہانی کار وای عصری معاشرے کے ان عوامل کا جائزہ لیتا ہے جس نے انسان کی ترجیحات بدل دی ہیں اور ان میں فرد صرف اپنے بارے میں سوچنے لگا ہے۔

"مجھے اپنے رفقائے کار کے رویوں پر حیرت ہوتی۔ ان کی نظر میں انسانی اقدار اور احساسات اہمیت کھونے لگے تھے اور سب کے سامنے ذاتی ترقی کی حسینہ برہنہ حالت میں ان سے ایک قدم آگے چل رہی تھی۔"(۵۷)

معاشرے کی قدیم و جدید اقدار اس تصادم سے بکھر رہی ہیں۔ افسانہ "رہگزر" کا متن اس بات کی دلیل ہے کہ معاشرہ اپنے بنیادی اصولوں سے بھٹک گیا ہے۔ یہاں ایک ایسا خلا پیدا ہوا ہے جہاں منفی عناصر اور تخریبی قوتوں کو اہمیت حاصل ہو گئی ہے۔ "رہگزر" سے منتخب متن ملاحظہ ہو:

"ہم ایسا معاشرہ بن گئے جو اپنی قدروں پر یقین کھو بیٹھا، اب ہم بغیر اقدار کے تھے۔ شاید کلاشینکوف ہماری قدر تھی یا نفرت ہماری قدر تھی یا شاید منافقت ہماری قدر تھی۔"(۵۸)

مرزا حامد بیگ کا افسانہ مٹی کا زنگ معاشرے کی مٹتی ہوئی قدروں کا نمائندہ ہے۔ کہانی کا پلاٹ پاکستان ریلوے پلیٹ فارم کے پس منظر میں پیش آنے والے واقعے کے تناظر میں تشکیل دیا گیا ہے جہاں بھانت بھانت کے افراد کا گزر رہتا ہے۔ اس افسانے کا مرکزی کردار ایک مرا ہوا شخص ہے جو ریلوے سٹیشن کے ایک بینچ پر کسی زندہ انسان کی طرح بیٹھا ہوا ہے۔ آتے جاتے لوگ طرح طرح کے سوال کرتے ہیں کہ یہ کیسے مرا؟ کہاں سے آیا؟ پولیس کو اطلاع دو وغیرہ مگر آتے جاتے لوگوں میں سے کوئی بھی آگے بڑھ کر اس لاش کو ٹھکانے لگانے یا پولیس کو اطلاع کرنے کی ہمت نہیں کرتا اگر کوئی قریبی چوکی کے اہل کاروں کو اطلاع دیتے بھی ہیں تو وہ اس کو اپنے دائرہ حدود سے باہر کا کیس قرار دے دیتے ہیں۔ رات گئے کچھ پولیس اہل کار آتے ہیں تو وہ بھی خاموشی سے اس کو ٹرین کے خاموش ڈبے میں بٹھا آتے ہیں اور دیکھنے میں آتا ہے کہ اس مردہ شخص کے سر پر اگلے دن پختونوں والی ٹوپی ہوتی ہے اور وہ اسی بینچ پر پڑا ہوتا ہے۔ یوں لاش کے فٹ بال بننے اور زوال پذیر معاشرے کی عکاسی کرتے ہوئے اس افسانے پر فصیل جعفری ان الفاظ میں اظہار خیال کرتے ہیں:

"مٹی کا زنگ میں ایسے پورے سماج پر طنز ہے، جہاں کے لوگ پوری طرح ایک دوسرے سے لاتعلق اور بے حس ہو چکے ہیں۔ ان کے اندر انسانیت کی اتنی بھی رمق باقی نہیں رہ گئی کہ دو چار افراد یکجا ہو کر کسی مردہ شخص کی لاش کو ٹھکانے لگانے کی کوشش کر سکیں۔ خود غرضی اور نفسا نفسی کے اس ماحول میں یہ لوگ خود چلتی پھرتی

لاشوں سے زیادہ اہمیت نہیں رکھتے۔ تہذیبی اقدار ہی نہیں، مذہبی اقدار کا بھی خاتمہ ہو چکا ہے۔"(۵۹)

یہ افسانہ معاشرے میں پائے جانے والے صوبائی تعصب کو بھی آشکار کرتا ہے۔ انسان بظاہر تو زندہ ہے لیکن اس کے اندر کا انسان مر چکا ہے۔ مٹی کا زنگ انسان کی اسی زنگ آلودہ اور زوال شدہ زندگی کا استعارہ ہے۔ مسعود مفتی کے افسانے "ایک چھوٹا سا شعلہ" کی کہانی ڈپٹی کمشنر کے دفتر سے شروع ہوتی ہے یہ زمانہ ۱۹۵۸ء میں مارشل لاء سے پہلے کا ہے۔ ڈپٹی کمشنر کے پاس جب ایک جاگیر دار اپنے بیٹے کو نائب تحصیلدار نامزد کرنے کی سفارش لے کر آتا ہے تو ڈپٹی کمشنر اس جاگیر دار کے بیٹے کو اس منصب کے لیے قانون اور میرٹ کے مطابق نااہل قرار دیتے ہوئے معذرت کر لیتا ہے۔ لیکن جیسے جیسے حالات تبدیل ہوتے گئے لاقانونیت بڑھنے لگی وطن کے محافظ چھینا جھپٹی، چوری چکاری جیسی واردات میں ملوث ہونے لگے۔ جیسے جیسے اس افسانے کی کہانی آگے بڑھتی ہے ۲۰۰۸ء کا کراچی میں ہونے والا واقعہ ہے جو لاقانونیت کے چلتے محلے والوں کو قانون اپنے ہاتھ میں لینے پر مجبور کر دیتے ہیں۔

"پولیس کے حوالے مت کرو۔ وہ ان سے پیسے لے کر انہیں چھوڑ دیں گے" ہجوم میں کئی آوازیں ابھریں۔ دونوں اسیروں پر مکے، گھونسے، لاتیں اور ٹھوکریں برسنے لگیں۔"۔۔۔اور اگلے لمحے وہ دونوں شعلوں میں لپٹے زمین پر تڑپ رہے تھے۔"(۶۰)

اسد محمد خان کا افسانہ "مرد، عورت، بچہ اور سلوتری" بھی اسی صورت حال کو اجاگر کرتا ہے۔ اس کا آغاز سمندری سیر کو نکلنے والے آٹھ آدمیوں اور ایک بچے کی کہانی کے بیان سے ہوتا ہے کہ وہ سب رخت سفر باندھے سیر کے لیے نکلتے ہیں مگر سمندری سفر کے دوران لانچ کا رڈ ٹوٹ جاتا ہے اور بعد میں انجن بھی خراب ہو جاتا ہے جس کی وجہ سے وہ پانی میں بہتے چلے جاتے ہیں۔ ان میں سے جن افراد کو تیراکی آتی تھی وہ تیرتے ہوئے کنارے تک جا پہنچتے ہیں یا ڈوب جاتے ہیں یہ کسی کو علم نہیں کہ کہاں جاتے ہیں۔ البتہ ان میں شامل ایک عورت جس کے پاس دو تین سال کا بچہ ہے وہ اپنے بچے کی وجہ سے تیرنے کا رسک نہیں اٹھاتی جب کہ اس کا شوہر جو بچے کا باپ بھی ہے وہ وہاں موجود ایک ہی حفاظتی جیکٹ پہن کر اپنی جان بچا کر بھاگ نکلتا ہے۔ بچ جانے والوں میں مرد، عورت اور بچہ شامل ہیں جن کو سلوتری جو پاگلوں کا ڈاکٹر ہے اپنے ناپاک ارادوں کو پورا کرنے کے لیے ان کی مدد کرتا ہے اور اپنے ٹھکانے پر لے جاتا ہے۔ جہاں عورت اپنے بچے کو بچانے کے لیے اس کا قتل کر دیتی ہے۔

"سب کو خبر تھی تو ادھر گاؤں میں پولیس کو اس کے پیچھے کیوں نہیں لگا دیا سب نے؟"
"پولیس ادھر کاں دھری ہے۔" وہ مرد کی احمقانہ بات پر مسکرایا۔ کہنے لگا، "پھر یہ بھی ہے کہ ادھر کوئی چکر میں نہیں پڑنا چاہتا۔"(۶۱)

پاکستانی معاشرے میں لوگوں کا قانون کو اپنے ہاتھ میں لینے کے رجحان بڑھ گیا ہے۔ جس کی مختلف وجوہات میں کمزور قانونی ڈھانچہ، نا اہل بھرتیاں، بد عنوانی، اور سست عدالتی عمل ہے۔ اس صورت حال نے قانونی نظام پر عوام کے اعتماد کو ختم کر دیا ہے۔ سیاسی عدم استحکام نے ان مسائل کو بڑھاوا دیا ہے۔ ناصر عباس نیر کا افسانہ "تمہارا قانون....." پاکستان کے قانونی نظام کے حوالے سے گہری بصیرت فراہم کرتا ہے۔ کہانی جیل میں موجود سخت جان اور اپنے موقف پر قائم پانچ ساتھی قیدی جو جیل کی کوٹھڑی میں بند کیے گئے ہیں اور انہوں نے بھوک ہڑتال کر رکھی ہے، ان کے نظریات سے آگے بڑھتی ہے۔ یہ قیدی اپنا مقدمہ عدالت میں میں لڑنے کے خلاف ہیں اور اس پر سخت تنقید کرتے ہیں۔ اسی طرح معاشرے سے انصاف کی رمق ختم ہو جانے پر اس پر تنقید کرتے ہوئے کہتے ہیں:

"ہم تمہارے انصاف کی تضحیک کرتے ہیں تاکہ ہم اپنے ساتھ سچائی برت سکیں۔ ہم تم سے خوفزدہ نہیں ہیں، اپنے انجام سے خوفزدہ نہیں ہیں، یہ ہمارا سچ ہے۔ صرف بزدل اور لالچی لوگ نہیں مسکراتے۔ ہم سرعام تمہارے قانون کا ٹھٹھا اس لیے اڑاتے ہیں کہ وہ قانون خود اس کی دعوت دیتا ہے۔"(۶۲)

افسانے میں نئی اور پرانی حکومتی فیصلوں پر بھی تنقید ملتی ہے جیسا کہ ان پانچوں کو یک طرفہ فیصلہ کرتے ہوئے سزائے موت دی گئی تھی جب کہ نئی آنے والی حکومت جس جگہ ان کو قید کر رکھا تھا اس جگہ کو ان کی یاد کے طور پر مختص کر دیتی ہے اور ہر سال ان کی یاد میں وہاں پھول چڑھائے جانے لگتے ہیں۔ یہ افسانہ معاشرے کے تضاد کو اجاگر کرتا ہے۔ قانونی نظام کو مضبوط بنانے، انصاف تک رسائی کو بہتر بنانے، بد عنوانی سے نمٹنے اور قوانین سے آگاہی کو فروغ دینے کی کوششیں ان چیلنجوں کو کم کرنے اور ایک ایسے معاشرے کو فروغ دینے میں اہم کردار ادا کرتے ہیں جہاں افراد کو تنازعات کے حل کے لیے باقاعدہ قانونی طریقہ کار پر اعتماد ہو۔ معاشرے میں یہ سہولت نہ ہونے کے باعث اگر کوئی فرد کہیں کوئی خرابی یا کسی پولیس کیس کو دیکھ لے تو پولیس کو اطلاع کرنے اور مصیبت زدہ شخص کی مدد کرنے سے گھبراتے ہیں۔ ڈاکٹر شفیق انجم فرد کی اسی اخلاقی کش مکش کو افسانہ "ا=ی" میں بیان کرتے ہیں۔ ایک ایسے شخص کو واحد متکلم کردار بیان کر رہا ہے جس

کی ملاقات الف نامی شخص سے ہوتی ہے۔ علیک سلیک کے بعد چند ملاقاتیں ہوتی ہیں لیکن ایک دن اچانک اس تنہا شخص کی موت ہو جاتی ہے چوں کہ موت سے پہلے اس شخص نے راوی کو فون کر کے بلایا تھا اور اس کے پہنچنے تک وہ شخص اس دنیا سے رخصت ہو چکا تھا۔ اس اچانک موت سے جہاں راوی کو صدمہ پہنچتا ہے وہیں وہ اس کے کفن دفن کا انتظام کرنے اور کسی کو اس بارے میں آگاہ کرنے کے بجائے جو ردعمل اختیار کرتا ہے وہ فرد کی اخلاقی قدروں سے کہیں زیادہ اپنی جان کی فکر پر مبنی ہے۔ روای نے اپنے خیالات و جذبات کو ان الفاظ میں ڈھالا ہے:

> "۔۔۔کسی کو اطلاع کروں گا تو یہاں ٹھٹھ کے ٹھٹھ جمع ہو جائیں گے مگر اسے کوئی ہاتھ بھی نہیں لگائے گا۔ معاملہ پولیس تک پہنچا اور یقیناً پہنچے گا تو آخر تک رگڑا مجھی کو لگنا ہے۔ خواہ مخواہ کی مصیبت مول لینے والی بات ہے۔ میرا اس کے ساتھ کیا تعلق۔۔۔میں نے بجلی کی سی تیزی سے اس کا موبائل اٹھایا۔۔۔کہ یقیناً اسی سے اس نے مجھے کال کی تھی۔۔۔اور باہر کو بھاگ نکلا۔"(۶۳)

اقدار سے عاری معاشرہ اخلاق سے عاری سمجھا جاتا ہے کیونکہ اقدار اخلاقی طرز عمل کی بنیاد بنتی ہیں۔ افسانہ "بہارِ نو میں خزانِ رفتہ" میں مصنف نے شہر اور قصبے کا تقابل کیا ہے کہ قصبے کے لوگوں میں پھر بھی کسی حد تک ایمان باقی ہے جب کہ شہر میں ہر طرح سے ملاوٹ پائی جاتی ہے۔ کہانی کے پس منظر میں معاشرے کی بے حسی کو موضوع بنایا گیا ہے۔ بے حسی اتنی بڑھ گئی ہے کہ کوئی مر رہا ہے تو اس کو مرنے کے لیے چھوڑ دیا گیا ہے۔ اس افسانے کا کردار اچھا خاصہ سوٹ بوٹ پہنے ہوئے ہے پھر بھی کوئی اس کی مدد کو تیار نہیں ہے۔

> "اس کی فوٹو بناتے رہو گے یا کوئی اس کی مدد بھی کرے گا؟ کتنے بے حس ہو تم لوگ۔ کوئی تو اس کے منھ میں پانی کے دو قطرے ڈال دے۔" ایک لڑکا بولا: "خالہ! ون ون ٹو ٹو والوں کو بلایا تھا، وہ اسے دیکھ کر چلے گئے ہیں۔ جب انہوں نے نہیں اٹھایا تو کوئی اور خطرہ کیسے مول لے؟"(۶۴)

ایک ایسا معاشرہ جو مثبت اخلاقی اقدار کو اپناتا ہو، انصاف پسند ماحول کو فروغ دیتا ہو اور برقرار رکھتا ہو اس کی تخلیق کے لیے ایمانداری، ہمدردی، انصاف اور دوسروں کے لیے احترام جیسی اقدار کو فروغ دینا ہو گا جو افراد اور معاشرے کی مجموعی بہبود کے لیے معاون ہے۔ تنازعات اور سیاسی انتشار کے تناظر میں جڑی انسانی کہانیوں کے ذریعے عصری پاکستانی افسانے قارئین کو قوم کی بدلتی ہوئی اقدار کے بارے میں بصیرت انگیز

تناظر پیش کرتے ہیں۔ جیسے جیسے معاشرے نے جدیدیت کو اپنالیا ہے، اخلاقی قدروں میں واضح تنزلی آئی ہے۔ وہ بنیادی اصول جو کبھی اخلاقی رویوں کی نمائندگی کرتے تھے معدوم ہوتے ہوئے نظر آتے ہیں اور اخلاقی پستی کے احساس میں حصہ ڈالتے ہیں۔ اکیسویں صدی کے بدلتے ہوئے منظر نامے نے متعدد منفی نتائج کو جنم دیا ہے۔ خاندانی ڈھانچے کے عدم استحکام سے لے کر معاشرتی اور معاشی مسائل کے بڑھنے تک کے گہرے اور کثیر جہتی اثرات افسانوں میں نمایاں ہیں۔ ان مسائل کو حل کرنے کے لیے معاشرتی اقدار اور ترجیحات کا از سر نو جائزہ لینے کے لیے ایک اجتماعی کوشش کی ضرورت ہے تاکہ مربوط اور اخلاقی بنیادوں پر مبنی طرز زندگی کی طرف واپسی کو فروغ دیا جاسکے کیوں کہ معاشرتی اقدار ہی ایک تہذیب کو دوسری تہذیب سے ممتاز کرتی ہیں اور ان کی انفرادیت کو ظاہر کرتی ہیں۔ اعلیٰ اقدار جس سے معاشرے میں توازن قائم ہو سکے اور معاشرہ ترقی کی راہوں پر گامزن ہو سکے ان کو اپنانے سے ہی پاکستان اپنی الگ اور اسلامی شناخت کو دوسری تہذیبوں میں منواتے ہوئے امن کا گہوارہ بن سکتا ہے۔ اس ادبی منظر نامے میں سیاسی عدم استحکام، مذہبی کشیدگی اور عالمگیریت کے اثرات جیسے مسائل کو اجاگر کرتے ہوئے یہ افسانے پاکستان کے کثیر جہتی معاشرے کی گہری تفہیم کو فروغ دینے میں اہم کردار ادا کرتے ہیں اور یہ شعور بیدار کرتے ہیں کہ رویوں پر نظر ثانی معاشرے کا اہم تقاضہ ہے۔

حوالہ جات

۱۔ نیر عباس زیدی، (مترجم) مستقبل کا صدمہ، از اَیلون ٹوفلر، مقتدرہ قومی زبان، ۲۰۱۱ء، ص ix

۲۔ مبارک علی، ڈاکٹر، (پیش لفظ) پاکستانی معاشرہ، تاریخ پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۱۲ء، ص ۱۳

۳۔ گل زیب عباسی، فیس بک (افسانہ) مشمولہ: نوکیلے پھول، ص ۱۷۱

۴۔ منشایاد، نظر آلباسِ مجاز میں، (افسانہ) مشمولہ: خواب سرائے، ص ۳۰

۵۔ محمد حامد سراج، نصف مکمل (افسانہ) مشمولہ: بخیہ گری، ص ۸۲

۶۔ فرمان فتح پوری، ڈاکٹر، اردو فکشن کی مختصر تاریخ، الوقار پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۲۰ء، ص ۱۶۸

۷۔ زبیر شاہ، سید، مرگِ آرزو (افسانہ) مشمولہ:، یخ بستہ دہلیز، ص ۱۱۰

۸۔ محمد حامد سراج، سیاہ کار (افسانہ) مشمولہ: بخیہ گری، ص ۱۳۲

۹۔ رشید امجد، آخری چھلانگ (افسانہ) مشمولہ: دکھ ایک چڑیا ہے، ص ۱۷۴

۱۰۔ رشید امجد، دشت تمنا (افسانہ) مشمولہ: دکھ ایک چڑیا ہے، ص ۱۹۸۔۱۹۹

۱۱۔ منشایاد، معاف کرو بابا (افسانہ) مشمولہ: خواب سرائے، ص ۲۱۵

۱۲۔ حمیرا اشفاق، راؤنڈ اباؤٹ (افسانہ) مشمولہ: کتبوں کے درمیان، ص ۱۴۲

۱۳۔ طاہرہ اقبال، کارنامہ (افسانہ) مشمولہ: گنجی بار، دوست پبلی کیشنز، اسلام آباد، ۲۰۱۶ء، ص ۱۱

۱۴۔ شفیق انجم، ڈاکٹر، دنیا دکھ ہے (افسانہ) مشمولہ: لکھت لکھتی رہی، ص ۴۱

۱۵۔ طاہرہ اقبال، میں زندہ ہوں (افسانہ) مشمولہ: ریخت، ص ۱۷۰

۱۶۔ رشید امجد، حسرت چشیدہ (افسانہ) مشمولہ: دکھ ایک چڑیا ہے، ص ۱۰

۱۷۔ ایضاً، ص ۱۱

۱۸۔ رشید امجد، شام کہانی (افسانہ) مشمولہ: دکھ ایک چڑیا ہے، ص ۱۳۹

۱۹۔ رشید امجد، جاتی رت کے خواب (افسانہ) مشمولہ: دکھ ایک چڑیا ہے، ص ۱۰۴

۲۰۔ رشید امجد، دست گزیدہ (افسانہ) مشمولہ: دکھ ایک چڑیا ہے، ص ۱۷

۲۱۔ رشید امجد، معلوم کا دکھ (افسانہ) مشمولہ: دکھ ایک چڑیا ہے، ص ۱۳۳

۲۲۔ طاہرہ اقبال، اوکاں والا سکول (افسانہ) مشمولہ: زمیں رنگ، ص ۵۳

۲۳۔ علی اکبر ناطق، سویٹر (افسانہ) مشمولہ: شاہ محمد کا ٹانگہ، سانجھ پبلشرز، لاہور، ۲۰۱۷ء ص ۱۴۲

۲۴۔ سلیم آغا قزلباش، وار (افسانہ) مشمولہ: اعلانوں بھرا شہر، ص ۶۹

۲۵۔ منشایاد، پنجرے میں بسیرا (افسانہ) مشمولہ: ایک کنکر ٹھہرے پانی میں، ص ۱۷۰
۲۶۔ گل زیب عباسی، تازہ خبر (افسانہ) مشمولہ: نوکیلے پھول، ص ۱۲۱
۲۷۔ شفیق انجم، ڈاکٹر، دائرہ نہیں ٹوٹتا (افسانہ) مشمولہ: لکھت لکھتی رہی، ص ۶۴
۲۸۔ شفیق انجم، ڈاکٹر، مُندری، (افسانہ) مشمولہ: میں + میں، ص ۱۲۰
۲۹۔ طاہرہ اقبال، امیر زادی (افسانہ) مشمولہ: ریخت، ص ۱۳۸
۳۰۔ گل زیب عباسی، تیسری موت (افسانہ) مشمولہ، ہلکان، ص ۶۷
۳۱۔ گل زیب عباسی، حلالہ (افسانہ) مشمولہ: زہریلے پھول، ص ۱۵۷
۳۲۔ خاور چودھری، ادھوری تصویر، (افسانہ) مشمولہ: طلسم کہن، ص ۱۸
۳۳۔ محمد حامد سراج، اکتوبر کے آخری دن (افسانہ) مشمولہ: بخیہ گری، ص ۶۳
۳۴۔ طاہرہ اقبال، مس فٹ (افسانہ) مشمولہ: ریخت، ص ۵۵
۳۵۔ طاہرہ اقبال، ایک عجب چال چل گیا وہ شخص (افسانہ) مشمولہ: ریخت، ص ۱۸۶
۳۶۔ حمیرا اشفاق، ڈاکٹر، راؤنڈ اباؤٹ (افسانہ) مشمولہ: کتبوں کے درمیان، ص ۱۳۸
۳۷۔ حمیرا اشفاق، ڈاکٹر، گلاب (افسانہ) مشمولہ: کتبوں کے درمیان، ص ۳۱
۳۸۔ طاہرہ اقبال، لڑکیاں (افسانہ) مشمولہ: گنجی بار، ص ۳۰
۳۹۔ محمد حمید شاہد، ایک مسلسل زرگزشت، (افسانہ) مشمولہ: سانس لینے میں درد ہوتا ہے، ص ۱۰۳
۴۰۔ مبین مرزا، اجنبی موسم (افسانہ) مشمولہ: زمینیں اور زمانے، اکادمی بازیافت، کراچی، ۲۰۱۵ء، ص ۳۴
۴۱۔ زاہدہ حنا، پانیوں پر بہتی پناہ (افسانہ) مشمولہ: رقصِ بسمل ہے، ص ۳۲
۴۲۔ شاہدہ حسن، زاہدہ حنا۔۔ تنہائی کے مکان میں (مضمون) مشمولہ: زاہدہ حنا تحقیقی و تنقیدی مطالعہ، مرتب آسیہ نازلی، الحمد پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۱۷ء، ص ۱۸۲
۴۳۔ رشید امجد، ایک پرانی کہانی جسے دوبارہ لکھا گیا (افسانہ) مشمولہ: دکھ ایک چڑیا ہے، ص ۸۳
۴۴۔ فرمان فتح پوری، ڈاکٹر، اردو فکشن کی مختصر تاریخ، ص ۱۷۰
۴۵۔ گل زیب عباسی، شہر تمنا اور جال (افسانہ) مشمولہ، ہلکان، ص ۲۷
۴۶۔ وارث علوی، اے پیارے لوگو، تم دور کیوں ہو! (مضمون) مشمولہ: منتخب مضامین، فضلی سنز، کراچی، ۲۰۰۰ء، ص ۲۰۷
۴۷۔ گل زیب عباسی، امیر شہر کی قیمت (افسانہ) مشمولہ، ہلکان، ص ۶۵

۴۸۔ ایضاً، ص ۶۷۔۶۸

۴۹۔ آصف فرخی، آج کا مرنا، (افسانہ) مشمولہ: میرے دن گزر رہے ہیں، ص ۵۲

۵۰۔ ابنِ مسافر، مددگار، (افسانہ) مشمولہ: سفر ناتمام (فکشن)، پورب اکادمی، اسلام آباد، ۲۰۱۷ء ص ۴۴

۵۱۔ خالد فتح محمد، طارق میرک (افسانہ) مشمولہ: میں، ص ۱۶۰

۵۲۔ زاہدہ حنا، صرصرِ بے اماں کے ساتھ (افسانہ) مشمولہ: تتلیاں ڈھونڈنے والی، الحمد پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۰۸ء، ص ۵۵

۵۳۔ رشید امجد، ایک عام آدمی کا خواب، حرف اکادمی، راولپنڈی، ۲۰۰۶ء، ص ۴۲

۵۴۔ منشایاد، کہانی کی رات (افسانہ) مشمولہ: خواب سرائے، ص ۱۲

۵۵۔ طاہرہ اقبال، روزن (افسانہ) مشمولہ: گنجی بار، ص ۱۷۷

۵۶۔ آصف فرخی، نانوہاؤس، (افسانہ) مشمولہ: میرے دن گزر رہے ہیں، ص ۱۱۸

۵۷۔ خالد فتح محمد، ابا کا باغیچہ (افسانہ) مشمولہ: میں، ص ۱۳۷

۵۸۔ خالد فتح محمد، رہگزر (افسانہ) مشمولہ: میں، ص ۱۴۲

۵۹۔ فضیل جعفری، (ابتدائیہ) جانکی بائی کی عرضی، از مرزا حامد بیگ، دوست پبلی کیشنز، اسلام آباد، ۲۰۱۱ء ص ۲۱

۶۰۔ مسعود مفتی، ایک چھوٹا سا شعلہ، (افسانہ) مشمولہ: وقت کی قاش، ص ۵۸

۶۱۔ اسد محمد خان، مرد، عورت، بچہ اور سلوتری (افسانہ) مشمولہ: نربدا اور دوسری کہانیاں، سٹی پریس، کراچی، ۲۰۰۳ء ص ۲۲۷

۶۲۔ ناصر عباس نیر، تمہارا قانون..... (افسانہ) مشمولہ: ایک زمانہ ختم ہوا ہے، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۲۰ء، ص ۱۷

۶۳۔ شفیق انجم، ڈاکٹر، ا=ی (افسانہ) مشمولہ: لکھت لکھتی رہی، ص ۳۷

۶۴۔ خاور چودھری، بہارِ نو میں خزانِ رفتہ، (افسانہ) مشمولہ: طلسم کہن، ص ۲۱

ماحصل

پاکستان روایت اور جدیدیت کے سنگم پر چل رہا ہے۔ معاشرے کی تغیر پذیر صورت حال اور ابھرتی ہوئی معاشرتی اقدار کو اکیسویں صدی کے افسانے کے تناظر میں تحقیقی اور تنقیدی مطالعہ کرتے ہوئے اجاگر کیا گیا ہے۔ ادبی منظر نامے میں یہ تجزیہ پاکستانی معاشرے میں پائے جانے والے روایت اور جدیدیت کے گہرے تعامل کے بارے میں قابل قدر بصیرت پیش کرتا ہے۔ ادب کوئی کوزے میں بند شے نہیں ہے یہ کتابوں کے صفحات تک محدود ہونے یا کسی مخصوص نظم و ضبط کی حدود میں محدود ہونے سے کہیں زیادہ خود زندگی کا ایک وسیع اور متحرک عکاس ہے۔ یہ انسانی وجود کے تمام شعبوں کے ساتھ جڑا ہوا ہے۔ اگر زندگی کے کسی شعبے میں کوئی انقلاب یا تغیر آتا ہے تو ادب سماجی تبدیلیوں کے پیش خیمہ کے طور پر ایک آئینہ کا کام کرتا ہے۔ جب زندگی کے کسی بھی شعبے میں انقلابات یا تبدیلی کے واقعات سامنے آتے ہیں تو اس کا براہِ راست اثر فوراً یا تھوڑے عرصے بعد ادب میں ایک تاریخ کی طرح دیکھا جا سکتا ہے۔ ادب ثقافت، سیاست یا نظریے میں تبدیلیوں کو پیش کرنے میں سماجی تنقید کے ایک آلے کے طور پر بھی کام کرتا ہے۔ ثقافتی تحفظ کا ذریعہ ہو یا اختلاف رائے کی آواز ہو، ادب مستقبل کی نسلوں کو ماضی کے مروجہ اصولوں، خدشات اور خواہشات کے بارے میں بصیرت فراہم کرتا ہے۔ یوں یہ زمانے کی نبض کا زندہ ثبوت بن جاتا ہے۔ کسی خطے کی مستند تاریخ کو سمجھنے کے لیے اس کے ادب کا مطالعہ ناگزیر ثابت ہوتا ہے۔ ادب ایک کثیر جہتی حقیقت کی طرح انسانی تجربات کی باریکیوں اور پیچیدگیوں کو اپنی گرفت میں لے کر ثقافتی، سماجی اور سیاسی مناظر کی پیچیدگیوں پر روشنی ڈالتا ہے۔ سماجی نقطہ نظر کو تشکیل دینے اور متاثر کرنے میں معاون ہوتا ہے۔ ادب کی طاقت نہ صرف حقیقت کی عکاسی کرنے کی صلاحیت میں ہے بلکہ بہترین مستقبل کا تصور کرنے اور افراد کو تعمیری عمل کی طرف راغب کرنے کی صلاحیت میں بھی ہے۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ زندگی کی بنیادی حقیقتیں اور مسلّمہ تصورات ہر زمانے میں ایک سے رہے ہیں لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ ان ضرورتوں کو پورا کرنے اور زمانے کی ترقی اور دنیا میں منفرد پہچان بنانے اور ایک دوسرے سے آگے نکلنے کی دوڑ میں لوگوں کے طور طریقے بدلتے رہے ہیں۔ کسی بھی معاشرے میں فرد کے طور طریقے اور رویے اس معاشرے کی قدروں سے جڑے ہوتے ہیں۔ جس میں کچھ معاشرے کے اصول و قوانین، کچھ مذہبی حد بندیاں اور کچھ اخلاقی تقاضے فرد کو معاشرے میں سلیقے سے رہنے کا پابند کرتے ہیں۔ معاشرتی اقدار مجموعی طور پر کسی بھی معاشرے کی تشکیل میں اہم کردار ادا کرتی

ہیں اور یہی اس معاشرے کی پہچان ہوتی ہیں۔ کسی بھی عہد کے ادب کا مطالعہ اس عہد کے معاشرے اور اقدار و روایات کی واضح جھلک پیش کرتا ہے۔ پاکستانی اردو افسانے کا مطالعہ اور تجزیہ تغیر پذیر اقدار اور معاشرتی ڈھانچے کے بدلتے ہوئے تانے بانے کو اجاگر کرتا ہے۔ دنیا کا ہر معاشرہ وقت کے ساتھ تبدیل ہوتا رہتا ہے خواہ تبدیلی کی لہر تیز ہو یا آہستہ، معاشرے میں موجود ہر ادارے کو معاشرتی تبدیلی کے ساتھ اپنی ضروریات کے پیش نظر اپنے وظائف میں تبدیلیاں لانی پڑتی ہے تاکہ جدید ضروریات اور جدید تقاضوں کے مطابق زندگی کو ڈھالتے ہوئے ترقی کی منازل طے کی جاسکیں۔ معاشروں کے تصادم اور امتدادِ زمانہ کے ساتھ ساتھ معاشرے جہاں تبدیلی سے ہم کنار ہوتے ہیں وہیں یہ بھی مسلمہ حقیقت ہے کہ اس کے اقدار و روایات میں تبدیلی رونما ہوتی رہتی ہے۔ یہ تبدیلی معاشرے میں نظم وضبط قائم کرنے والے معاشرتی اداروں میں تغیر کے ذریعے رونما ہوتی ہے۔ اس تغیر کے پس پردہ محرکات میں معاشرتی تبدیلیاں جس کو بڑی سطح پر تعلیمی ترقی، صنعت وحرف میں خوش آئند ترقی، سائنس اور ٹیکنالوجی کی ترقی نے متاثر کیا ہے نیز پاکستان کے معاشی، سیاسی اور عالمی حالات و واقعات بھی اہم کردار ادا کرتے رہے ہیں۔ ان ہی کی بدولت پاکستان کا معاشرتی ڈھانچہ ۱۹۴۷ء اور موجودہ عہد کے اقدار و روایات سے خاصا مختلف ہے جب کہ کئی ایک مسائل جن سے پاکستانی معاشرہ ابتدا میں دوچار تھا آج بھی انہی مسائل سے دوچار ہے۔ کسی بھی قسم کی تبدیلیوں کے اثرات معاشرے پر اس وقت نمایاں ہوتے ہیں جب ایک بڑا طبقہ اس حوالے سے نمایاں کردار ادا کرتا ہے۔ اس کے برعکس معاشرے میں ایک ایسا طبقہ بھی موجود ہوتا ہے جو ان تبدیلیوں کی مخالفت کرتا ہے اور ان تبدیلیوں کی راہ میں رکاوٹیں حائل کرتا ہے اس طرح معاشرے میں جب دو متضاد طرزِ فکر رکھنے والے طبقے پیدا ہو جائیں تو معاشرہ کئی قسم کے مسائل سے دوچار ہو جاتا ہے۔ اس سب کے پس پردہ تبدیلی کے وہ اثرات جو ابتدا میں حقارت کی نظر سے دیکھے، سنے اور سمجھے جاتے ہیں وہ دیکھتے ہی دیکھتے معمولات زندگی کا حصہ بن جاتے ہیں۔ ادب اس بدیہی حقیقت کا عکاس ہے۔ ادیب کے احساسات و جذبات خارجی ماحول سے متاثر ہونا ناگزیر ہے۔ ادیب چوں کہ معاشرے کا عکاس اور نباض ہوتا ہے اس کی نگاہیں فلسفی کی طرح ماضی، حال اور مستقبل کے دبیز مشاہدات، امکانات و خدشات کا ادراک کرنے کی قوت رکھتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اس کے افکار و خیالات اپنے عہد کی ترجمانی کے ساتھ ساتھ عہد سازی کا فریضہ بھی انجام دیتی ہیں۔ اس کی تحریریں نہ صرف اس کے جذبات و محسوسات کی عکاس ہوتی ہیں بلکہ اس کے ماحول اور جغرافیائی وسعتوں سے بھی گہرا تعلق رکھتی ہیں۔ اکیسویں صدی کے افسانہ کا مطالعہ اس حقیقت کا غماز ہے۔ ادیبوں نے فکشن کے ذریعے اس عبوری دور میں

موجود چیلنجوں، افراد کی خواہشات اور معاشرے میں پائے جانے والے تنازعات کی عکاسی کرتے ہوئے معاشرتی و ثقافتی تانے بانے کو فکری وسعتوں کے ساتھ پیش کیا ہے۔ ادبی بیانیے میں معاشرتی تنوع، ہر سوچ اور خیال کو ایک لڑی میں پرونا انتہائی کھٹن اور مشکل کام ہوتا ہے لیکن اس مشکل کام کو ادیبوں نے بڑی مہارت سے اپنی تخلیقات میں جگہ دی ہے۔ افسانہ نگاروں نے افسانوں میں معنی کی تہوں اور مختلف ادبی تکنیکوں کا استعمال کرتے ہوئے مثلاً علامت، تمثیل اور استعارہ وغیرہ کے ذریعے بدلتی ہوئی معاشرتی اقدار اور معاشرتی صورت حال کو پیش کیا ہے۔

گزشتہ ابواب میں پیش کیا گیا مطالعہ ادیب کی ان فکری وسعتوں کو عیاں کرنے میں معاون و مددگار ہے۔ کسی بھی عہد کے ادب کا مطالعہ اس عہد کے معاشرے اور اقدار و روایات کی واضح جھلک پیش کرتا ہے۔ پاکستانی اردو افسانے کا مطالعہ اور تجزیہ تغیر پذیر اقدار اور معاشرتی ڈھانچے کے بدلتے ہوئے تانے بانے کو اجاگر کرتا ہے۔ یہ مطالعہ اکیسویں صدی میں پاکستان کے معاشرتی اور سیاسی منظر نامے کے بارے میں قابل قدر بصیرت فراہم کرتا ہے۔ معاشرتی تحقیق کے ضمن میں یہ تحقیق ادب کے مطالعے اور اس کے کردار کو اجاگر کرتی ہے جو موجودہ معاشرتی حالات کی عکاسی کے تنقیدی مطالعے کے ذریعے، معاشرتی تبدیلیوں کو سمجھنے اور اس پر عمل کرنے کا ایک اہم ذریعہ ہے۔ پاکستانی اردو افسانہ معاشرتی اداروں جن میں خاندان، مذہب، تعلیمی نظام اور ریاستی اداروں کا معاشرے میں کردار اور معاشرتی اقدار کی تشکیل میں ان اداروں کے اثرات کو اجاگر کرتا ہے نیز سیاسی بدعنوانیوں، ثقافتی شناخت، طبقاتی تقسیم خواتین کی بااختیار سازی وغیرہ کے سلسلے میں معاشرتی اداروں کے کردار کو اجاگر کرتا ہے۔ گزشتہ ابواب میں افسانوں کے تحقیقی و تنقیدی مطالعے سے معاشرتی اداروں میں تبدیلی کے ان عوامل پر روشنی ڈالی گئی ہے جو نہ صرف معاشرتی اقدار میں تغیر کا جائزہ لینے میں معاون ہیں بلکہ معاشرے کی غیر متوازن صورت حال اور لاقانونیت کے باعث پیدا ہونے والے معاشرتی مسائل کو بھی اجاگر کرتا ہے۔

دل و دماغ کسی قسم کی تبدیلی کو قبول کرنے کے لیے تیار ہوں یا نہ ہوں معاشرتی دباؤ فرد کو جدید حالات کے مطابق کاربند ہونے پر مجبور کر دیتے ہیں۔ اس تحقیق کے ذریعے پاکستانی اردو افسانوں میں بیان کردہ بدلتی ہوئی معاشرتی اقدار سے جڑے معاشرتی مسائل کو اس انداز میں اجاگر کیا ہے کہ ان مسائل کا حل تلاش کرتے ہوئے پاکستانی معاشرے میں مثبت تبدیلی کو فروغ دینے اور اس کے لیے اہم اقدامات کرنے کی

طرف زور دیا گیا ہے۔ پاکستانی اردو افسانہ عصر حاضر کے پاکستانی معاشرے اس کی پیچیدگیوں، اس کے عروج و زوال کو سمجھنے اور فرد کے مخصوص حالات میں رویوں اور افعال کو اجاگر کرتا ہے نیز فرد کو یہ سوچنے پر مجبور کرتا ہے کہ وہ کس طرف گامزن ہے۔ ان افسانوں میں اس بات کی واضح جھلک دیکھی جاسکتی ہے کہ معاشرتی ترقی اور اقدار و روایات کو درست سمت میں گامزن کرنے کے لیے مجموعی کوشش کرنا ہوگی اسی بات پر ڈرخائم کا بھی زور رہا ہے کہ فرد کی بجائے گروہ سماجی حقیقت ہے۔ یوں یہ مطالعہ معاشرتی تحقیق اور اس کی تفہیم کے لیے ناگزیر ہے۔ یہ تحقیقی کام معاشرتی تحقیق کے لیے ادب کی اہمیت کو اجاگر کرتا ہے کیوں کہ ادب معاشرتی تحقیق کو وہ بنیادی مواد فراہم کرتا ہے جو معاشرے کے رویوں اور افعال کو جانچنے اور پرکھنے کے لیے اہمیت کا حامل ہے۔ اس تحقیقی مطالعہ کے ذریعے پاکستانی معاشرے میں جاری تبدیلی کو سمجھا جاسکتا ہے۔ یہ قارئین اور اسکالرز کو روایت اور جدیدیت کے درمیان پائے جانے والے تفاوت کے حوالے سے غور کرنے پر آمادہ کرتا ہے اور ان پیچیدہ صورتوں پر روشنی ڈالتا ہے جو پاکستان کے سماجی تانے بانے کے متنوع مسائل سے آگاہی فراہم کرتے ہیں۔ جیسے جیسے قوم اپنا سفر جاری رکھے گی، اردو فکشن میں پائی جانے والی آوازیں بلاشبہ ایک رہنما کی طرح معاشرے کو سمجھنے اور نقائص سے آگاہ کرتے ہوئے ترقی کی راہیں سجھانے میں معاون رہیں گی۔ یوں یہ تحقیق فرد کو معاشرتی سطح پر باشعور بنانے اور معاشرے کی ترقی کو فروغ دینے اور معاشرتی مسائل سے نمٹنے کے لیے اہم بصیرت فراہم کرتی ہے۔

تحقیقی نتائج

۱۔ اکیسویں صدی کا پاکستانی اردو افسانہ بدلتی ہوئی معاشرتی اقدار، روایات اور معاشرتی اداروں میں ہونے والی تبدیلیوں کا عکاس ہے۔ مثلاً: خاندانی نظام، تعلیمی نظام، معاشی اور سیاسی نظام کے بدلتے ہوئے تقاضوں، فرد کے جدید رویوں اور نئے چیلنجز کو افسانہ نگاروں نے ہمہ جہتی انداز میں معاشرے کا مشترکہ بیانیہ پیش کرتے ہوئے فکر و نظر کی گہرائی سے اجاگر کیا ہے۔

۲۔ تحقیق کے لیے منتخب افسانوں کا مطالعہ ڈرخائم کے اس نظریے کی تائید کرتا ہے کہ فرد معاشرتی دباؤ قبول کرتا ہے۔ مثال کے طور پر افسانہ؛ حسرت چشیدہ، گماں کے رشتے، الہام، گھگو گھوڑے ایسے افسانے ہیں جن میں معاشرتی توقعات کرداروں کے انفرادی افعال پر اثر و رسوخ کی عکاسی کرتے ہوئے ڈرخائم کے نظریے کو تقویت دیتے ہیں۔

۳۔ اکیسویں صدی کا افسانہ تغیر پذیر اقدار کی نشاندہی کرتے ہوئے فرد کی مادیت کے طرف بڑھتے ہوئے رجحان کو ظاہر کرتا ہے۔ معاشرے میں نمود و نمائش میں اضافہ ہوا، نفسا نفسی کی کیفیت پیدا ہوئی اور طاقت کے حصول کے لیے ہر جائز اور ناجائز طریقہ کار اپنائے جانے لگے ہیں۔ مثلاً افسانہ؛ آخری چھلانگ، دشت تمنا، حسرت چشیدہ، خواب کے پیچھے پیچھے، شام کہانی اس حوالے سے فرد کے مخصوص رویوں، خواہشات اور جدوجہد کے بارے میں بصیرت فراہم کرتا ہے۔

۴۔ اکیسویں صدی کا پاکستانی اردو افسانہ بدلتی ہوئی نسائی اقدار کا ترجمان بھی ہے جہاں خواتین زیادہ باشعور اور بااختیار نظر آتی ہیں۔ افسانہ جیسے کو تیسا اور لڑکیاں اس کی عمدہ مثالیں ہیں۔ افسانوں کے زیادہ تر نسوانی کردار اپنے حقوق سے کافی حد تک آگاہ ہو چکے ہیں اور اپنے حقوق کے حصول کے لیے اپنی روایات سے باغی نظر آتے ہیں جیسے افسانہ "روشنی کا سفر" میں سمی کا کردار تعلیم کے حصول کے لیے اپنے خاندان اور معاشرے کی روایتی قدروں سے منحرف نظر آتی ہے۔ افسانہ نگاروں نے عہد حاضر کے نسائی چیلنجز کو بھی اپنے بیانیوں کے ذریعے اجاگر کیا ہے۔ مثلاً افسانہ "راؤنڈ اباؤٹ"، "راؤنڈ دی کلاک"

۵۔ اکیسویں صدی کے پاکستانی اردو افسانے میں مذہبی حوالے سے اقدار کے بدلنے کا رجحان بھی نمایاں دکھائی دیتا ہے۔ مثال کے طور پر معاشرے میں پردے کا تصور، داڑھی، تہوار، مدرسے کی تعلیم وغیرہ کے حوالے سے تصورات بدل گئے ہیں۔ جیسے منشایاد کے افسانے "سائیکلوسٹائل وصیت نامہ" میں مولوی صاحب اپنے بیٹے کو دینی تعلیم کے حصول کے لیے مدرسے بھیجنے پر خائف نظر آتے ہیں۔

۶۔ اکیسویں صدی کا پاکستانی اردو افسانہ بیرونی قوتوں سے متاثر معاشرے کا ترجمان بھی نظر آتا ہے۔ دنیا گلوبل ولیج کی جس نہج پر کھڑی ہے پاکستانی اردو افسانہ اس صورت حال کی ہر ممکن عکاسی کر رہا ہے مثال کے طور پر نائن الیون پر لکھے گئے افسانے جن میں پاکستانی نژاد لوگوں کو یورپی ممالک میں جس تضحیک کا نشانہ بنایا گیا اس المیے کو پاکستانی اردو افسانہ نگاروں نے قابل فکر انداز پیش کیا ہے۔

۷۔ تحقیق کے لیے منتخب افسانہ نگاروں کے افسانوں کا مطالعے ان عوامل سے بھی آگاہی فراہم کرتا ہے جنہوں نے معاشرتی قدروں میں تغیر برپا کرنے میں اہم کردار ادا کیا ہے۔ ان میں سب سے بااثر عالمگیر صورت حال، سائنس اور ٹیکنالوجی کی ترقی رہی۔ معاصر عہد میں سوشل میڈیا نے اقدار کی تغیر پذیری کو فروغ دینے میں اہم کردار ادا کیا ہے۔ اس کے ذریعے جدید نظریات کے پرچار میں اضافہ ہوا، مختلف تحریکیں جن میں حقوق نسواں اور دیگر نظریات اور ان کے مطابق مذہبی تشریحات اور معاشرے کی اقتصادی صورت حال وغیرہ

معاشرتی اصول و اقدار میں تغیر کا موجب بنے۔ افسانہ نگاروں نے کہانی کی بنت، افسانوں کی بیانیاتی جہات، کرداروں کے تجربات، ان پر طاری ہونے والی کیفیات، ان کے شعور، لاشعور اور کلامیہ کے ذریعے سماج، حقیقت اور کہانی کو ایک دوسرے میں ضم کر دیا۔

۸۔ اکیسویں صدی کا اردو افسانہ پاکستانی سماج کے عصری مسائل کی نشاندہی بھی کرتا ہے۔ عدم تحفظ اور روزگار کے مسائل کی وجہ سے نوجوانوں میں دیار غیر میں جا بسنے کی خواہش نمایاں ہے۔ (مبین مرزا کا افسانوی مجموعہ "زمینیں اور زمانے" اس صورت حال کا مکمل عکاس ہے۔) کرپشن، بے ایمانی، دھوکہ دہی، تشدد، جرم، ڈکیتی کی وارداتیں، دہشت گردی جیسے عوامل؛ لاقانونیت اور عدم تحفظ کے احساس کو اجاگر کرتے ہیں۔

۹۔ تغیر پذیر اقدار کے ضمن میں افسانوں پر تحقیق سے عیاں ہوتا ہے کہ پاکستان کے شہر جس تغیر و تبدل کی لہر سے گزر رہے ہیں انہوں نے دیہی سماج کو بھی اپنی لپیٹ میں لیتے ہوئے روایات کے برعکس جدید اقدار کو اپنانے کے لیے متاثر کیا ہے۔ پس ماندہ علاقوں میں اس تبدیلی کا رجحان سست روی کا شکار ہے۔ ناصر عباس نیر کا افسانوی مجموعہ "خاک کی مہک" سلیم آغا قزلباش کا "اعلانوں بھرا شہر" علی اکبر ناطق کا "قائم دین" اور "شاہ محمد کا ٹانگہ"، رشید امجد کا "دکھ ایک چڑیا ہے" نقل مکانی کے پس منظر میں ترتیب دی گئی کہانیاں ہیں۔ ثقافتی انضمام، بیگانگی، روایت اور جدیدیت کے درمیان تصادم جیسے موضوعات ان بیانیوں میں مرکزی محرکات کے طور پر ابھرتے ہیں۔

۱۰۔ افسانہ نگاروں نے بدلتی ہوئی اقدار کو ہی صرف موضوع نہیں بنایا بلکہ ناقدانہ انداز میں زندگی کی حقیقتوں کو تجربے کی کسوٹی پر پرکھتے ہوئے بصیرت افروز مفکر کا فریضہ انجام دیا ہے۔ ان کی فکر معاشرے کی اقدار و روایات میں متوازن تغیر کو معاشرے کی خوشحالی کے لیے ضروری خیال کرتی ہے تاکہ معاشرے کو جدید تقاضوں کے مطابق ڈھالتے ہوئے ترقی کی منازل طے کی جاسکیں۔ ان افسانوں کے مطالعے سے عیاں ہوتا ہے کہ یہ روایت اور جدیدیت کے سنگم کا مہابیانیہ تشکیل دیتے ہیں۔

سفارشات

۱۔ معاشرتی تحقیق اور ادب کا مطالعہ بین العلومی تحقیق کے ضمن میں شمار ہوتا ہے اس حوالے سے تحقیق معاشرے کی ترقی اور فروغ میں اہم کردار ادا کر سکتی ہے۔ اس قسم کی تحقیق کی طرف سکالرز کا رجحان پیدا کیا جائے۔ کیوں کہ ادب معاشرے کے سیاق و سباق کے حوالے سے بصیرت فراہم کرتا ہے۔

۲۔ عوام کو درپیش مسائل کا سروے اور فکشن میں بیان کیے جانے والے معاشرتی مسائل کا تقابل کرتے ہوئے اس موضوع پر مزید تحقیق کی جاسکتی ہے اور ان کے پس پردہ وجوہات کو اجاگر کرتے ہوئے تجاویز دی جاسکتی ہیں جو روشن مستقبل کی ضمانت ہوں۔

۳۔ اردو افسانے میں خودکشی کے محرکات پر نظریۂ خودکشی (Theory of Suicide) کے تحت تحقیق کی جا سکتی ہے۔

۴۔ اکیسویں صدی کے افسانوں میں جرمیات کا تحقیقی و تنقیدی مطالعہ اینومیا تھیوری (Anomie) کے تناظر میں کیا جاسکتا ہے۔

۵۔ معاصر افسانے میں کرداروں کی نفسیات پر عالمگریت کے اثرات کا مطالعہ کیا جاسکتا ہے۔

۶۔ پیش کردہ تحقیقی موضوع پر اردو ادب کی دیگر اصناف ناول، شاعری وغیرہ پر تحقیق کسی دوسرے نظریے کے تحت کی جاسکتی ہے۔

۷۔ ایسی ورک شاپس کا انعقاد ہونا چاہیے جو سکالرز کو معاشرتی تحقیق اور ادب کے مطالعے سے نتائج اخذ کرنے کے طریقوں سے متعارف کروائیں۔ یہ ملک کے پائیدار ترقی کے اہداف کو پانے میں معاون ثابت ہو گا۔

۸۔ نمل میں شعبہ عمرانیات موجود نہیں ہے اس حوالے سے بھی انتظامیہ سے اس شعبے کے قیام کی طرف توجہ کی سفارش کی جاتی ہے۔

کتابیات

بنیادی مآخذ(WORKING BIBLIOGRAPHY)

ابنِ مسافر، سفر ناتمام (فکشن)، پورب اکادمی، اسلام آباد، ۲۰۱۷ء

انوار احمد، ڈاکٹر، پہلے سے سنی ہوئی کہانی، اردو بازار لاہور، ۲۰۰۳ء

انوار احمد، ڈاکٹر، آخری خط، مثال پبلشرز، فیصل آباد، ۲۰۱۰ء

اسد محمد خان، نربدا اور دوسری کہانیاں، سٹی پریس، کراچی، ۲۰۰۳ء

اسد محمد خان، تیسرے پہر کی کہانیاں، اکادمی بازیافت، کراچی، ۲۰۰۶ء

اسد محمد خان، اک ٹکڑا دھوپ کا اور دوسری کہانیاں، القاء پبلشرز، لاہور، ۲۰۱۰ء

اسد محمد خان، ٹکڑوں میں کہی گئی کہانی، القا پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۱۵ء

اطہر بیگ، مرزا، بے افسانہ، سانجھ پبلشرز، لاہور، ۲۰۰۸ء

آصف فرخی، میرے دن گزر رہے ہیں، شہزاد پبلشرز، کراچی، ۲۰۰۹ء

حامد بیگ، مرزا، جانکی بائی کی عرضی، دوست پبلی کیشنز، اسلام آباد، ۲۰۱۱ء

حسن منظر، خاک کا رتبہ، شہر زاد، کراچی، ۲۰۰۷ء

حسن منظر، جھجک، شہر زاد، کراچی، ۲۰۱۸ء

حمید شاہد، مرگ زار، اکادمی بازیافت، کراچی، ۲۰۰۴ء

حمید شاہد، آدمی، مثال پبلشرز، فیصل آباد، ۲۰۱۳ء

حمید شاہد، سانس لینے میں درد ہوتا ہے، بک کارنر، جہلم، ۲۰۱۹ء

حمیرا اشفاق، ڈاکٹر، کتبوں کے درمیان، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۱۹ء

خالد فتح محمد، آئینے سے باہر چہرہ، جمہوری پبلیکیشنز، ۲۰۰۹ء

خالد فتح محمد، تانبے کے برتن، سانجھ پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۱۲ء

خالد فتح محمد، میں، عکس پبلشرز، لاہور، ۲۰۱۹ء

خاور چودھری، طلسمِ کُہن، مثال پبلشرز، فیصل آباد، ۲۰۲۰ء

رشید امجد، ست رنگے پرندے کے تعاقب میں، حرف اکادمی، راولپنڈی، ۲۰۰۲ء

رشید امجد، ایک عام آدمی کا خواب، حرف اکادمی، راولپنڈی، ۲۰۰۶ء

رشید امجد، دکھ ایک چڑیا ہے، نیشنل بک فاؤنڈیشن، اسلام آباد، ۲۰۱۶ء

زبیر شاہ، سید، خوف کے کتبے، مثال پبلشرز، فیصل آباد، ۲۰۱۱ء

زبیر شاہ، سید، یخ بستہ دہلیز، اعراف پرنٹرز محلہ جنگی، پشاور، ۲۰۱۷ء

زاہدہ حنا، تتلیاں ڈھونڈنے والی، الحمد پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۰۸ء

زاہدہ حنا، رقص بسمل ہے، الحمد پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۱۱ء

سلمٰی اعوان، خوابوں کے رنگ، دوست پبلی کیشنز، اسلام آباد، ۲۰۱۳ء

سلمٰی اعوان، برف میں دھنسی عورت کچھ کہتی ہے، دوست پبلی کیشنز، اسلام آباد، ۲۰۱۶ء

سلیم آغا قزلباش، اعلانوں بھرا شہر، الحمد پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۱۹ء

شفیق انجم، ڈاکٹر، میں + میں، اسلوب، اسلام آباد، ۲۰۰۸ء

شفیق انجم، ڈاکٹر، لکھت لکھتی رہی، الفتح پبلی کیشنز، راولپنڈی، ۲۰۱۱ء

شفیق انجم، ڈاکٹر، روشنی آواز دیتی ہے، الفتح پبلی کیشنز، راولپنڈی، ۲۰۱۹ء

طاہرہ اقبال، ریخت، دوست پبلی کیشنز، اسلام آباد، ۲۰۱۰ء

طاہرہ اقبال، زمیں رنگ، دوست پبلی کیشنز، اسلام آباد، ۲۰۱۴ء

طاہرہ اقبال، گنجی بار، دوست پبلی کیشنز، اسلام آباد، ۲۰۱۶ء

عرفان احمد عرفی، پاؤں، دستاویز۔ مطبوعات، لاہور، ۲۰۱۸ء (اشاعت اول ۲۰۱۵ء)

عرفان احمد عرفی، کنٹرول روم، سانجھ پبلیکیشنز، لاہور، ۲۰۱۷ء

علی اکبر ناطق، قائم دین، سانجھ پبلشرز، لاہور، ۲۰۱۸ء

علی اکبر ناطق، شاہ محمد کا ٹانگہ، سانجھ پبلشرز، لاہور، ۲۰۱۷ء

گل زیب عباسی، زہریلے پھول، رنگ ادب، کراچی، ۲۰۱۳ء

گل زیب عباسی، پھول چہرے، ظفر اکیڈمی، کراچی، ۲۰۱۴ء

گل زیب عباسی، آخری پھول، مکتبہ فجر، لاہور، ۲۰۱۶ء

گل زیب عباسی، رسیلے پھول، مکتبہ فجر، لاہور، ۲۰۱۸ء

گل زیب عباسی، نوکیلے پھول، مکتبہ فجر، لاہور، ۲۰۱۹ء

گل زیب عباسی، ہلکان، مکتبہ فجر، لاہور، ۲۰۲۰ء

مبین مرزا، خوف کے آسمان تلے، اکادمی بازیافت، کراچی، ۲۰۰۴ء

مبین مرزا، زمینیں اور زمانے، اکادمی بازیافت، کراچی، ۲۰۱۵ء
محمد حامد سراج، وقت کی فصیل، پورب اکادمی، اسلام آباد، ۲۰۰۹ء
محمد حامد سراج، چوب دار، پورب اکادمی، اسلام آباد، ۲۰۰۹ء
محمد حامد سراج، برائے فروخت، پورب اکادمی، اسلام آباد، ۲۰۰۹ء
محمد حامد سراج، بخیہ گری، الفتح پبلی کیشنز، راولپنڈی، ۲۰۱۳ء
محمد حامد سراج، برادہ، پبلشنگ ہاؤس یونیورسٹی آف مینجمنٹ اینڈ ٹیکنالوجی، لاہور، ۲۰۱۸ء
منشایاد، خواب سرائے، دوست پبلی کیشنز، اسلام آباد، ۲۰۰۵ء
منشایاد، اک کنکر ٹھہرے پانی میں، دوست پبلی کیشنز، اسلام آباد، ۲۰۱۰ء
مسعود مفتی، وقت کی قاش، دوست پبلی کیشنز، اسلام آباد، ۲۰۱۵ء
نیلوفر اقبال، سرخ دھبّے، دوست پبلی کیشنز، اسلام آباد، ۲۰۱۲ء
ناصر عباس نیر، ڈاکٹر، خاک کی مہک، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۱۶ء
ناصر عباس نیر، ڈاکٹر، فرشتہ نہیں آیا، سنگ میل پبلشرز، لاہور، ۲۰۱۷ء
ناصر عباس نیر، راکھ سے لکھی گئی کتاب، سنگ میل پبلشرز، لاہور، ۲۰۱۹ء
ناصر عباس نیر، ایک زمانہ ختم ہوا ہے، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۲۰ء

ثانوی مآخذ (SECONDARY SOURCES)

ابوالاعجاز حفیظ صدیقی (مرتب)، کشاف تنقیدی اصطلاحات، ادارہ فروغ قومی زبان، اسلام آباد، ۲۰۱۸ء
انوار احمد، ڈاکٹر، اردو افسانہ ایک صدی کا قصہ، مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد، ۲۰۱۰ء
انور جمال، پروفیسر، ادبی اصطلاحات، نیشنل بک فاؤنڈیشن، اسلام آباد، ۲۰۱۲ء
ایلون ٹوفلر، مستقبل کا صدمہ، (مترجم) نیر عباس زیدی، مقتدرہ قومی زبان پاکستان، ۲۰۱۱ء
آسیہ نازلی، زاہدہ حنا تحقیقی و تنقیدی مطالعہ، الحمد پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۱۷ء
رشید امجد، ڈاکٹر، مزاحمتی ادب، (مرتب)، اکادمی ادبیات، اسلام آباد، ۲۰۰۹ء
جمیل جالبی، ڈاکٹر، پاکستانی کلچر، مشتاق بک ڈپو، کراچی، ۱۹۶۴ء
حسن منظر، رھاہی، آگہی پبلیکشنز، حیدرآباد، ۱۹۸۱ء
شاہد صدیقی، پاکستان، تعلیم اور اکیسویں صدی: جدید تعلیمی رجحانات اور امکانات، بک کارنر، جہلم، ۲۰۲۲ء
طاہرہ اقبال، پاکستانی اردو افسانہ سیاسی و تاریخی تناظر میں، فکشن ہاؤس، لاہور، ۲۰۱۵ء

عارف ثاقب، ڈاکٹر، بیسویں صدی کا ادبی طرز احساس، اظہار سنز پرنٹرز، لاہور، ۱۹۹۹ء
عمرانہ خاتون، اردو ادب اور انسانی اقدار کی بازیافت (مضامین)، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی، ۲۰۱۶ء
عذرا عابدی، سماجی تحقیق، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی، ۲۰۱۸ء
عبدالرحمن بن خلدون، رئیس المورخین، علامہ، مقدمہ ابن خلدون، مترجم، علامہ راغب رحمانی دہلوی، نفیس اکیڈمی، کراچی، ۲۰۰۱ء
فرمان فتح پوری، ڈاکٹر، اردو فکشن کی مختصر تاریخ، الوقار پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۲۰ء
فیض احمد فیض، میزان، اردو اکیڈمی سندھ، کراچی، ۱۹۸۷ء
قاسم یعقوب، زبان اور سماج، کتابی دنیا، لاہور، ۲۰۲۴ء
قمر رئیس، پروفیسر، (مرتب) نیا افسانہ مسائل اور میلانات، اردو اکادمی، دہلی، ۱۹۹۲ء
کلیم الدین احمد، پروفیسر، فرہنگ ادبی اصطلاحات، ترقی اردو بیورو، نئی دہلی، ۱۹۸۶ء
مرزا حامد بیگ، اردو افسانے کی روایت ۱۹۰۳-۲۰۰۹، دوست پبلی کیشنز، اسلام آباد، ۲۰۱۰ء
محمد فاروق، ڈاکٹر، پاکستانی سوسائٹی، وقاص پرنٹنگ پریس، فیصل آباد
محمد ناظم ندوی، مولانا، کورونا وائرس-عالمی وبا اور مسلمان، صفہ اکیڈمی، مانک مقسہار نپور، ۲۰۲۰ء
مہناز انور، ڈاکٹر، اردو افسانے کا تنقیدی مطالعہ، نصرت پبلشرز حیدری مارکیٹ امین آباد، لکھنؤ، ۱۹۸۵ء
مبارک علی، ڈاکٹر، تاریخ اور معاشرہ، فکشن ہاؤس، لاہور، ۱۹۹۹ء
مبارک علی، ڈاکٹر، پاکستانی معاشرہ، تاریخ پبلی کشنز، لاہور، ۲۰۱۲ء
ناصر عباس نیر، ڈاکٹر، عالمگیریت اور اردو اور دیگر مضامین، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۱۵ء
وقار عظیم، سید، افسانہ نگاری، سرسوتی پبلشنگ ہاؤس، الٰہ آباد، ن
وارث علوی، جدید افسانہ اور اس کے مسائل، نئی آواز جامعہ نگر، نئی دلی، ۱۹۹۰ء
وارث علوی، منتخب مضامین، فضلی سنز، کراچی، ۲۰۰۰ء
نجیبہ عارف، ۹/۱۱ اور پاکستانی اردو افسانہ، منتخب افسانے، انتخاب اور تجزیہ، پورپ اکادمی، اسلام آباد، ۲۰۱۱ء

غیر مطبوعہ تحقیقی مقالے

منظور احمد، محمد حمید شاہد کی ادبی خدمات، مقالہ برائے ایم۔فل، علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی، اسلام آباد، ۲۰۱۵ء

لغات

اردو لغت (تاریخی اصول پر) جلد اول، ترقی اردو بورڈ، کراچی، ۱۹۷۷ء
جمیل جالبی، قومی انگریزی اردو لغت، مقتدرہ قومی زبان، پاکستان
فیروزالدین، مولوی، فیروز اُللُغات اردو جامع، فیروز سنز پرائیویٹ لمیٹڈ، راولپنڈی، ۲۰۱۰ء
محمد عبداللہ خان خویشگی، فرہنگِ عامرہ، مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد، ۱۹۸۹ء
نورالحسن نیر، مولوی، نور الغات، نیشنل بک فاؤنڈیشن، اسلام آباد، ۲۰۰۶ء
وارث سرہندی، علمی اردو لغت، علمی کتاب خانہ، لاہور، ۱۹۷۹ء

English Books

Archana Singh, The Process of Social Value Creation, Springer prt.ltd, India,2016

Bryan S. Turner, The Cambridge Dictionary of Sociology, Cambridge University Press, 2006

Craig Calhoun, Light, Keller, Understanding Sociology, Glencoe McGraw-Hill, New York

Diana Kendall, Sociology In Our Times, eighth edition, Wadsworth Cengage Learning, Canada,2011

Emile durkheim, The Rules of Sociological Methods, translated by W.D.Halls, The free press, New York, 1982

Emile durkheim, The Elementary forms of religious life, translated by Karen E. Fields, The free press, New York,1995

George Ritzer, Sociological theory, Eighth Edition, The McGraw Hill Companies

Gordon Marshall, A Dictionary of Sociology, Oxford University Press, 1998

John J. Macionis, Sociology, 14th Ed., Pearson, New York

Kingsley Davis, Human Society, Surjeet Publications, India, 2007

Margaret L. Anderson, Howard F. Taylor, Kim A. Logi, Sociology the essentials, Cengage Learning ,America,2015

M.Iqbal Chaudhry, Social Theory Research & Problems, Aziz book depot, Lahore, 1984

Nicholas Abercrombie, Stephen Hill, Bryan S Turner, The Penguin Dictionary of Sociology (Fifth edition), Penguin Books Ltd, England

Richard T. Schaefer, Sociology (9th edition) The Mc Graw. Hill companies, New York,1983

Seven Lukes, Emile Durkheim His life and work, A Historical and Critical Study, Herper & Row, Publishers, London, 1972

Shankar Rao, C.N, Sociology Principles of sociology with an introduction to social thought (seventh edition)
Samita Manna, Professor, Suparna Chakarborti, Values and ethics in business and profession, PHI Learning Private limited, New Delhi, 2010
Nicholas Abercrombie, Stephen Hill, Bryan S. Turner, The Penguin Dictionary of Sociology (Fifth edition), Penguin Books Ltd, England
Theodore Caplow, Elementary sociology, university of Virginia
Vincent N. Parrillo, Encyclopedia of Social Problems, Sage publication, London

Web Site

https://www.researchgate.net/publication/273851080_Social_Values_and_Value_Education